فِیْہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یک نیستان نالہ، یک خمخانہ مے

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

زندگی کے اُن مسائل کے متعلق جن کی تفصیل فہرست میں درج ہے

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

قیمت مجلد، بارہ روپے

DATA ENTERED

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

قرآنی فیصلے

عنوان	صفحہ
نماز	۹
نمازوں کی تعداد	۱۵
نظام صلوٰۃ اور نماز	۱۸
زکوٰۃ	۳۴
صدقہ وخیرات	۴۷
صدقۃ الفطر	۴۹
قربانی	۵۳
"	۵۷
"	۶۱
غلام اور لونڈیاں	۷۷

Marfat.com

عنوان	صفحہ
ایصال ثواب	۹۲
تلاوت قرآن پاک	۱۰۱
ترکہ اور وصیت	۱۰۶
یتیم پوتے کا حصہ	۱۱۲
اوقاف	۱۲۲
ماں باپ کی اطاعت	۱۲۶
نکاح نابالغان	۱۳۱
تعدد ازواج	۱۳۷
"	۱۴۴
زمانۂ عدت	۱۶۱
شرعی سزائیں	۱۶۵
حرمت شراب	۱۶۹
شراب کا استعمال بطور دوائی	۱۷۵
رجم	۱۷۷
آیۂ رجم	۱۷۸

Marfat.com

عنوان	صفحہ
میسرہ	۱۸۳
شب بارات	۱۸۶
〃	۱۸۸
عید میلاد کی محفلیں	۱۹۳
رحمۃ للعلمین	۲۰۲
کیا حضور کا سایہ نہ تھا؟	۲۰۳
رسول کریم صلعم کی شان اطہر من سوء ادبی	۲۰۴
رسول اللہ صلعم اور غیب کا علم	۲۰۷
حفاظت قرآن	۲۱۱
قرآن کریم کی حفاظت	۲۲۱
اسلامی تاریخ	۲۲۷
ناسخ و منسوخ	۲۳۴
ایک ہندو کا خط بہ صندوق کتب	۲۴۱

Marfat.com

عنوان	صفحہ
قرآن فہمی کا طریق	۲۵۷
کراچی ریڈیو اور درس قرآن	۲۷۱
عجمی اسلام	۲۷۸
اسلاف اور اقبال	۲۷۹
تصویر	۲۸۱
ملی تقاریب	۲۹۲
مشاعرے	۳۰۴
حیات بعد الممات	۳۰۹
عذاب قبر	۳۱۰
انسانی ارتقار	۳۳۵
آدم	۳۴۸
قومی ملکیت	۳۵۰
انتظام یوسفی	۳۵۹
انفرادی مفاد پرستی	۳۶۳
مہاجرین کا مسئلہ	۳۶۵
نوع انسان کی عالمگیر برادری	۳۷۰
نیابت الہی	۳۸۳
نوجوانوں کے دل کی دھڑکن	[illegible]

پیش لفظ

آپ اپنی زندگی پر غور کیجئے اور سوچئے کہ صبح سے شام تک کتنے معاملات ایسے آتے ہیں جن کے متعلق آپ خود سوچ کر کسی فیصلے پر پہنچتے ہیں اور کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق آپ، بلا سوچے سمجھے، وہ کچھ کہہ دیتے ہیں یا کرتے ہیں جو کچھ آپ بچپن سے سنتے یا دیکھتے چلے آئے ہیں۔ مثلاً شب برات کا تہوار آتا ہے اور آپ اسے بڑی دھوم سے مناتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی اتنا سوچنے کی بھی زحمت گوارا کی ہے کہ یہ تہوار کس تقریب کی یاد میں ہے؟ ہم اسے کیوں مناتے ہیں؟ اس کے منانے میں جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ کیوں کیا جاتا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ آپ نے کبھی یہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ آپ بچپن سے دیکھ رہے ہیں کہ ایسا کچھ ہوتا چلا آرہا ہے؛ وہی کچھ آپ کر دیتے ہیں۔ لیکن زندگی میں کوئی وقت تو ایسا آنا چاہیئے کہ جب آپ ذرا تھم کر سوچیں کہ ہم جو کچھ کہتے یا کرتے چلے آرہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوع اسلام کے اجرائے کراچی (۱۹۴۸ء) سے ہم نے قارئین سے کہا کہ زندگی کے روزمرہ کے مسائل پر غور کریں اور جن کی بابت انہیں الجھن پیش آئے، وہ ہم سے پوچھ لیں

Marfat.com

چنانچہ قارئین کی طرف سے مختلف مسائل کے متعلق استفسارات آنے شروع ہوئے اور ہم نے ان کے جوابات لکھے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہمارا مسلک یہ ہے کہ زندگی کے مسائل کا حل قرآن کریم سے دریافت کیا جائے اس لئے ہم نے ان استفسارات کے متعلق بھی جو کچھ لکھا وہ اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم ہی کی روشنی میں لکھا۔ اس پانچ۔ چھ سال کے عرصے میں ان استفسارات اور ان کے جوابات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ جو استفسارات نئے آرہے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہیں جن کے جوابات پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ مستفسرین کی اس دقت اور قارئین کے تقاضے کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان استفسارات اور ان کے جوابات کا مجموعہ شائع کر دیا جائے ـــــ ان جوابات پر نظر ثانی کی گئی۔ اور انہیں ایک جدید ترتیب کے مطابق یکجا کیا گیا۔ یہ مجموعہ پیش خدمت ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس مجموعہ میں زندگی کے روزمرہ کے مسائل کے متعلق اتنا کچھ آگیا ہے جس سے آپ کی بہت سی الجھنیں خود بخود حل ہو جائیں گی۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی سوال ایسا ہو جس کا جواب آپ کو اس مجموعہ میں نہ ملے یا آپ اس کے جواب سے پورے طور پر مطمئن نہ ہوں، تو آپ ہم سے دریافت کر لیجئے۔ اس طرح ان استفسارات کا سلسلہ اور آگے بڑھتا جائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ کتاب ہمارے معاشرے کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری کر دے گی۔ اگر آپ اسے اپنے بچوں کو بھی

Marfat.com

پڑھا دیں۔ یا انہیں اس کا مفہوم آسان زبان میں سمجھا دیں، تو ان کا ذہن اُن الجھنوں سے خود بخود صاف ہو جائے گا جو ہمارے لئے اس درجہ وجہ پریشانی بن رہے ہیں۔ اگر آپ اس کتاب کو واقعی مفید پائیں تو کوشش کریں کہ آپ کے جاننے والے دیگر احباب کے گھروں میں بھی اس کے نسخے پہنچ جائیں۔ واللہ المستعان۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام، کراچی
جولائی ۱۹۵۳ء

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی فیصلے

(س) نماز پچھلے کسی پرچہ میں زکوٰۃ کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ قرآن نے چونکہ اس کے نصاب کی مقدار متعین نہیں کی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں وہ حکومت جو قرآنی اصولوں کے مطابق اور اسلامی سیرت کے حامل حکمرانوں سے بنے گی۔ وہ اپنا نصاب مقرر کرنے میں آزاد ہو گی۔ جس چیز کی حد قرآن مجید نے مقرر نہیں کی۔ اس پر صرف اس لئے مصر ہونا کہ آں حضرت (صلعم) کے زمانے سے لیکر آج تک تمام مسلمانوں کی حکومتوں میں ایسا ہی دستور رہا ہے۔ یا فقیہوں نے ایسا ہی فیصلہ صادر کیا ہے — آپ کے نزدیک غلط ہے۔

Marfat.com

لیکن اس کے ساتھ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(ا) قرآن مجید میں نماز کی تاکید موجود ہے۔ لیکن اس کے اوقات، تعداد، ارکان اور ادائیگی کی تفصیل موجود نہیں۔ جماعت اہل قرآن نے اسی بنا پر کوشش کی کہ نماز پنجگانہ کا جواز قرآن سے نکالا جائے۔ ان کے دلائل کی کمزوری کی ایک صریح علامت یہ ہے کہ ان میں ہی کا ایک گروہ صرف تین نمازوں کا قائل ہو سکا۔

(ب) اوقات نماز کا بھی یہی معاملہ ہے۔

(ج) نماز کے ارکان اور اس کی ادائیگی کی تفصیل بھی بڑا دقت طلب معاملہ ہے اگر حدیث صرف تاریخ دین ہے۔ اور دین نہیں جو قابل پیروی یا اطاعت ہو۔ تو رکوع و سجود کی ترتیب بدلی جا سکتی ہے۔ سجدہ ایک بھی کافی ہو سکتا ہے، رکعتوں کا تعین بھی انفرادی یا مجموعی فیصلے پر ہر زمانے میں بدلا جا سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ جو کچھ بھی نماز میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کی جگہ جو چیز قرآن سے مناسب سمجھی جائے۔ تلاوت کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ اہل قرآن کے ایک گروہ نے موجودہ طریقۂ تلاوت نماز کو بدل کر مولوی عبداللہ مرحوم کے قائم کردہ طریقۂ تلاوت کو ترجیح دی ہے۔

[اہل قرآن کا ذکر بار بار کرنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کا مسلک ان کا سا ہے۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ آپ نے اپنی کتابوں میں اس مسلک سے علیحدگی کا اظہار کیا ہے۔ مفہوم صرف یہ ہے کہ صرف قرآن مجید تک محدود رہنے سے یہ حالت

پیدا ہو سکتی ہے]

کافی عرصہ ہوا کہ میں نے آپ کا پمفلٹ شخصیت پرستی پڑھا تھا۔ اب ان شکوک کو لکھتے ہوئے میں نے وہ رسالہ تلاش کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ اس لئے میں حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔

اس رسالہ میں آپ نے کہا تھا کہ نماز کا معاملہ تواتر سے حل ہو سکتا ہے۔ چونکہ ساڑھے تیرہ سو سال سے نماز اسی نہج پر پڑھی جاتی رہی ہے۔ اس لئے آج بھی ہمیں اسی طرح پڑھنی چاہیئے۔

اگر نماز کے معاملہ میں تواتر کی دلیل صحیح ہے۔ تو زکوٰۃ میں کیوں نہ ہو؟ براہ مہربانی اس تضاد کو رفع کرنے میں مدد دیجئے۔

جواب۔

میں نے اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا تھا۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن قوانین کا صرف اصولی ذکر فرمایا ہے۔ اور ان کی جزئیات کو متعین نہیں کیا۔ ان جزئیات میں زمانہ کے بدلنے والے تقاضوں کے ماتحت ردوبدل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس تغیر و تبدل کا مجاز کوئی فرد یا افراد کی جماعت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ حق صرف جانشینان رسول اللہ کو حاصل ہے، اور جانشین رسول اللہ سے مراد ہے۔ وہ حکومت جو قرآن کا حکم چلانے کے لئے قرآنی اصولوں کے مطابق عمل میں آئی ہو، سب سے اول تو یہ دیکھئے کہ اس میں بحث قوانین سے ہے۔ عبادات سے

Marfat.com

نہیں۔ کسی قانون کی جزئیات میں زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ماتحت ردوبدل کی ضرورت بالکل واضح ہے۔ لیکن عبادات میں یہ ضرورت بالکل شاذ ہے۔ مثلاً نماز اور زکوٰۃ کو لیجئے۔ زکوٰۃ (یعنی حکومت کے ٹیکس) کی شرح میں تغیر و تبدل کی ضرورت ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نظر نہیں آتی اس کے برعکس نماز کو لیجئے۔ تو زمانے کے تقاضے (ذاتی رجحانات نہیں بلکہ زمانے کے تقاضے) اس کی جزئیات پر کہاں اثر انداز ہوں گے۔ وہ کون سی ضرورت ہو گی جو اس امر کی مقتضی ہو کہ رکوع میں سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون کہا جائے۔ یا سجدہ دو کی بجائے ایک ہی ہو۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ ارکان صلوٰۃ، قیام، رکوع، سجود، اوقات رکعات وغیرہ کے متعلق خود قرآن میں ایسی تصریحات موجود ہیں کہ ان کے پیش نظر نماز کی ترتیب میں ردوبدل کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ نماز کی موجودہ جزئیات میں بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں اختلافات موجود ہیں۔ ہر چند یہ اختلافات بہت جزئی سے ہیں۔ لیکن جب ہم جزئیات سے بحث کر رہے ہیں تو ان اختلافات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے مطابق اسلامی حکومت کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان اختلافات کو بتدریج مٹاتی چلی جائے۔ جو مسلمانوں میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کی دیواریں بن کر کھڑے ہیں ...... اگر رسول اللہ

Marfat.com

کے بعد آپ کی جانشینی کا سلسلہ قائم رہتا تو یہ فرقے وجود ہی میں نہ آتے۔ کیونکہ رسول اللہ نے ملت واحدہ کو چھوڑا تھا۔ فرقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی قوم نہیں چھوڑی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر اگر وہ حکومت نماز کی ایک متفقہ علیہ شکل متعین کرے گی تو اس میں موجودہ اختلافی جزئیات میں ردوبدل ناگزیر ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ جو شکل اس حکومتِ قرآنی کی طرف سے متعین ہوگی۔ وہ شرعی نماز ہوگی۔

لیکن جس حالت میں ہمارے ہاں قرآنی حکومت نہ ہو (اور آج سے سال بھر پہلے تو ہمارے ہاں کسی قسم کی بھی اپنی حکومت نہ تھی) تو اس میں تشتت وانتشار کو روکنے یا کم کرنے کے لئے یہی صورت ہو سکتی ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر فرد اور ہر جماعت اپنی اپنی مرضی کے مطابق طریقے وضع کرتی جائے جس حد تک ہم مطمئن ہو سکیں کہ فلاں عمل عہد رسول اللہ والذین معہٗ سے ہم تک علی التواتر چلا آرہا ہے، اسے علی حالہٖ قائم رکھا جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے ماتحت میں ہندوستان میں (اور آج بھی جب تک قرآنی حکومت کا قیام نہ ہو) مسلمانوں کے لئے یہی راہ سلامتی کی سمجھتا تھا (اور سمجھتا ہوں) کہ جو اعمال تاحال تواتر سے چلے آرہے ہیں انہیں علی حالہٖ رہنے دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ قرآن کے کسی واضح حکم سے ٹکرا نہ رہے ہوں۔ اس سے قوم مزید انتشار و خلفشار سے بچ سکتی ہے۔

اہل قرآن کی بنیادی غلطی میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ ان احکام کی

Marfat.com

جزئیات بھی قرآن سے متعین کرنے لگ گئے جن کا صرف اصولی حکم قرآن نے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے قیاس آرائیوں کے اور کیا ہو سکتا تھا پھر جن قیاسات پر یہ لوگ اس طرح سے پہونچے وہ قوم کے لئے فیصلہ کی حیثیت تو نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہ حق جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے۔ صرف حکومت قرآنی کو حاصل ہے۔ میں دینی لامرکزیت کے دور میں اعمال متواترہ کو ایسے انفرادی قیاسات سے انسب سمجھتا ہوں۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے قوانین اور عبادات میں جو اوپر فرق کیا ہے۔ تو وہ محض اس بات کو سمجھانے کے لئے کیا ہے کہ مؤخرالذکر میں زمانہ کے تغیرات سے رد و بدل کی ضرورت شاذ ہی ہوتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قوانین کا تعلق ہماری دنیاوی زندگی سے ہے اور عبادات کا تعلق آخرت سے یا قوانین مادی دنیا سے متعلق ہیں اور عبادات روحانی دنیا سے۔ اسلام میں دنیا اور آخرت اور مادہ اور روح میں کوئی امتیازی خطوط نہیں۔ اس کی عبادات اس کے قوانین اور اسکے تمام اعمال اس کی عبادات ہیں۔ ہر قرآنی قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت زندگی کے لئے خود ایک قانون کا درجہ لئے ہوئے ہے۔ اس نہج سے آپ سمجھنا چاہیں تو جس اصول کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ قانون اور عبادات دونوں پر منطبق ہو گا۔ یعنی اگر جانشین رسول اللہ (یعنی قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزئی شکل میں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا۔ اپنے زمانے کے کسی

Marfat.com

تقاضے کے ماتحت کچھ ردوبدل ناگزیر سمجھے۔ تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہو گی۔ ہماری دشواری یہ ہے کہ جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ردوبدل کا تصور کرتے وقت ہماری موجودہ حکومتوں کے ارباب حل وعقد ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور اس تصور سے ہماری روح کانپ اٹھتی ہے کہ ان لوگوں کو یہ حق کیسے دیدیا جائے کہ یہ ان احکام میں تغیر وتبدل کر دیں جو رسول اللہ نے متعین فرمائے تھے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حق صرف رسول اللہ کے جانشینوں کو پہنچتا ہے۔ اور کسی کو نہیں اور جانشین رسول اللہ جب رسول اللہ کے کسی حکم میں تبدیلی کا خیال کریں گے، تو ظاہر ہے کہ وہ اسی وقت ایسا کریں گے جب وہ دل کے پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اگر اس وقت رسول اللہ موجود ہوتے تو وہ خود اپنے اس حکم میں ایسی تبدیلی فرمادیتے۔ یہ تمام الجھاؤ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

پرویز

(س) نمازوں کی تعداد

یہاں ایک مولوی صاحب ہیں۔ ان سے ذکر آیا کہ وحی صرف قرآن شریف ہے۔ اور کوئی وحی نہیں۔ تو انھوں نے فرمایا کہ اگر تم وحی خفی (یعنی وحی غیر متلو) کے منکر ہو تو بتاؤ کہ پانچ وقت کی نمازوں کا ذکر قرآن کریم میں کہاں ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ یہ وقت رسول اللہ نے وحی خفی کی بنا پر مقرر فرمائے تھے۔

جواب ۔ یہ تو ہم بھی پھر عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق قرآن کریم میں کیا

کچھ ہے۔ سردست آپ اسناد دیکھئے کہ اس وحی غیر متلو کی حقیقت کیا ہے۔ جس کی رو سے پانچ وقتوں کی نماز فرض ہوئی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ نمازیں شب معراج میں فرض ہوئی تھیں۔ اس کی تفصیل خود بخاری کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

انس بن مالک کا قول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس وقت کی نمازیں فرض کی تھیں۔ لیکن جب میں (واپس ہوکر) موسیٰ کی طرف سے گزرا۔ تو انھوں نے دریافت کیا کہ خدائے تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا کہ پچاس وقت کی نمازیں۔ وہ کہنے لگے، اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ۔ کیونکہ تمہاری امت میں اس کی طاقت نہ ہوگی۔ میں نے جاکر اپنے رب سے کمی کرائی۔ تو خدائے تعالےٰ نے آدھی ساقط کردیں۔ جب میں موسیٰ کے پاس آیا۔ تو ان سے کہا کہ آدھی ساقط کردی گئیں۔ تو انھوں نے کہا کہ دوبارہ اپنے رب کے پاس جاؤ تمہاری امت میں اس کی بھی طاقت نہ ہوگی۔ میں نے خدا سے اور کمی کرائی۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض رہیں۔ اور وہ ثواب میں پچاس کے برابر ہیں۔ میرے ہاں حکم میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب میں موسیٰ کی طرف لوٹا تو انھوں نے کہا کہ اب کے پھر اپنے رب کے پاس جاؤ۔ میں نے کہا اب مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔ (بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ)

غور فرمایا آپ نے کہ پانچ نمازیں کس طرح فرض ہوئیں۔ اللہ میاں حکم دیتے

والے اور حضور نبی کریمؐ اس حکم کو امت کی طرف لانے والے۔ خدا نے پچاس نمازوں کا حکم دیدیا اور رسول اللہ اس حکم کو لے کر چلے آئے۔ نہ خدا کو (معاذ اللہ) اس کا احساس ہوا کہ میں کیسا ناممکن العمل حکم دے رہا ہوں نہ رسول اکرمؐ کو اس کا خیال گذرا کہ میری امت اس بوجھ کو کیسے اٹھائے گی۔ اگر اس کا احساس ہوا تو حضرت موسیٰ کو ہوا ان کے کہنے پر رسول اللہؐ کو بھی خیال ہوا کہ بات واقعی ٹھیک ہے۔ چنانچہ آپ واپس تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس کا احساس ہوا کہ حکم میں واقعی زیادتی تھی چنانچہ ایک دو بھی نہیں اکٹھی آدھی نمازیں ساقط ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے سمجھ لیا کہ اب حکم مناسب ہے۔ اور رسول اللہ بھی مطمئن ہو گئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ یہ سنکر رسول اللہ پھر اللہ میاں کے پاس تشریف لے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو پھر اپنے حکم کی زیادتی کا احساس ہوا تو پچیس سے پانچ رہ گئیں۔ چنانچہ حضورؐ پھر مطمئن ہو کر واپس تشریف لے آئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر فرمایا کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ اس پر رسول اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ نہیں! میں سمجھتا ہوں اب حکم ٹھیک ہے۔ بلکہ فرمایا یہ کہ (آپ کہتے تو ٹھیک ہیں لیکن میں کیا کروں) مجھے بار بار جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس لئے اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔

غور فرمایا آپ نے کہ دین کے محکم احکام کس طرح متعین ہوتے تھے؟ ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ آپ کسی وقت ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اس قسم کی باتیں جب غیر مسلموں کے سامنے آتی ہوں گی تو ہمارے خدا اور خدا کے رسول (علیہ التحیۃ والسلام)

کے متعلق کیا کچھ نہ کہتے ہوں گے۔ اس روایت سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی یہودی نے گھڑی ہے۔ تاکہ اس سے حضرت موسیٰؑ کی افضلیت ثابت ہو جائے۔ اور مسلمانوں کو یہ بتا دیا جائے کہ (معاذاللہ) یہ ہے ہمارے پیغمبر کے سامنے تمہارے رسول کی حیثیت، لیکن اس یہودی کا کیا گلہ! اس کا تو یہ کام ہی تھا۔ مسلمانوں سے پوچھئے جو ان چیزوں کو ہزار برس سے اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں۔ اور جب کوئی ان کی طرف اس طرح توجہ دلاتا ہے۔ تو اس پر بری طرح برس پڑتے ہیں۔

لیکن اب یہ چیزیں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتیں۔ اگر مسلمانوں نے انھیں اسی طرح اپنے ساتھ چمٹائے رکھا تو یہ چکی کے پاٹ کی طرح انھیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گی۔ اور اس کے بعد وہ قوم آئے گی جو قرآن کی مشعل ہدایت کی روشنی میں تمام انسانیت کو صراط مستقیم پر لے جائے گی۔

بہرحال یہ ہے نمونہ اس "وحی خفی" کا جس کی رو سے ہمارے مولوی صاحبان کے مذہب کے مطابق وہ احکام متعین ہوا کرتے تھے جن کا ذکر انھیں "وحی جلی" (قرآن کریم) میں نہیں ملتا۔

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ!

(س) نظام صلوٰۃ اور نماز

پرویز صاحب کے نام ایک خط!

آپ نے نظام صلوٰۃ کے متعلق جستہ جستہ کچھ آج تک لکھا ہے۔ اس کا بغائر مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ نے دین کے ایک اہم رکن

بنیادی گوشے پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ایک بات ہنوز وضاحت طلب ہے اور وہ یہ کہ اس نظام صلوٰۃ میں اس صلوٰۃ کا کیا مقام ہوگا جسے مُوقت فریضہ کہا گیا ہے

اگر جرأت عرض معاف ہو تو کیا میں یہ بھی دریافت کرسکتا ہوں کہ آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں؟

جواب۔

اگر آپ میری تحریروں کا مسلسل اور بالاستیعاب مطالعہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ جہاں تک میں قرآن کو سمجھ سکا ہوں قیام الصلوٰۃ قرآن کی ایک نہایت جامع اور بلیغ اصطلاح ہے۔ جس سے در حقیقت مقصود اس معاشرے کا قیام ہے۔ جس میں قانون خداوندی عملاً نافذ ہو، اور اس طرح ہر فرد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی چلے تاکہ وہ اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی کی سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوتا ہوا اپنے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جائے۔ لہٰذا نظام الصلوٰۃ ایک مردمومن (یا جماعت مومنین) کی پوری کی پوری زندگی کو محیط ہوگا۔ ان کا ایک ایک سانس اس حقیقت کبریٰ کا شاہد ہوگا کہ وہ مصلّیٰ (یعنی خدا کے پیچھے پیچھے جانے والے کارواں کے افراد) ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک شعبۂ عبادت (یعنی قانون خداوندی کی محکومیت) کا مظہر ہوگا۔ ان کے کاروبار حیات کا فلم سامنے آجائے۔ تو

وہ منشائے خداوندی کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دے گا۔ اس اجتماعی نظام سے وابستگی (بلکہ یوں کہیئے کہ خود اس کے لاینفک اجزاء اور کارفرما ہونے کی بنا پر ان کی حیات ارضی۔ از ابتداتا انتہا۔ الاسلام کی جامع تفسیر ہوگی (ولا تموتن الا وانتم مسلمون) اس نظام کے اجزاء ہیں۔

(۱) قرآن۔ یعنی ضابطۂ آئین اسلام

(۲) مرکز۔ یعنی ضابطۂ خداوندی کی قوت نافذہ اور۔

(۳) جماعت۔ افراد معاشرہ جن سے یہ نظام متشکل ہوگا۔

اور اس کی عملی تشکیل کے اصول و مبانی ہیں

(ل) افراد معاشرہ میں کامل ائتلاف۔ یعنی یک دلی و یک جہتی و یک قدمی اور

(ب) مرکز کی اطاعت

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہ نظام جماعت مومنین کی پوری کی پوری زندگی پر چھایا ہوتا ہے اور دن اور رات میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اس کے احاطے سے باہر ہوں۔ یہ ان کی "حیات انسانی" کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ان کی "حیات طبعی" کے لئے ہوا کی حیثیت ہے۔ ہوا پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں جو اس کی ضرورت اور اہمیت کا معترف نہ ہو۔ لیکن بایں ہمہ ڈاکٹروں کو اکثر و بیشتر یہ فقرہ دہرانا پڑتا ہے کہ صحت اور زندگی کے لئے کھلی اور تازہ ہوا کی اشد ضرورت ہے۔ دہرانا اس لئے

Marfat.com

پڑتا ہے کہ کسی شے کی یاد دہانی (ذکر) سے اس کی اہمیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے آئین خداوندی نے بھی اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ اس نظام کی بار بار یاد دہانی کرائی جائے۔ تاکہ اس کے اصول و مبانی اجاگر ہوتے رہیں۔ اور اس کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، اسی یاد دہانی کا نام صلوٰۃ کا وظیفہ موقت ہے۔ یعنی خاص اوقات کا اجتماع صلوٰۃ۔

صلوٰۃ

دین کے نظام (اسلامی معاشرہ) کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فوز و فلاح کی زندگی انفرادی نہیں۔ اجتماعی ہے۔ اجتماع صلوٰۃ کی ابتدا اسی اصول سے ہوتی ہے ایک دعوت پر بکھرے ہوئے افراد کا ایک مقام پر جمع ہو جانا۔

دین کے نظام میں اگلا قدم اطاعت مرکز ہے۔ اجتماع صلاۃ میں اس کا مظاہر عملی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ جب یہ اجتماع اپنے میں سے سب سے بہتر فرد کو بہ حیثیت امام چن لیتا ہے (اور بہتر ہونے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ کس کی زندگی سب سے زیادہ قانون خداوندی سے ہم آہنگ ہے) یہی امام اس اجتماع کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس ایک کی آواز پر سب کو اٹھنا ہوتا ہے۔ اور اسی کی آواز پر جھکنا۔ اور یہ جھکنا اور اٹھنا ایک ساتھ ہوتا ہے۔ جو شہادت دیتا ہے۔ اس حقیقت کبریٰ کی کہ اس جماعت کے افراد میں کامل ہم آہنگی فکر و عمل ہے اس سے معاشرے کی ناہمواریاں مٹتی ہیں۔ (امام۔ اس تاگے کو کہتے ہیں جس سے معمار یہ دیکھا کرتا ہے کہ دیوار بالکل سیدھی اٹھ رہی ہے۔ اس کی اینٹیں آگے پیچھے تو نہیں ہیں)

امام

Marfat.com

دین کے نظام کا اگلا اصول یہ ہے کہ یہ نظام عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور اس کا مرکز محسوس بیت اللہ ہے۔ لہٰذا اجتماع صلوٰۃ میں اس حقیقت کی یاد دہانی کے لئے جماعت کا رخ قبلے کی طرف رکھا جاتا ہے۔ یعنی ساری دنیا کے مسلمانوں کا سطح نگاہ اور نصب العین ایک ہوگا۔

اسلامی معاشرے کا قیام قانون خداوندی کی رو سے ہوتا ہے۔ اور اجتماع صلوٰۃ سے مقصود اسی اصل الاصول کی یاد دہانی ہے۔ اس لئے قرآن کے بغیر صلوٰۃ کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کی غائت ہی افراد معاشرہ کی توجہات کو قرآن پر مرکوز کرنا ہے۔ اسی مقصد کی یاد دہانی کے لئے یہ اجتماعات رکھے گئے ہیں۔ اسی لئے ان میں قرآن دہرایا جاتا ہے۔ تاکہ اس ایمان (نصب العین حیات) کی تجدید ہوتی رہے کہ ہمیں ہر غیر قرآنی نظام کی مخالفت میں سینہ سپر ہو کر قائم رہنا ہے۔ اور جھکنا ہے تو صرف اسی کے فیصلوں کے سامنے جھکنا ہے۔

قرآن کا یہ مقام اس لئے ہے کہ یہ کسی انسانی ذہن کا وضع کردہ قانون نہیں بلکہ اس خدا کا متعین فرمودہ ضابطہ حیات ہے۔ جو زندگی کا سرچشمہ اور ربوبیت کا کفیل ہے۔ جس کی ذات زندگی کے تمام متنوع (اور بظاہر متضاد) گوشوں میں کامل توازن (حسن) کی مظہر اتم ہے (انہی گوشوں کو صفات خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے) لہٰذا وہی معاشرہ بہترین توازن (حسن کامل) کا آئینہ دار ہو سکتا ہے جس میں اس کی صفات منعکس ہوں۔ اجتماع صلوٰۃ میں قرآن کو سامنے لانے سے

۸۷۵۲

یہ تمام تصورات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ایک ایک کرکے ان کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

اظہار جذبات

انسان کی ساخت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے جسم کی حرکات اس کے جذبات کا ساتھ دیتی ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کے جذبات کا اظہار زبان سے زیادہ اس کی حرکات سے ہوتا ہے۔ کسی مقرر کو دیکھیے۔ اس کی زبان تقریر کے الفاظ ادا کرتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ شدید انداز میں اس کے اعضاء حرکت کرتے ہیں۔ اگر اس پر یہ پابندی لگادی جائے کہ دوران تقریر میں اسے بالکل غیر متحرک رہنا ہوگا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے لیے تقریر ناممکن ہوجائے گی۔ اور اگر اسے تقریر پر مجبور کردیا جائے تو وہ جذبات سے بالکل خالی ہوگی۔ تقریر تو ایک طرف۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک شخص تنہا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ لیکن .... اس کے ہاتھ پاؤں۔ سر مختلف قسم کی حرکات میں مصروف ہیں۔ انہی حرکات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ وہ کس قسم کے خیالات میں مستغرق ہے۔

اجتماع صلوٰۃ میں جن تصورات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے ابھر کر سامنے آنے سے۔ افراد جماعت کے سینوں میں جذبات کا تلاطم ناگزیر ہے۔ قیام رکوع سجود انہی جذبات کے متحرک کیے ہیں۔ لیکن اس میں اظہار جذبات بھی اسی نظم و ضبط کے ساتھ ہے۔ جو اس معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہے۔

بیقراری ہے کس قرار کے ساتھ　　جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

قیام و سجود کا امتزاج۔ اسی جبر و اختیار کے امتزاج کا حسین مرقع ہے۔ اور یہی ایک عبد مومن کی زندگی کی صحیح تصویر ہے۔ لیکن یہ جبر وہ ہے کہ جس سے اختیارات کی وسعتیں اور بھی حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔ یہ سجدہ وہ ہے جس سے قیام کی قوتیں اور بھی جلال انگیز ہو جاتی ہیں۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

سمٹی ہوئی شکل

آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ اجتماع صلوٰۃ درحقیقت پورے کے پورے نظام دین کی سمٹی ہوئی شکل (Miniature form) ہے۔ اس ذرا سے نگینے میں پورا "تاج محل" جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سپاہی کی ساری زندگی (شب و روز کی ہر آن) سپاہیانہ نظام کے مطابق گزرتی ہے۔ لیکن شب و روز میں کچھ اوقات (پریڈ وغیرہ کے) ایسے بھی رکھے جاتے ہیں۔ جن میں پورے فوجی نظام کی مشق (یا یاد دہانی) تھوڑے سے وقت میں اس کی سمٹی ہوئی شکل میں کرا دی جاتی ہے تاکہ اس سے اس کے نظام کے پورے خط و خال اس کے ذہن میں مستحضر رہیں۔ اور یہ حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے کہ اس کی زندگی کا مقصود اور اس کی تگ و تاز کا نصب العین کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پریڈ یا تجدیدی مشق Refresher course کی تمام جزئیات اپنی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اور ان کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں ہوتیں۔ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ

Marfat.com

ہوتی ہیں۔

اب فرض کیجئے، کہ کسی مقام پر نہ تو اپنی مملکت رہے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی فوجی نظام۔ لیکن کچھ لوگ گذشتہ دور کی یادیں پریڈ کے وقت کسی جگہ اکٹھے ہو کر یا اپنے اپنے ہاں الگ الگ بندوق کی جگہ لکڑی ہاتھ میں لے کر پریڈ کی نقل کرتے رہیں۔ تو اس سے جو کچھ حاصل ہوگا وہ ظاہر ہے (یاد رکھئے، کہ میں نے یہ چیز محض سمجھانے کے لئے بطور مثال لکھی ہے۔ یہ نہ سمجھ بیٹھئے، کہ میں نے صلوٰۃ کو پریڈ قرار دیدیا ہے)[1]

ہمارے ساتھ یہی ہوا۔ عہد محمد رسول اللہ۔ والذین معہٗ میں دین کا مل نظام اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ قائم تھا۔ اس نظام کے اندر صلوٰۃ کا اجتماع مؤقت اپنی پوری اہمیت رکھتا تھا۔ یہ اجتماع اس نظام کی سمٹی ہوئی شکل اور اس کے عناصر، عوامل اور اغراض و مقاصد کی یاددہانی کراتا اور سینوں میں عزائم کو بیدار اور دلوں میں ولولے پیدا کرنے کا موجب بنتا۔ جب کچھ عرصے کے بعد یہ نظام درہم برہم ہو گیا تو صلوٰۃ ایک

صلوٰۃ ضائع ہو گئی

رسم بن کر رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ اس صلوٰۃ کی رسم کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا تھا (نہ ہی آسکتا تھا۔ اس لئے کہ جس نظام کی یاددہانی کے لئے یہ اجتماع ہوتا تھا۔ وہ نظام ہی گم ہو چکا تھا) اب اگر ملت کا مقدر۔ یاوری کرتا تو نگاہ کا رخ اس طرف پلٹتا کہ اس نظام کو دوبارہ قائم کرنا چاہیئے جس کی یاددہانی کے لئے یہ اجتماع مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن ہمارے جرائم کی سزا

---

[1] ان امور کی مزید تفصیل "سلیم کے نام خطوط" میں ملے گی

کی مدت چونکہ ختم نہیں ہوئی تھی اس لئے توجہ اس طرف نہ گئی۔ بلکہ یہ سمجھ لیا گیا کہ یہی رسم مقصود بالذات ہے۔ اگر ...... اس کا کوئی نتیجہ اس وقت سامنے نہیں آتا تو نہ سہی۔ اس کا ثواب ضرور ہوتا ہے۔ جو قیامت میں ہمارے سامنے آجائے گا۔

مذہب (دین نہیں بلکہ مذہب) کی بنیاد پوجا پاٹ کے تصور پر ہے، اس میں سمجھا یہ جاتا ہے کہ ایشور (خدا) ہماری بھگتی (پرستش) سے خوش ہوتا ہے (جس طرح بادشاہ کورنش بجالانے سے خوش ہو جاتا تھا) اور اگر اس کی پرستش نہ کی جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ ادھر مسلمانوں سے دین کا نظام رخصت ہوا ادھر ان کے ذہنوں پر عجمی تصورات نے اثر اندازی کی۔ نتیجہ یہ کہ انہوں نے بھی اپنے دین کو مذہب سمجھ لیا۔ اور اس لئے صلوٰۃ کے عظیم القدر نظام کو پرستش فرض کر لیا گیا۔ نظام کے گم ہو جانے سے صلوٰۃ کا اصلی مقصود نگاہوں سے پہلے ہی اوجھل ہو چکا تھا، اسے پرستش قرار دے لینے سے یہ ذہنی الجھن بھی رفع ہو گئی کہ اس رسم سے مقصود کیا تھا۔

مجوسیوں کی نماز عجم میں مجوسیوں (پارسیوں) کے ہاں پرستش کی رسم کو نماز کہا جاتا تھا (یہ لفظ ہی انہی کے ہاں کا ہے۔ اور ان کی کتابوں میں موجود ہے) لہٰذا صلوٰۃ کی جگہ نماز نے لے لی۔ اور قرآن کی اصطلاح "اقیموا الصلوٰۃ" کا ترجمہ ہو گیا۔ نماز پڑھو۔ جب گاڑی نے اس طرح پٹڑی بدل لی تو اس کے پہیئے کا ہر چکر اسے منزل سے دور لے جاتا گیا۔ چنانچہ اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ سے ذہن نماز پڑھنے کے علاوہ کسی اور طرف منتقل ہی نہیں ہوتا

Marfat.com

اور نماز پڑھنے سے مراد ہے۔ خدا کی پرستش کرنا[1] ــــــ یہ ہے فرق صلوٰۃ اور نماز میں
صلوٰۃ ــــــ نظامِ دین کی سمٹی ہوئی شکل جس سے مقصود اس نظامِ خداوندی
کے خط و خال اور اغراض و غایات کو بار بار ذہن میں نمایاں اور دل میں منقوش
کرنا تھا: تاکہ جماعت مومنین اپنی زندگی کے مقصود و مطلوب کو ہر وقت سامنے رکھے
اور اس کے حصول و قیام میں ہر ممکن کوشش کرے۔

اس کے برعکس نماز ــــــ خدا کی پرستش کی رسم جو ہر مذہب میں کسی نہ کسی
شکل میں موجود ہے۔ اور پارسیوں کے ہاں اس کا نام تک بھی یہی ہے۔

نبی اکرمؐ نے قرآن کے ارشاد کے مطابق نظامِ صلوٰۃ کو قائم فرمایا تھا جس
میں موقت اجتماعات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ہم اس رسمِ پرستش کو پورا کرتے
ہیں جس کا تصور عجمی اثرات کے ماتحت وجود میں آیا تھا

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

میں نے یہاں پرستش کے متعلق زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا۔ اس لئے کہ اس موضوع
پر اس سے پہلے عبادت کے عنوان سے میرا ایک مبسوط مقالہ (طلوعِ اسلام بابت
دسمبر ۱۹۴۹ء میں) شائع ہو چکا ہے۔ میں اس مقالہ میں بتا چکا ہوں کہ قرآن
کی رو سے عبادات سے مفہوم قوانینِ خداوندی کی اتباع ہے نہ کہ پرستش۔ اصل
سوال جس کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے، یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "اسبابِ زوالِ امت"

خدا اور بندے کا تعلق

کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ہم خدا کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ ہمارا ذہن زمان و مکان Time and Space) کی حدود میں گھرا ہوا ہے۔ اس لئے ہم ان حدود سے ماوراء کسی شے کا علم نہیں رکھ سکتے۔ یہ چیز ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا مطالبہ خدا کی معرفت کا نہیں۔ ہمارے لئے اس کا عرفان ناممکنات سے ہے۔ خدا نے اپنے متعلق انسانوں کو جو کچھ بتانا تھا۔ وہ وحی کے ذریعہ بتا دیا ہے۔ اب ہمارا اور خدا کا تعلق صرف قرآن کے ذریعے ہے۔ قرآن کو درمیان سے ہٹا دیجئے خدا کے متعلق اپنے اپنے ذہنی تصور سے زیادہ کوئی علم ہمارے پاس باقی نہیں رہے گا اور جہاں تک ذہنی تصور کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ یہ نہ علم ہے۔ نہ معرفت۔ یہ یکسر انفرادی شے ہے۔ یعنی ہر ذہن میں خدا کا تصور الگ الگ ہوگا۔[۱] لہٰذا اس قسم کا خدا ذہن انسانی کا تراشیدہ خدا ہی ہوگا۔ یہ مذہب کی سطح اور اس کا پیدا کردہ خدا ہے۔ مذہب نے ان انفرادی تصورات کی جگہ ایک قسم کا تصور پیدا کرنے کے لئے بت تراش دیئے۔ یا انسانوں کو اوتار بنا دیا۔ تاکہ اس طرح مختلف افراد کے ذہن میں "خدا کا تصور" ایک جیسا پیدا ہو جائے۔ ان محسوس پیکروں سے مختلف افراد کے ذہن میں "خدا کی تصویر" تو ایک جیسی کھنچ گئی۔ لیکن اس سے خود انسان جس پست جگہ پر جا گرا وہ ظاہر ہے۔ قرآن نے مذہب کے اس سارے کھیل کو باطل

---

[۱] دیکھئے۔ "خدا کا تصور" جو "سلیم کے نام خطوط" میں شامل ہے

معرفت نہیں قرار دیدیا۔ اس نے خدا کی معرفت (پہچان) کا مطالبہ ہی نہیں کیا۔ اس لئے اس کی ضرورت ہی نہ رہی کہ ہم ذہنوں میں خدا کا تصور پیدا کرتے پھریں۔ اس نے وحی نازل کی اور کہا کہ یہ ہے خدا کی طرف سے عطا فرمودہ ضابطہ قوانین جس کے مطابق تمہارے معاشرے کی تشکیل ہونی چاہیئے، اس قسم کے معاشرے کا نتیجہ انسانیت کی ربوبیتِ عامہ ہوگی۔ جس سے انسان زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ اور اس طرح وہ زمان و مکان کی موجودہ حدود (اقطار السموٰت والارض) سے آگے جا سکے گا۔ یہ قوانین تمام کے تمام احکام کی شکل میں نہیں ہیں (قرآن میں احکام بہت کم ہیں) بلکہ ان اصولوں کی صورت میں ہیں جن کی بنیادوں پر اس معاشرے کی عمارت استوار ہوگی۔ جب ہمارے معاشرے کی تشکیل ان اصولوں کے مطابق ہوگی، تو اس سے جو درخشندہ نتائج سامنے آئیں گے، ان سے ان اصولوں کی حقانیت اور صداقت محسوس پیکروں میں متشکل ہو جائے گی۔ اور اس طرح وحی پر ہمارا ایمان علیٰ وجہ البصیرت یقین میں بدل جائے گا۔ اس معاشرے کے مختلف گوشے Facets ان صفات کے مظہر ہوں گے، جنہیں قرآن نے اسماء الحسنیٰ (صفات خداوندی) کے نام سے متعارف کر دیا ہے۔ اس طرح یہ معاشرہ اپنے محدود دائرے کے اندر صفات خداوندی کا عکاس بن جائے گا۔ اس وقت جب انسان دیکھے گا کہ ان صفات کا عکس اس محدودیت کے باوجود اس کی حیات اجتماعیہ میں ایسا عظیم القدر انقلاب پیدا کر

دیتا ہے۔ تو اس تصور سے کہ ان صفات کی لامحدودیت کیا ہوگی۔ اس کے قلب میں ان صفات کے سرچشمۂ سرمدی کے متعلق عظمت و رفعت کا تحیر انگیز احساس بیدار ہو جائیگا جو اس کے قلب کو والہانہ جذبات سے متموج کردے گا چونکہ صلوٰۃ کا اجتماع اسی انقلاب آفریں نظام کی سمٹی ہوئی شکل کا نام ہے اس لئے یہ اجتماع ان جذبات و احساسات کا مشہود پیکر بن جائے گا۔ اس اعتبار سے بھی دیکھئے تو یہ اجتماع جہاں ایک طرف رسم پرستش سی یکسر جداگانہ چیز ہوگا۔ دوسری طرف یہ عام انسانی اجتماعات سے بھی مختلف ہوگا۔ یہ وہ خصوصیت کبرائے ہے۔ جو اجتماع صلوٰۃ کو منفرد بنا دیتی ہے۔ لیکن جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہ خصوصیت اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ اجتماع نظام خداوندی کے درخشندہ نتائج سے پیدا شدہ احساسات کا آئینہ بردار ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر بھی صلوٰۃ رسم پرستش بن جاتی ہے، جسے نماز کہا جاتا ہے۔

میں کس طرح نماز پڑھتا ہوں؟

اب آپ کے سوال کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے کہ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں

آپ کو اس سوال کے پوچھنے میں کسی معذرت طلبی کی ضرورت نہ تھی۔ اگر آپ میرے پاس ہوتے۔ تو آپ خود دیکھ لیتے کہ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں۔ لیکن چونکہ آپ یہاں سے دور ہیں۔ اس لئے آپ کو لکھ کر پوچھنے کی ضرورت پڑ گئی۔ فرق دونوں میں کچھ نہیں

Marfat.com

میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہوں۔ جس طرح جمہور مسلمان (فقہ حنفی کے مطابق) نماز پڑھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اگر کہیں فقہ حنفی کے علاوہ دیگر طریق پر بھی نماز ہو رہی ہو تو ان کے ساتھ شامل ہو جانے میں بھی توقف نہیں کرتا۔ یہاں آپ کے دل میں سوال پیدا ہوگا کہ ایک طرف میں موجودہ نماز کو ایک بے روح رسم پرستش قرار دیتا ہوں۔ اور دوسری طرف اس رسم کا خود بھی پابند ہوں! میں اس کے متعلق اس سے پیشتر بھی لکھ چکا ہوں۔ اور اسے آج پھر دہراتا ہوں۔ کہ میرا مسلک کیا ہے۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قرآنی بصیرت عطا فرمائی ہے۔ میں اس کی روشنی میں مروجہ اسلام کے ایک ایک عنصر پر غور کرتا ہوں۔ اور جس چیز کو بھی قرآن کے منشاء کے مطابق نہیں پاتا اس پر بلا خوف ملامت تنقید کرتا ہوں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے مروجہ مذہب کو قرآن کی روشنی میں پرکھنا سیکھیں اور اپنی زندگی کو پھر سے اس کے بتائے ہوئے نظام کے تابع لے آئیں۔ یہ عناصر جن پر میں قرآن کی تنقیدی روشنی ڈالتا ہوں۔ دو قسم کے اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو قرآن کی تعلیم سے کھلے طور پر ٹکرائیں اور ملت ..... کی بربادی کا باعث ہوں۔ ان سے میں خود بھی محترز رہتا ہوں۔ اور ان سب کو جو میرے ہم فکر ہوں محترز رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ دوسرے وہ ہیں جن کے اصول تو قرآن میں موجود ہیں۔ لیکن یا تو ان کی جزئیات بے روح بن چکی ہیں۔ اور یا ان میں وقت کے تقاضے کے ماتحت رد و بدل

کی ضرورت ہے۔ ان میں روح تو صرف اس وقت پیدا ہوگی جب قرآن کا نظام پھر سے متشکل ہوگا۔ اسی لئے میری تمام سعی دکاوش ملت کی توجہات کو اس اہم نقطہ کی طرف مبذول کرانے میں صرف ہوتی ہے کہ جب تک قرآن کا نظام ربوبیت قائم نہیں ہوتا ان سا کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا جزئیات میں ردو بدل کا معاملہ۔ سو اس کے متعلق میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ کسی فرد کو ایسا کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ

فرقہ سازی

چیز صرف مرکز نظام قرآن کر سکتا ہے۔ جب تک وہ مرکز قائم نہیں ہوتا۔ جس قسم کی جزئیات پر ملت کا رہند چلی آ رہی ہے انہی کو برقرار رکھنا چاہیئے۔ ان میں انفرادی تغیر و تبدل سے نئے فرقے پیدا ہوتے ہیں اور فرقہ بندی قرآن کی رو سے شرک ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر بھی فریب نہیں دیتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ ان نتائج کا حامل ہے (یا حامل ہو سکتا ہے) جنھیں قرآن مرتب کرنا چاہتا تھا۔ یہ چیزیں، بے روح اور بے نتیجہ ہونے کی وجہ سے میرے نزدیک دین کے اجزاء ہونے کے بجائے مسلمانوں کا قومی شعار بن گئی ہیں۔ چونکہ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ اور اپنے آپ کو نہ ان سے الگ سمجھتا ہوں نہ برتر۔ اس لئے میں ان سے الگ ہٹ کر کوئی "نیا مذہب" ایجاد نہیں کرنا چاہتا۔ میں اسی درماندہ کارواں کا ہم سفر ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی پکارتا جا رہا ہوں کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن ۔۔۔ نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

یہی وہ راہ تھی (یعنی اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے تابع لے آنا) جس کی طرف نبی اکرمؐ نے دعوت دی۔ اس لئے اس راہ کی طرف دعوت دینا سنت رسول اللہ کے عین مطابق ہے۔ ہٰذا میں قرآن کا تبع اور قرآن کی طرف دعوت دینے میں سنت رسول اللہ کا پابند ہوں۔ میں اسی مسلک پر جینا اور اسی پر مرنا چاہتا ہوں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

Marfat.com

زکوٰۃ

ایک اور صاحب رقمطراز ہیں۔

آپ نے طلوع اسلام میں لکھا تھا کہ زکوٰۃ سے مراد وہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرتی ہے۔ ہماری مجلس آئین ساز کے ایک رکن (چودھری نذیر احمد صاحب) نے اسمبلی کے آیندہ اجلاس میں ایک ریزولیشن پیش کرنے کا اعلان کیا ہے۔ جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت ایک محکمہ قائم کرے جس کا کام زکوٰۃ وصول کرنا ہو۔ اور اسے (غالباً) مساجد مکاتب وغیرہ پر صرف کیا جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حکومت کا ٹیکس الگ ہوگا۔ اور زکوٰۃ الگ۔ کیا یہ درست ہوگا؟

جواب۔

زکوٰۃ سے مفہوم وہی ہے۔ جو ہم نے طلوعؔ اسلام میں بیان کیا تھا۔ اس کے لئے قرآن میں حکومت کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ وہ مسلمانوں سے وصول کرے خذ من اموالھم

Marfat.com

صدقۃ (۹/۱۰۲) حتیٰ کہ ان کارکنوں کا بھی ذکر ہے۔ جو زکوٰۃ کی وصولی کے لئے متعین کئے جائیں والعاملین علیہا (۹/۶۰) اس لئے زکوٰۃ اس ٹیکس کے علاوہ اور کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے۔ اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی۔ اس لئے کہ شرحِ ٹیکس کا انحصار ضروریات ملی پر ہے۔ حتیٰ کہ ہنگامی صورتوں میں حکومت وہ سب کچھ وصول کر سکتی ہے۔ جو کسی کی ضرورت سے زائد ہو (یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو) لہذا جب کسی جگہ اسلامی حکومت نہ ہو۔ تو پھر زکوٰۃ بھی باقی نہیں رہتی۔ اس وقت حکومت اپنا ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اور اسے اپنی مصلحتوں کے مطابق خرچ کرتی ہے۔ اور جن معاملات میں غیر اسلامی حکومت آپ کی مدد نہیں کرتی انھیں آپ خیرات سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں انفرادی خیرات کی ضرورت ہی بمشکل پیش آتی ہے۔ اس لئے کہ جن مقاصد کے لئے خیرات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے وہ تمام حکومت کی ذمہ داریوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ جنھیں وہ زکوٰۃ (یعنی ٹیکس سے حاصل شدہ روپیہ) سے پورا کرتی ہے۔ اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آگیا۔ جس تک حکومت کا دست انتظام بروقت نہ پہونچ سکے۔ تو اس کے لئے انفرادی خیرات کی ضرورت محسوس ہوگی (اور ایسے معاملات بالکل شاذ ہوں گے)

جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو مسلمانوں میں دین اور دنیا الگ الگ ہوگئے، اور اسلام عیسائیت کی دوسری شکل بنکر رہ گیا۔ جس میں خدا کا حصہ خدا کے

کے لئے اور قیصر کا حصہ قیصر کے لئے مختص" تھا۔ سلاطین نے اپنے ٹیکس وصول کرنے شروع کئے۔ اور ارباب شریعت نے زکوٰۃ کو اپنے مواجب قرار دے لیا۔ "وہ قیصر کا حصّہ یہ خدا کا"۔ ٹیکس کا روپیہ چونکہ سلاطین کے عشرت کدوں کی رنگینیوں کی نذر ہو جاتا تھا اس لئے مسکینوں اور غریبوں کی ضروریات انفرادی خیرات سے پوری کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس طرح مسلمانوں پر تین ٹیکس الگ الگ قائم تھے۔ حکومت کا ٹیکس مولوی کا ٹیکس اور خیرات کا ٹیکس۔ یہی صورت یہاں انگریزوں کے عہد حکومت میں قائم تھی۔ حکومت اپنا ٹیکس الگ لیتی تھی۔ مولوی اپنا ٹیکس زکوٰۃ کی صورت میں وصول کرتا تھا۔ اور بالکل حکومت کی طرح ایک متعینہ شرع کے مطابق۔ حکومت جیل خانوں کی دھمکی سے اور مولوی قبر میں گرزیں مارنے والوں کے ڈراوے سے۔ باقی رہے غریبوں اور محتاجوں کے کام۔ یا کوئی اجتماعی معاملہ۔ سو ان کے لئے انفرادی خیرات تھی، جو چندوں کی شکل میں وصول ہوتی تھی۔ اس طرح یہ مفلس قوم دوہرے تہرے عذاب میں مبتلا تھی۔

حصولِ پاکستان کے بعد (بلکہ تحریک پاکستان کے دوران میں بھی) ہمارے ارباب اقتدار میں سے ہر ایک کی زبان پر یہ الفاظ تیرتے پھرتے ہیں کہ اسلام میں روح اور مادہ، دین اور دنیا، مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تمیز غیر اسلامی ہے۔ یہ تفریق دہریوں کی پیدا کردہ ہے۔ لیکن عملاً یہ صورت ہے کہ حکومت اپنا ٹیکس الگ وصول کر رہی ہے۔ اور مولوی اپنا ٹیکس (زکوٰۃ) الگ اور ملت کے اجتماعی امور کے لئے اسی طرح انفرادی

خیرات کے چندے ہیں۔ یہ فنڈ اور وہ فنڈ چودھری نذیر احمد کا مجوزہ بل اسی تفریق کو شاہی سند عطا کرنے کے لئے ہے۔

ظاہر ہے کہ ہماری حکومت ہنوز اسلامی حکومت نہیں ہے۔ اس لئے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ آج کل زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکومت ٹیکس وصول کر رہی ہے اگر یہ حکومت اسلامی ہو گئی۔ تو یہی ٹیکس زکوٰۃ ہو جائے گا۔ ایک طرف ٹیکس اور اس کے ساتھ دوسری طرف زکوٰۃ۔ قیصر اور خدا کی غیر اسلامی تفریق ہے۔ اور مسلمانوں جیسی مفلس قوم کو مفلوک تر بنانے کا ذریعہ۔ جو کام آپ زکوٰۃ سے لینا چاہتے ہیں وہ حکومت اپنے ٹیکسوں کی آمدنی سے کیوں نہیں کر سکتی؟ لیکن حکومت خود اسی میں فائدہ دیکھتی ہے کہ لوگ خیرات اور زکوٰۃ کا روپیہ الگ صرف کیا کریں۔ اسی لئے نئے دن چندوں کی اپیل ہوتی رہتی ہے۔ انگریز کے زمانہ میں ان چندوں کی اس لئے ضرورت تھی۔ کہ حکومت کے مقاصد اور ہمارے مقاصد الگ الگ تھے۔ وہ ہماری جن ضروریات کو اپنے خزانے سے پورا نہیں کرتے تھے۔ اور ہم انہیں ایسا کرنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان معاملات کو ہم طوعاً و کرہاً اپنے انفرادی چندوں سے پورا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ کون سا مسئلہ ہے جس میں قوم اور حکومت کے مفاد و مقاصد جداگانہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اب اس تفریق کے کیا معنے کہ فلاں کام حکومت کے روپے سے انجام پائے گا۔ اور فلاں کام پبلک کے چندے سے، اگر کوئی اہم کام سامنے ہے! اور حکومت کے پاس اس کے لئے روپیہ نہیں۔ تو حکومت ٹیکس لگا کر روپیہ وصول کرے۔ اور اس

Marfat.com

کام کو پورا کرے۔ اس طرح وہ رونا بھی ختم ہو جائے گا۔ جو آئے دن چندوں کے غبن کی شکایات کی صورت میں سامنے آتا رہتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ لوگ ٹیکس کو گراں محسوس کرتے ہیں۔ اور چندہ بطیب خاطر دیتے ہیں۔ لیکن آپ نے سوچا بھی کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ وہی ہے کہ جس کی طرف ہم مسلسل ایک سال سے حکومت کی توجہ مبذول کراتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی یہ کہ حکومت اور پبلک میں کوئی باہمی ربط نہیں! حکومت نے پبلک کو کبھی یہ محسوس کرانے کی کوشش نہیں کہ وہ پبلک کی ہی خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ عوام اس وقت تک حکومت کو اپنا نہیں سمجھ سکے۔ ان کے نزدیک حکومت ابھی تک ویسی کی ویسی اجنبی ہے۔ جیسی اس سے پیشتر تھی۔ لہٰذا جب کبھی حکومت کی طرف سے روپیہ کی مانگ آتی ہے۔ تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت اپنے کسی کام کے لئے ان پر جرمانہ کر رہی ہے۔ اور چندہ کی صورت میں وہ سمجھتے ہے کہ یہ ہمارا اپنا کام ہے اگر حکومت عوام کو یہ محسوس کرا دے کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے۔ انھیں کے کام ہیں۔ تو پھر ٹیکس اور چندہ میں فرق ہی باقی نہ رہے۔ زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ اول الذکر کی ادائیگی میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری ہی بھلائی کے لئے ہے۔ اور ثانی الذکر کی صورت میں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی دوسرا اپنی ضرورت کے لئے۔ اس سے یہ رقم بطور تاوان وصول کر رہا ہے۔ حکومت کو ایسا بنا لیجئے کہ لوگ ٹیکس کو زکوٰۃ کی طرح بطیب خاطر ادا کریں۔ اسلامی حکومت کی یہی خصوصیت ہوتی ہے۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ پچھلے سال کسی صاحب نے اسی اسمبلی میں اس مضمون کا ایک سوال کیا تھا کہ حکومت "بیت المال" کیوں نہیں قائم کرتی۔ یعنی ان کے ذہن میں بھی یہ تھا کہ حکومت کا خزانہ وہ ہے جس میں ٹیکس وغیرہ کی آمدنی جمع ہوتی ہے۔ اور بیت المال وہ جہاں زکوٰۃ کا روپیہ جمع ہوتا ہے۔

یہ ہیں ہمارے وہ اراکین کرام جن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسلامی حکومت کا آئین مرتب کریں گے۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے ؟

سطور بالا لکھی جا چکی تھیں کہ مجلس دستور ساز کا وہ اجلاس بھی آ گیا جس میں محولہ بالا زکوٰۃ بل زیر بحث آیا۔ مجلس دستور ساز میں ایک طرف دنیا کی عظیم ترین اسلامی سلطنت پاکستان کے وزراء ہیں۔ جو پاکستان کا تصور بحیثیت امام ملل اسلامیہ پیش کرتے ہیں۔ اسی مجلس میں دوسری طرف وہ طائفہ آئین سازان ہے جو اسی عظیم ترین اسلامی سلطنت کا نظام حکومت مدون کرنے کا داعی ہے۔ یہ دونوں گروہ نظام حکومت کی اہم ترین مد یعنی اس کے اقتصادی پہلو پر بزعم خود اسلامی نقطہ نگاہ سے بحث کرتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ دوسرے کے بعد تیسرا ایک تانتا بندھا ہوا ہے۔ اور ہر ایک اپنی اسلام فہمی اور قرآن دانی کے مظاہرہ میں دوسرے پر بازی لے جانا چاہتا ہے۔ زکوٰۃ کیا شے ہے؟ اس کو کیا سمجھیں یہ

Marfat.com

بے چارے دور کہنت کے امام؟ اس سے پیشتر طلوعِ اسلام میں زکوٰۃ کی ایک گونہ وضاحت آچکی ہے۔ سطور بالا میں مزید وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن ہمارے قانون داں آئین ساز اسی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں جس میں انھوں نے (قرآن کے الفاظ میں) اپنے باپ دادا کو پایا۔ کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ صدیوں پہلے کے ذہن انسانی کی سوچی ہوئی باتیں صدیوں بعد کے زمانہ میں فرسودہ اور بیکار بھی ہو جاتی ہیں روایتی یاجوج ماجوج کی طرح ہر شخص وراثتی معتقدات کی سدِ سکندری کو چاٹتے چاٹتے صبح سے شام کر دیتا ہے۔ لیکن جب بے چارہ دوسری صبح کو آکر دیکھتا ہے تو وہ سدِ سکندری ویسی کی ویسی ہوتی ہے۔ زبانیں چل رہی ہیں اور اعمال اکارت جا رہے ہیں۔ چودھری نذیر احمد صاحب زکوٰۃ کی اہمیت پر لب کشائی فرماتے ہیں "مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ سالانہ بچت کا چالیسواں حصہ خیراتی امور پر صرف کریں" کس نے فرض کر دیا؟ خدا نے تو یہ حکم نہیں دیا۔ قرآن کہیں سالانہ بچت کے چالیسویں حصہ کو خیرات پر صرف کرنے کے لئے نہیں کہتا۔ آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ یہ تناسب ناقابل تبدیل ہے حتے کہ حکومت بھی اسے بدلنے کی مجاز نہیں۔

"زکوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ دولت گردش کرتی رہے۔ اور تجارت ترقی کرے کیا جو قومیں نذیر صاحب کے تصور کی زکوٰۃ نہیں دیتیں۔ ان کے ہاں دولت گردش نہیں کرتی رہتی اور کیا ان کے ہاں تجارت ترقی نہیں کرتی؟ موجودہ زمانے میں جہاں زکوٰۃ کو کوئی نہیں جانتا وہاں تجارت کا کہیں زیادہ چرچا ہے۔ دولت کی گردش بھی یقیناً

Marfat.com

انہیں ممالک میں زیادہ ہے۔ جہاں کے باشندے زکوٰۃ نہیں دیتے!

"اسلام کی مالی حکمت عملی اشتمالیت اور سرمایہ داری کے بین بین ہے (اسلام کا) مقصد یہ ہے کہ ایک وسطی راہ متعین کر دی جائے۔ تاکہ ہر شخص کو اپنی افتاد مزاج کے مطابق نشو ونما کے مواقع میسر آ سکیں" بجا فرمایا آپ نے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ اسلام کی وسطی راہ بھک منگوں اور انفرادی خیرات کے مستحقوں کے لئے نشو ونما کے ذرائع کہاں سے مہیا کرے گی؟ انفرادی خیرات اور اس کا ہمارے انداز نقوی کے مطابق مصرف قوم کو اپاہج بنا سکتا ہے۔ اس کے انا کو بیدار کرکے مستحکم نہیں کر سکتا۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر زکوٰۃ حکومت کے ذریعہ جمع کی جائے تو پاکستان کے غریب باشندوں کی حالت بہت حد تک بہتر ہو جائے گی۔ گویا اگر زکوٰۃ وصول نہ کی جائے۔ تو عوام کی حالت بدستور ابتر رہے گی۔ یا اگر حکومت کے پاس زکوٰۃ کی مدنہ ہو تو عوام کی حالت بہتر بنانے کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی۔ یا اس ضمن میں اس سے چنداں توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ ملکی افلاس کا استیصال ملت کا فریضہ ہے لہذا ملت کی نمائندہ حکومت کا فریضہ ہے۔ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ اس وقت جو ٹیکس ادا کر رہے ہیں وہ حکومت کی جملہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے مکتفی نہیں ہیں تو آپ ٹیکس کی نئی صورتیں پیدا کیجئے۔ اور ملی خزانہ میں مزید رقوم جمع کیجئے تاکہ حکومت جو آپ سے علیحدہ کچھ شے نہیں ہے۔ بلکہ آپ کا ہی قائم کردہ مرکزی ادارہ ہے۔ محض آمدنی کی کمی سے اجتماعی ضروریات پوری کرنے سے قاصر نہ رہ جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہماری

Marfat.com

ملی ضروریات دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ ملت میں اتنے تقاضوں کو پورا کرنے کی استطاعت ہونی چاہیئے۔ یہی احساس و شعور عوام کی حالت بہتر بنانے کا ضامن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب ملت میں یہ احساس عام ہو جائے گا کہ اس کا مرکزی ادارہ آمدنی کی کمی کی وجہ سے مجبور ہے کہ کئی ملی مسائل کی طرف کماحقہٗ توجہ نہ دے۔ تو وہ اپنی آمدنی بڑھانے میں ساعی ہوں گے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ ٹیکس ادا کر سکیں۔ اور مرکزی خزانہ کو اس قابل بنا سکیں کہ وہ ان اخراجات کا متحمل ہو سکے۔ جب ہم اپنے تلے اندازوں کے مطابق بے اندازہ خیرات کرتے اور مستحقین کا تعین انفرادی فیصلوں کے مطابق کرتے ہیں۔ تو اس کا نتیجہ عوام کی حقیقی بہتری نہیں ہوتا۔ کیونکہ خیرات لینے والے سالانہ خیرات اور دیگر صدقات کے انتظار و توقع میں دست و بازو کی محنت سے گریز کریں گے، ایسے کام چوروں کی ہم میں کمی نہیں۔ گداگری جسے روکنے کے لئے اسی اجلاس مجلس دستور ساز میں زکوٰۃ کا علاج پیش ہوا۔ در اصل زکوٰۃ اور صدقات کے غلط مصرف کا براہ راست نتیجہ ہے۔ آپ زکوٰۃ اسی انداز سے ضائع کرتے جائیے۔ جس انداز سے کرتے چلے آئے ہیں۔ گداگر اور کام چور تعداد میں زیادہ ہی ہوں گے۔ کم نہیں ہوں گے۔

ایک اور صاحب فرماتے ہیں :۔ زکوٰۃ حکومت کے ذریعہ وصول کرنی چاہیئے اور جہاں حکومت ایسا نہ کرے وہاں قومی ادارہ اس فریضہ کو سرانجام دے۔ یا لفاظ صحیح تر اگر حکومت پاکستان اس ذمہ داری کو قبول نہ کرے تو قوم ایک الگ ادارہ تشکیل کرے۔ اور زکوٰۃ کی وصولی اور اس کا مصرف اس کے سپرد کرے۔ قوم اور حکومت کی

ثنویت ہمارے دماغوں میں کتنی گہری ہے۔ آپ کو کون سمجھائے کہ حکومت خارج سے مسلط نہیں ہوتی۔ یہ ملت کی کو آپریٹو سوسائٹی ہے۔ ملت اپنا ایک مرکزی ادارہ قائم کرتی ہے اور اپنے تمام اجتماعی اور مشترکہ مسائل اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ ملت ایسا کر کے خود معطل اور بے بس نہیں ہو جاتی۔ وہ خود اس ادارہ کو چلاتی ہے۔ اس پر موثر ہوتی ہے۔ اس کا محاسبہ کرتی رہتی ہے۔ یہ مضحکہ انگیز ہے کہ ملت اجتماعی امور کے لئے ایک مرکز قائم کرے۔ لیکن ایک مد ــــ زکوٰۃ ــــ کے لئے ایک اور جداگانہ ادارہ قائم کرے۔ زکوٰۃ کے لئے علیحدہ ادارے کا سوال یوں پیدا ہوتا ہے کہ ہم حکومت کو دنیاوی امور کا ضامن سمجھتے ہیں اور نام نہاد مذہبی امور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ دین اور دنیا خلط ملط نہ ہو جائے۔ خدا ایک طرف رہے اور قیصر دوسری طرف۔ اس غیر شعوری اعتراف کے باوجود ہم بکرات و مرات اعلان کرتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک ہی شے ہیں۔ ہم نے عملاً مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر رکھا ہے اور انہیں یکجا نہیں ہونے دیتے۔ ہم اس سے پیشتر بھی لکھ چکے ہیں کہ اگر ایسا ادارہ زیر حکومت یا بغیر حکومت قائم ہو گیا۔ تو اس کا یہی نتیجہ نکلے گا کہ ٹیکس تو حکومت کے خزانے میں جائیں گے اور زکوٰۃ اور خیرات "بیت المال" میں جمع ہو گی۔ ٹیکسوں والا خزانہ حکومت کے تصرف میں ہو گا اور بیت المال "قوم" (ارباب مذہب) کے قبضہ میں۔ حکومت کالج کھولے گی اور قوم دارالعلوم، ایک دنیا کا اجارہ لیگی اور دوسری دین کا۔ ہم جس ثنویت کا جائزہ لے رہے ہیں اس کے نوک نشتر کی زد کہیں دور تک پہنچتی ہے۔ حال ہی میں صوبہ

Marfat.com

سرحد کے وزیر تعلیم نے اپنی تعلیمی منصوبہ بندیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک خبر رساں ایجنسی کو بتایا کہ وہ عنقریب اسلامیہ کالج (پشاور) میں ایک دار العلوم کھول رہے ہیں! پہلے تو یہ لطیفہ ملاحظہ فرمائیے کہ ایک وزیر تعلیم ــــ تعلیم! کالج اور دار العلوم میں فرق کر رہا ہے لیکن ہنسئے نہیں۔ فرق ظاہر ہے۔ ایک انگریزی لفظ ہے دوسرا عربی۔ ایک دنیاوی ہے دوسرا دینی۔ ہر چند کالج بھی ایک درس گاہ علم ہے۔ اور دار العلوم بھی درس گاہ علم۔ لیکن جعفر شاہ صاحب درحقیقت دین و دنیا کا فرق پیدا کر رہے ہیں۔ وہ کالج میں تو علوم حاضرہ (دنیوی) کی تعلیم دلائیں گے۔ اور دار العلوم میں علوم مذہبی کی۔ ایک جگہ مسٹر پیدا ہوں گے دوسری جگہ مولانا۔ وہ تخت کے وارث ہوں گے۔ یہ راکب مصلیٰ ہوں گے۔ قوم! بدبخت قوم! ان کو ٹیکس دے گی، ان کو زکوٰۃ دے گی۔ قوم کی کمر ٹوٹے گی۔ نذیر احمد صاحب کے تصور میں عوام کی حالت سنورے گی۔ اور تجارت کی راہیں کشادہ ہوں گی۔

یہ تو خدا (مذہب) کے نمائندے گفتگو فرما رہے تھے۔ اب قیصر (دنیا) کے نمائندوں کی باری آتی ہے۔ پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ کو زکوٰۃ کے وصول پر اعتراض نہیں بلکہ (ارباب مذہب کے جذبات سے) ہمدردی ہے۔ لیکن

زکوٰۃ کی حکومت کے ذریعہ وصولی سے موجودہ ٹیکسوں پر اثر پڑنے کا احتمال ہے۔ ۱۳۰۰ سال پیشتر (یعنی جب زکوٰۃ ایجاد ہوئی تھی) ٹیکس زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ اب گراں بار ٹیکس ناگزیر ہو گئے ہیں (لہذا) اگر مسلمان ــــ (غور فرمائیے) زکوٰۃ دینا چاہتے ہیں۔ تو وہ ایسا کر لیں لیکن

Marfat.com

وہ (مجھ سے) زکوٰۃ کے عوض میں دوسرے ٹیکسوں میں کسی قسم کی رعایت
یا تخفیف طلب کریں۔

مسٹر اور مولانا آمنے سامنے ہیں۔ مسٹر کو اس سے سروکار نہیں کہ ملا کیا کرنا چاہتا ہے
اور کیوں؟ وہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا۔ وہ صرف اس قدر ضمانت چاہتا ہے
کہ اس کے جملہ حقوق محفوظ رہیں گے۔ یعنی اس کے ٹیکسوں پر زد نہ پڑے تو ملا جیسے جی
چاہے قوم کا خون چوسے۔ ہمارے وزیر خزانہ یہ نہیں جانتے کہ زکوٰۃ اور صدقات کے
نام پر ملا نے قوم کی جیبیں خالی کر دیں تو وہ تخفیف کیا طلب کرے گی۔ وہ ٹیکس کی ادائگی
کے قابل ہی نہ رہی گی لیکن۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

مسٹر اپنے ٹیکس پورے کرے گا۔ ملا اپنے صدقات وصول کرے گا۔ دونوں
میں سے ایک کو بھی تو خیال نہیں آیا کہ یہ دوہرا بوجھ اٹھانے والی کمر کس کی ہوگی؟ قوم نہ اس کی
نہ اُس کی۔ قوم کا مالک اللہ۔ جو پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے وہ ان انسانی
کیڑوں کو بھی رینگتا رکھے گا۔

غلام محمد صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ انھوں نے ممالک اسلامیہ سے خط وکتابت
شروع کر رکھی ہے کہ زکوٰۃ کو وہ کیسے وصول کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر زکوٰۃ بل مجلس دستور
ساز میں پیش نہ ہوتا تو قوم کو کبھی پتہ بھی نہ چلتا کہ حکومت پاکستان اس اہم معاملہ پر

Marfat.com

ممالک اسلامیہ سے استصواب کررہی ہے۔ کیا حکومت اور اس کے وزیر خزانہ صاحب کو ممالک اسلامیہ سے استفسار کرتے وقت یہ یقین ہوگیا تھا کہ ملک کا کوئی اہل الرائے اس ضمن میں انھیں مشورہ نہیں دے سکتا۔؟ کیا یہ پاکستانی اصحاب علم کا صریح استخفاف نہیں؟ کیا یہ خود وزیر صاحب بلکہ حکومت کی خفت نہیں؟ اصحاب علم تو ایک طرف رہے۔ کیا مجلس دستور ساز کے ماہرین آئین ارکان میں ایک بھی باخبر اور اہل نہیں تھا؟ اور اس کے بعد یہ کہ کیا انھوں نے اس کا اطمینان کرلیا ہے کہ ان کے خدا نے ان کے لئے جو ضابطۂ قوانین (قرآن) مرتب کیا ہے۔ اس میں اس مشکل مسئلہ کا کوئی حل لکھا ہے یا نہیں؟ (لیکن قرآن تو مردوں کو ثواب پہونچانے کے لئے ہے زندوں کو اس سے کیا سروکار؟) پھر اتنا ہی نہیں کہ حکومت محض خط وکتابت کررہی ہے۔ بلکہ ان ممالک میں اپنے افسر مقرر کرے گی جو مناسب تجربہ اور تربیت حاصل کریں گے۔ ہم حیران ہیں کہ حکومت کیا تجربہ حاصل کرنا چاہتی ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ اس اہم مسئلہ کو بالکل دفتری انداز سے رسوا کیا جارہا ہے۔ جدت کردار وندرت فکر سے عارضی دفاتر میں یہی ہوتا ہے کہ ایک بات پیدا ہوئی۔ وہ دوسرے کے پاس "مشورہ" کے لئے بھیجدی جاتی ہے۔ دوسرا تیسرے کے پاس بھیجدیتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض حالتوں میں یہ طے کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کاغذات کس کے پاس رکیں اور کون رائے دے۔ حکومت کے سامنے زکوٰۃ کا مسئلہ آیا۔ اس نے مخصوص انداز میں اسے ممالک اسلامیہ کی طرف بھیجدیا۔ وہاں سے جو جواب آئے گا۔ اس پر مقلدانہ وعقیدتمندانہ انداز سے عمل درآمد شروع ہوجائے گا۔ اور کوئی اس پر تنقید کرنے کا

مجاز نہیں رہے گا۔ کیونکہ وہ اسلامی ممالک کا عمل ہوگا۔

ہم اپنے وزیر خزانہ صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ اور اپنے ملک پر اعتماد کریں۔ مسائل کا حل کاغذی فائلوں سے نہیں ہوگا۔ انسان اور انسانی دماغ ان کو حل کریں گے۔ یہ سنگ ہائے راہ جس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں وہی ان کو ہٹا سکتا ہے وہی ان کو ٹھکرا سکتا ہے۔ وہ خط لکھ لکھ کر مجرب نسخے نہیں پوچھے گا بلکہ اپنے عزم راسخ سے، اپنی سعی پیہم سے ان سے گزر جانے میں کامیاب ہوگا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اب بھی وقت ہے کہ حکومت پاکستان سنجیدگی اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرے اور بیرون خانہ ٹامک ٹوئیے مارنے کے بجائے اندرون خانہ توجہ کرے۔ اور ملی مسائل کو قرآن کے محکم اصولوں کی روشنی میں تاریخی تقاضوں اور موجودہ ملی ضرورتوں کے مطابق حل کرے۔ ہم اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ وہ ٹیکس جو اسلامی حکومت کی طرف سے عائد ہوتا ہے قرآن کی اصطلاح میں زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ اور حکومت مجاز ہے کہ اس کی شرح حسب ضرورت متعین کرتی رہے۔ اور وہ خزانہ جس میں یہ ٹیکس اور دیگر محاصل حکومت اسلامیہ جمع ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں بیت المال کہلاتا ہے۔

(س) صدقہ و خیرات دریافت کیا گیا ہے کہ جس طرح ہم آجکل خیرات کے پیسے بانٹتے ہیں۔ اس سے کچھ فائدہ بھی ہے۔

جواب۔

Marfat.com

قرآن میں یہودیوں کے متعلق ہے کہ وہ پہلے اپنے اعزہ واقربا کو غیروں کی اسیری میں دیدیتے تھے۔ اور پھر ان کی طرف سے فدیہ ادا کر کے اسارت سے چھڑا لیتے۔ اور اسے بہت بڑا کار خیر سمجھ کر اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیتے۔

بعینہٖ یہ حالت مسلمان سرمایہ داروں کی ہے۔ یہ لوگ دوسروں کا خون چوس کر خود امیر بنتے اور انھیں غریب محتاج بنا دیتے ہیں۔ اور پھر عید شب برات پر ان کی طرف خیرات کے چند پیسے پھینک کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کار ثواب سے ان کی عاقبت سنور جائے گی۔ یعنی جس طرح ہماری متصوفانہ شاعری میں گناہ کو اس لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اگر گناہ گار نہ رہیں گے۔ تو خدا کی صفت غفور، رحیم کا مظاہرہ کس طرح سے ہو گا۔ اسی طرح قوم میں غریبوں اور محتاجوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ کہ اگر غریب نہ رہیں گے تو پھر خیرات کے احکام کی تعمیل کس طرح ہو گی غور کیجئے نظام سرمایہ داری کے جراثیم کا اثر کس قدر دور رس ہوتا ہے۔

اسلام جس نظام کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ہر شخص کی ضروریات زندگی کی کفالت حکومت کے ذمہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نظام میں محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود تصور ہی میں نہیں آ سکتا۔ البتہ بعض انفرادی اور مقامی صورتیں ایسی پیدا ہو سکتی ہیں۔ کہ ان میں فوری امداد کی ضرورت پڑ جائے۔ یا بعض ہنگامی حوادث ایسے رونما ہو سکتے ہیں۔ جن میں خود حکومت کو اس قسم کی ضرورت لاحق ہو جائے، اور وہ ٹیکس عاید کرنے کے بجائے رضاکارانہ طور پر کوئی فنڈ اکٹھا کرنے کی اپیل کر دے

Marfat.com

لیکن اس قسم کے واقعات شاذ ہوں گے۔ عام حالت یہی ہوگی کہ ملک میں حکومت کا نظام محتاجوں کی خود کفالت کرے گا۔ لہذا اسلام میں عام خیرات Charity کی ضرورت یا تو ایسے عبوری دور میں پڑے گی جب آپ کا نظام ہنوز بروئے کار نہ آیا ہو یا بعض مقامی اور ہنگامی حوادث کے لئے غریبوں اور محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود اور پھر ان کی طرف خیرات کے ٹکے پھینک کر اسے اپنے لئے "ثواب" کا کام تصور کرنا، اسلامی نظام میں بار نہیں پا سکتا۔ یہ سرمایہ داری نظام کا فریب نگاہ ہے جسے مذہبی تقدس کے خوش آیند غلاف میں چھپایا جا رہا ہے۔ اور اس کا نتیجہ وہی حبطت اعمالھم۔ کی تفسیر۔ یعنی اس تمام صدقہ وخیرات کے باوجود، قوم میں محتاجوں اور غریبوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور تعداد کے علاوہ غربت اور احتیاج کی شدت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ سب اس سرمایہ داری کے ملعون نظام کی بدولت ہے جو ہمارے ہاں ہر جگہ رائج ہے۔ اور جسے بدلنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ اس لئے کہ کہتے ہیں کہ انسان کا خون نمکین ہوتا ہے۔ اور نمکین خون منہ سے لگا ہوا کبھی نہیں چھوٹتا۔ اس "فاردنیت" کے استیصال کے لئے عصائے کلیمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہی آج ہے نہیں۔

(س) صدقۃ الفطر

ایک صاحب کا استفسار ہے کہ صدقۃ الفطر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

Marfat.com

جواب

جیسا کہ طلوع اسلام میں لکھا جا چکا ہے۔ صدقات ان ٹیکسوں کا نام ہے جو حکومت اسلامیہ کی طرف سے ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے عاید کئے جاتے ہیں، انہی میں صدقہ فطر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں عائد فرمایا (یعنی ہجرت کے فوری بعد۔ روزے ۲ سنہ ہجری میں فرض ہوتے ہیں) جب ابھی اسلامی حکومت اپنی منظم شکل میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور مسلمانوں کو قدم قدم پر ہنگامی ضروریات پیش آ رہی تھیں۔ قرآن میں صدقہ فطر کا خصوصیت سے ذکر نہیں اس لئے کہ قرآن نے صدقات کا حکم اصولی طور پر دیا ہے۔ جزئیات متعین کرنے کا کام ہر زمانے کی اسلامی حکومت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اگرچہ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ صدقہ فطر اس زمانے میں عائد کیا گیا۔ جب ابھی مسلمانوں میں اجتماعی نظم حکومت کی شکل میں متعین نہیں ہوا تھا۔ بایں ہمہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ امور انفرادی نہیں اجتماعی ہوا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دین ہے۔ اور دین (آئینی نظام زندگی) ہمیشہ اجتماعی ہوتا ہے۔ انفرادی نہیں۔ خود صدقہ فطر کے متعلق تاریخ میں ہے کہ لوگ صدقہ فطر اپنے اپنے طور پر نہیں دیتے تھے۔ بلکہ ان عاملین کے پاس جمع کرتے تھے۔ جو اس مقصد کے لئے مقرر کئے جاتے تھے اس کے بعد وہاں سے اس کی تقسیم ہوتی تھی۔ چنانچہ طبری میں یہ بھی ہے کہ نبی اکرم صلعم نے حضرت ابوہریرہ رض کو اس مقصد کے لئے عامل مقرر کیا تھا۔ چونکہ یہ طریقہ اسلام کی اجتماعی

Marfat.com

روح کے عین مطابق ہے اس لئے باور کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں صدقہ فطر کا یہی... نظام رائج ہوگا۔ لیکن اب ہماری لامرکزیت کا یہ عالم ہے کہ صدقہ کے وجوب کی تاکید میں ہر محراب و منبر سے آوازیں بلند ہوں گی۔ لیکن آپ نے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہوگا کہ سنت رسول اللہ یہ ہے کہ اس صدقہ کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ اور پھر اس کی تقسیم مرکز ملت کی طرف سے ہو۔ اب سنت رسول اللہ کا صرف اتنا حصہ پیش کیا جاتا ہے کہ نماز سے پہلے صدقہ فطر نکال کر اپنے اپنے طور پر غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا۔ تو روزے معلق رہ جائیں گے۔ خدا تک نہیں پہنچیں گے۔ گویا صدقہ فطر ملت کے اجتماعی مصالح کے لئے نہیں بلکہ ڈاک کے ٹکٹ ہیں جنہیں روزوں پر چسپاں کر کے لیٹر بکس میں ڈال دیا جاتا ہے۔ تاکہ روزے مکتوب الیہ (اللہ تعالیٰ) تک پہونچ جائیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ بات کیا تھی اور کیا بن گئی

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی

آج سارے عالم اسلامیہ کو چھوڑیئے۔ ایک پاکستان کو لیجئے یہاں کے سات کروڑ مسلمانوں میں سے اگر چھ کروڑ بھی ایسے فرض کر لئے جائیں جن کی طرف سے صدقہ فطر دیا جاتا ہے۔ اور فی کس بارہ آنے کے حساب سے اس کا شمار کیا جائے۔ تو عید کے دن دس بجے سے پہلے پہلے ساڑھے چار کروڑ کی رقم صرف اس فنڈ میں جمع ہو سکتی ہے جس سے اور کچھ نہیں تو خانماں برباد پناہ گزینوں کو چھت تو نصیب ہو سکتی ہے

لیکن جب تک دین کی باگ مولوی کے ہاتھ میں ہے۔ صدقات نکلتے رہیں گے۔ زکوٰۃ دی جاتی رہے گی۔ قربانیاں ہوتی رہیں گی۔ لوگ حج بھی کرتے رہیں گے۔ اور قوم یتیم، بے گھر، بے در، بھوکی، ننگی اسلام کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کا موجب بنی رہیگی،

کتنا بڑا ہے یہ انتقام جو ہزار برس سے اسلام سے لیا جا رہا ہے۔ اور غور کیجئے: کہ اس انتقام کے لئے آلۂ کار کن لوگوں کو بنایا جاتا ہے۔

Marfat.com

قربانی

براہ کرم مطلع فرمایئے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر جو قربانی دی جاتی ہے۔ اس کی دینی حیثیت کیا ہے۔ اس باب میں اگر میں ذرا جرأت سے کام لوں۔ تو امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ قربانی حضرت خلیل اکبرؑ کی یادگار ہے۔ جسے قرآن نے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیم کے واقعہ میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ تم ہر سال اسی طرح جانور ذبح کر کے اس یاد کو منایا کرو پھر اس کی اصل کیا ہے؟ معاف فرمایئے اب کیفیت یہ پیدا ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کا کم از کم پڑھا لکھا طبقہ اسے محسوس کرتا ہے کہ اس سے قوم کا بہت سا روپیہ بےکار جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس احساس کو باہر کہیں بیان نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلامی شعار ہے۔ اس لئے اس کے خلاف لب کشائی جائز نہیں۔ امسال کی عید پر ہمارے اقتصادی حالات پیچیدہ تر ہو چکے تھے۔ بیشتر افراد ملت کا اثاثہ غارت ہو چکا ہے۔ بےشمار گھروں میں بے خانماں اقربا اور یتامیٰ موجود ہیں۔ ان عوامل کا دباؤ لامحالہ محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر اس قسم کی سرگوشیاں اکثر سنی گئیں کہ۔ صاحب میرے ہاں تو اس

قدر بہا جر پڑے ہیں میں انھیں چھوڑ کر کس طرح قربانی دے سکتا ہوں؟ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو "چور" سا محسوس کرتے ہیں کہ قربانی نہ دینے سے وہ گنہگار ہو جائیں گے۔ میں خود بھی انہی "مجرموں" میں سے ایک ہوں۔ اس لئے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قربانی کی دینی حیثیت کیا ہے؟

جواب۔

ہمارے سامنے جب یہ سوال آتا ہے کہ فلاں معاملہ کی دینی حیثیت کیا ہے تو ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے ذہنوں میں کس طرح کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔ اور ہمارے اقتصادی یا معاشرتی حالات پر اس سے کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس باب میں خدا کا حکم کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب قرآن کا صحیح فیصلہ سامنے آجائے تو اس سے وہ تمام ذہنی کشمکش دور ہو جاتی ہے جو انسانوں کے بنائے ہوئے "مذہب" سے ہر قلب سلیم میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اس فیصلہ سے ہمارے اقتصادی اور معاشرتی مسائل بھی خود بخود اعتدال پر آجاتے ہیں۔ کہ اگر قرآن یہ کچھ نہ کرے۔ تو وہ دین حقہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قربانی کے متعلق بھی ہمیں یہ دیکھنا ہوگا۔ کہ اس باب میں خدا کا حکم کیا ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ حضرت خلیل اکبر اور حضرت اسمٰعیل کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا کہ اس واقعہ عظیمہ کے یاد میں جانوروں کو ذبح کیا کرو۔ حتیٰ کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ مینڈھا ذبح کرنے کا واقعہ بھی قرآن میں

نہیں توراۃ میں ہے۔

قرآن کریم میں جانور ذبح کرنے کا ذکر حج کے ضمن میں آیا ہے۔ عرفات کے میدان میں جب یہ تمام نمائندگان ملت ایک لائحہ عمل طے کر لیں گے۔ تو اس کے بعد منیٰ کے مقام پر دو تین دن تک ان کا اجتماع رہے گا۔ جہاں یہ باہمی بحث و تمحیص سے اس پروگرام کی تفصیلات طے کریں گے۔ ان مذاکرات کے ساتھ باہمی ضیافتیں بھی ہوں گی، آج صبح پاکستان والوں کے ہاں۔ شام کو اہل افغانستان کے ہاں۔ اگلی صبح اہل شام کی طرف وقس علیٰ ذالک ان دعوتوں میں مقامی لوگ بھی شامل کر لئے جائیں گے۔ امیر بھی، غریب بھی۔ اس مقصد کے لئے جو جانور ذبح کئے جائیں گے۔ قربانی کے جانور کہلائیں گے۔ چونکہ اس اجتماع کا مقصد نہایت بلند اور خالصۃً لوجہ اللہ ہے اس لئے اس پروگرام کی ہر کڑی خدا کے "قریب تر" لانے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے قربانی کی اصل۔ اسی لئے قرآن نے صراحت فرما دی ہے کہ قربانی کے جانوروں کی منزل مقصود بیت اللہ ہے۔

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ ٥ (۲۲/۳۳)

قربانی کے جانوروں کی منزل مقصود کعبہ ہے۔

مقام حج کے علاوہ کسی دوسری جگہ (یعنی اپنے اپنے شہروں میں) قربانی کے لئے کوئی حکم نہیں۔ تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے کبھی مدینہ میں قربانی نہیں کی۔ جب حج کے لئے خود تشریف لے گئے ہیں۔ تو وہاں جا کر قربانی کی ہے۔ اور

Marfat.com

جب تشریف نہیں لے گئے۔ تو اپنی طرف سے قربانی کے جانور امیر حجاج کے ہاتھوں وہاں بھیجے ہیں۔ اس لئے یہ ساری دنیا میں اپنے اپنے طور پر قربانیاں ایک رسم ہے۔ اسی طرح حاجیوں کی وہ قربانیاں جو وہ آجکل کرتے ہیں محض ایک رسم کی تکمیل رہ گئی ہے، ایک ایک حاجی پانچ پانچ سات سات دنبے انفرادی طور پر ذبح کر دیتا ہے۔ اور چونکہ اس قدر گوشت کا مصرف کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے ان ذبح شدہ جانوروں کو گڑھے کھود کر دبا دیتے ہیں۔

ذرا حساب لگایئے کہ اس رسم کو پورا کرنے میں اس غریب قوم کا کس قدر روپیہ ہر سال ضائع ہو جاتا ہے۔ ہم قومی اعداد و شمار کبھی نہیں رکھتے۔ جس کی وجہ سے ہمیں معلوم ہی نہیں پڑتا کہ ہماری ملی متاع کس قدر ہے۔ اور اس میں خسارہ کس قدر ہوتا ہے۔ لیکن جس قسم کی ہماری اقتصادی حالت ہے۔ اس سے اتنا تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قوم کس قدر غریب واقع ہوئی ہے۔ اب اگر آپ ایک کراچی شہر کو لے لیں۔ تو اس آٹھ دس لاکھ کی آبادی میں سے اگر پچاس ہزار نے بھی قربانی دی ہو اور ایک جانور کی قیمت تیس روپیہ بھی سمجھ لی جائے۔ تو پندرہ لاکھ روپیہ ایک دن میں صرف ایک شہر سے ضائع ہو گیا۔ اب اس حساب کو پورے پاکستان پر پھیلایئے اور اس سے آگے ساری دنیا کے مسلمانوں پر، اور پھر سوچئے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟

لیکن اگر ہمیں سوچنا آجائے، تو پھر ہماری بربادی کیوں ہو؟

Marfat.com

(س) قربانی

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں

پچھلے سال قربانی کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا۔ بہتر ہو کہ اس مسئلہ پر آپ کچھ تفصیل سے لکھیں۔

جواب۔

اجمال ہو یا تفصیل، بات تو صرف اتنی ہے کہ یہ جو ہم بقرعید کے موقعہ پر ہر شہر اور ہر قریہ، ہر گلی اور ہر کوچہ میں بکرے اور گائیں ذبح کرتے ہیں۔ یہ قرآن کے کس حکم کی تعمیل ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں۔ یہ ایک رسم ہے جو ہم میں متوارث چلی جا رہی ہے۔ اور تقلید کے زور دَوں (MOMENTUM) سے غیر شعوری طور پر آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ جب کسی قوم کے اعصاب "تقلید اعمیٰ" سے مفلوج ہو جاتے ہیں۔ تو وہ قوم فکر و تدبر کے جوہر سے عاری ہو جاتی ہے۔ نہیں! بلکہ غور و فکر اس کے ہاں وہ "شجر ممنوعہ" قرار پا جاتا ہے جس کے چھونے سے انسان جنت سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اس باب میں مسلمان دنیا کی دیگر "مذہب پرست" قوموں سے بھی گیا گذرا ہو چکا ہے۔ اس لئے کہ ان کے پاس مذہب کا سرمایہ ہی ان کی رسومات اور روایات ہیں جو ان میں نسلاً بعد نسلٍ متواتر چلی آ رہی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی بدبختی یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے خدا کی کتاب ایک حرف کے تغیر و تبدل کے بغیر موجود ہے۔ اور یہ اسے پس پشت ڈال کر رسوم و روایات کو مذہب بنائے بیٹھے ہیں۔ اور کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم (۲/۷)

Marfat.com

ان کے تمام ذرائع علم پر مہریں لگ چکی ہیں وھم فی طغیانھم یعمھون (۲/۱۵) اور
پڑے اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

جب شعور انسانی عہد طفولیت میں تھا۔ تو اس نے خدا کو انسانی شکل میں ڈھال رکھا تھا۔ انسانی ذہن اس سے آگے ہو ہی نہیں سکتا تھا (یہ تو صرف وحی کی روشنی ہے۔ جو اسے ذہن کی حدود سے اورائے جاتی ہے) اس کا خدا (یعنی دیوتا) انسانوں کی طرح ناراض بھی ہو جاتا تھا۔ اور انھی کی طرح خاطر و خوشامد اور نذر و تحائف سے من بھی جاتا تھا۔ گوشت اور خون چونکہ اس زمانے کے انسان کی مرغوب ترین غذا تھی۔ اس لئے وہ اپنے روٹھے ہوئے "خدا" کو اسی سے مناتا تھا۔ اسی سے مردوں کی روحوں کو بھی خوش کیا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ مردے گوشت کو ہی ٹھوس شکل میں کھا نہیں سکتے تھے اس لئے اسے آگ میں جلا کر اس کی خوشبو کو ان تک پہونچایا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ دیوتا (بالخصوص سورج دیوتا) کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی تقویت کے لئے تازہ خون اور گوشت یا اس کی سوختنی لطافت کی ضرورت ہے قدیم یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ سورج اپنے رتھ میں دن بھر آسمان کی مسافت طے کر کے شام کو سمندر میں چلا جاتا ہے۔ چونکہ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اس پیہم سفر سے اس کا رتھ بوسیدہ اور اس کے گھوڑے ماندہ ہو جاتے ہوں گے۔ اس لئے وہ ہر سال ایک مضبوط سا رتھ اور چار تنومند گھوڑے سمندر میں ڈبو دیتے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ یہ خیال پیدا ہوتا گیا کہ دیوتا کے حضور ایسی قربانی دی جائے

جو انسان کو سب سے زیادہ محبوب ہو۔ موسم کا اولین پھل۔ کھیتی کی پہلی پیداوار مویشیوں کے پہلے بچے۔ اور انسانی قربانی کرنے والوں میں پہلوٹھا بچہ بہترین قربانی متصور ہوتا۔

غرضیکہ یہ تھے ذہن انسان کے عہد طفولیت کے کھیل۔ آسمانی روشنی آتی رہی۔ اور انسانی ذہن کو ان توہمات سے نکالتی رہی۔ لیکن اس کے مدھم پڑ جانے پر وہ پھر انہی کھیلوں میں مشغول ہو جاتا رہا۔ حتیٰ کہ قرآن آیا۔ اور انسانی تاریخ میں اس نے ایک ایسا عظیم القدر انقلاب پیدا کیا کہ اس سے پہلے اور بعد کی دنیا یکسر دو الگ دنیائیں نظر آنے لگیں۔ اس نے دین کی عمارت کو انسانی فکر اور بصیرت کی محکم بنیادوں پر استوار کیا۔ اور توہم پرستی کی ایک ایک زنجیر کو توڑ کر رکھدیا۔ پھر اس مقصد کے پیش نظر کہ یہ زنجیریں پھر انسان کے پہلے کی طرح گلوگیر نہ ہو جائیں، اس نے قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا۔ تا کہ سفر زندگی میں جو نہی کوئی دوراہا آئے۔ یہ پکار کر کہدے کہ منزل مقصود تک لے جانے والی راہ کون سی ہے۔

لیکن ادھر مشیت یہ انتظامات کر رہی تھی اور ادھر ضلالت و غوایت کے شیاطین و ابالیس اس قسم کی تدبیریں سوچ رہے تھے کہ ان انتظامات و تحفظات کے باوصف اس قوم کو کس طرح پھر انہی راستوں پر ڈالا جائے۔ جہاں سے قرآن اور صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) نے انہیں نکالا تھا۔ اور جو انسان کو سیدھے تباہی و بربادی کے جہنم کی طرف لے جانے والے تھے۔ چنانچہ یہ اپنے حیل و مکائد میں کامیاب ہوئے اور انھوں نے قرآن کی موجودگی میں مسلمانوں کو یکسر قرآن سے الگ کر دیا۔ حتیٰ کہ آج

Marfat.com

حالت یہ ہے کہ انھیں خالص قرآن کی طرف دعوت دینے والا۔ گمراہ کرنے والوں میں سے
..... دکھائی دیتا ہے۔ نگاہوں کے زاویوں کو اس درجہ پھیر دینا۔ اور انسانی بصیرت کو
اس قدر ممسوخ کر دینا ابلیسی سازشوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

قرآن نے دین کے اجتماعی نظام (قیام اور استحکام) کے لئے ملت اسلامیہ کے
ارباب فکر و نظر کا ایک سالانہ اجتماعی تجویز کیا تھا۔ جو حج کے نام سے موسوم ہے۔ اس
اجتماع کا قیام مکہ کی بے برگ و گیاہ وادی میں کعبہ کا مرکزی نقطہ تھا (اس مقصد عظیم
کے لئے اس مقام کو کیوں متعین کیا گیا۔ یہ ایک الگ بحث ہے اور جداگانہ تفصیل
کی محتاج) اہل مکہ کے لئے اتنے عظیم الشان اجتماع کی مہمانداری مشکل تھی۔ اور یوں
بھی اس وادی میں پیداوار ہی بہت کم ہوتی تھی۔ اور اسباب نقل و حرکت کی بھی
کمی تھی۔ اس کے لئے تجویز یہ کیا گیا کہ اس اجتماع میں شریک ہونے والے نمائندے اپنے
ساتھ اپنے جانور لیتے آئیں۔ راستہ میں ان سے سواری اور بار برداری کا کام لیں اور
قیام مکہ کے دوران میں انھیں اپنی خوراک بنائیں۔ خود بھی کھائیں اور وہاں کے رہنے
والے ضرورت مندوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیں۔ یہ حقیقت تھی ان جانوروں
کی جو حج کی تقریب پر مکہ میں ذبح کئے جاتے تھے۔ قرآن میں ان کے اس مقصد اور
ذبح کے مقام کے متعلق واضح تصریحات موجود ہیں۔ سورۂ حج میں ہے

لکم فیھا منافع الی اجل مسمی ثم محلھا الی البیت العتیق

ان چارپاؤں میں تمہارے لئے ایک وقت معینہ کے لئے فائدے ہیں اور پھر انہیں خانہ کعبہ تک پہونچانا ہے!

اس سے واضح ہے کہ راستہ میں ان جانوروں سے کام لیا جائے گا۔ (انہیں "بتوں کا سانڈ" سمجھ کر مقدس تصور نہیں کیا جائے گا) اور پھر خانہ کعبہ تک پہنچا کر انہیں ذبح کیا جائے گا۔ ذبح کر کے خود بھی کھایا جائے گا۔ اور دیگر ضرورتمندوں کو بھی کھلایا جائے گا

یذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر

ہم نے جو مویشی ان کے لئے مہیا کر دیئے ہیں۔ ان کو (ذبح کرتے وقت) معلوم دنوں میں اللہ کا نام لیں۔ پھر ان کا گوشت خود بھی کھائیں۔ اور بھوکے ضرورتمندوں کو کھلائیں۔ ایسی کھلی ہوئی تصریحات کے بعد پھر تاکیداً سمجھا دیا کہ دیکھنا! کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ چڑھاوے کے جانور ہیں۔ جن کا گوشت پوست خدا تک پہنچتا ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے۔ خدا دیوتا نہیں کہ اس کے استھان پر قربانیوں کا گوشت اور خون چڑھاؤ۔ یہ جانور تمہارے اپنے ہی فائدے کے لئے ہیں۔ خدا تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ جس مقصد عظیم کے لئے تم جمع ہوئے ہو، اسے تم کس حد تک پورا کرتے ہو، (تقویٰ کا یہی مفہوم ہے) چنانچہ فرمایا کہ

فکلوا منھا واطعموا القانع والمعتر۔ کذالک سخرھا لکم

Marfat.com

لعلکم تشکرون۝ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا
ولکن ینالہ التقوٰی منکم

ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور دیگر زائرین اور حاجتمندوں کو بھی اس میں شریک کرو۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، تاکہ تم انھیں صحیح مصرف میں لاؤ (شکر) یاد رکھو ان کا خون اور گوشت اللہ تک نہیں پہنچتا۔ اس تک تو جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تم نے اپنے فرض منصبی کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ اور یہ فرض منصبی کیا ہے؟ "لتکبروا اللہ" تاکہ تم ساری دنیا سے منوالو کہ اقتدار اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس سے بڑا کوئی نہیں ہے حج کے اجتماع کا مقصد۔ ہی یہی تھا کہ ملت اسلامیہ کے نمائندے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کریں۔ جس سے ساری دنیا میں آئین خداوندی نافذ ہو سکے ویکون الدین کلہ للہ اور اطاعت صرف خدا کی باقی رہ جائے۔ اسی لئے اس اجتماع اور اس کے جملہ متعلقات تضمنات کو "نوع انسانی کے قیام" کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس والشھر
الحرام والھدی والقلائد (سورہ مائدہ)

کعبہ بیت الحرام (جہاں یہ اجتماع ہوتا ہے) اور حرمت والے مہینے (جن میں یہ اس اجتماع کا انعقاد ہوتا ہے) اور قربانیوں کے جانور (جو اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے خوراک بنتے ہیں) کو اللہ

نے نوعِ انسانی کے قیام (البقا) کا ذریعہ بنایا ہے۔

بس یہ تھی قربانی کی اصل و غایت، سارے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی نہیں لکھا کہ مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ بھی قربانی دی جائے گی (قربانی کا لفظ بھی قرآنی نہیں) اسے سامنے رکھئے اور پھر اسے دیکھئے کہ آج کل آپ کے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اول تو حج ہی اپنے مقصد کو چھوڑ کر محض "یاترا" بن کر رہ گیا ہے۔ حاجی وہاں جاتے ہیں تاکہ اپنے تمام سابقہ گناہ آبِ زمزم سے دھو کر اس طرح واپس آجائیں۔ جس طرح بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو! "جب اصل موضوع ہی اپنے مرکز سے ہٹ چکا ہو، تو اس کے متعلقات کا اپنی غایت سے الگ ہو جانا کون سا مستبعد ہے۔ اب وہاں ہر حاجی دو چار جانور ذبح کر کے انھیں ریت کے گڑھوں میں دبا دیتا ہے، اور خوش ہو جاتا ہے کہ میں نے "پل صراط" پار کرنے کے لئے سواری مہیا کر لی ہے۔ ادھر یہ کچھ ہو رہا ہے۔ اور باقی دنیا میں مسلمان ہر گلی کوچے میں بکرے اور گائیں ذبح کر کے ان کا گوشت لئے اٹھائے پھرتے ہیں، جسے دوسرے یا تیسرے دن شہر سے باہر پھنکوانے کے لئے بلدیہ کو خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ یہ کچھ ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا نہیں سوچتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ ہے ایک بین مثال اس حقیقت کو سمجھنے کی کہ جب دین (یعنی نظامِ حیاتِ اجتماعیہ) "مذہب" (انفرادی نجات کے لئے رسومات کا مجموعہ) بن کر رہ جاتا ہے۔ تو دین کے وہی عناصر جن سے ایسے درخشندہ نتائج مرتب ہوا کرتے تھے۔ کہ ان سے قیصرو

Marfat.com

کسریٰ کے محلوں اور قلعوں میں متزلزل واقع ہو جاتا تھا۔ کس طرح بے جان اور
بے روح عقائد اور بے معنی اور بے مقصد رسومات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جن کا نتیجہ
دنیا اور آخرت دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔ مذہبی رسومات کی ان دیمک خوردہ لکڑیوں
کو قائم رکھنے کے لئے طرح طرح کے سہارے دیئے جاتے ہیں۔ کہیں قربانی کو سنت
ابراہیمی قرار دیا جاتا ہے۔ کہیں اسے صاحب نصاب پر واجب ٹھہرایا جاتا ہے
کہیں اسے تقرب الٰہی کا ذریعہ بتایا جاتا ہے۔ کہیں دوزخ سے محفوظ گذر جانے
کی سواری بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے متعلق قرآن میں ہے کہ آپ
نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ آپ نے سمجھا کہ یہ اشارہ
غیبی ہے۔ اس لئے اس کی تعمیل ضروری ہے۔ بیٹے سے ذکر کیا۔ تو اس نے بھی کہا کہ
اگر یہ حکم ہے۔ تو اس کی تعمیل میں قطعاً تامل نہ کیجیے۔ میں ذبح ہونے کے لئے تیار ہوں
آپ نے بیٹے کو لٹایا اور اس کے گلے پر چھری رکھ دی۔ کہ اللہ نے پکارا کہ اے ابراہیم
تم نے خواب کو حکم خداوندی پر محمول کر کے اس کی پوری تعمیل کر دی۔ اس لئے ظاہر
ہے کہ اگر تمہیں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی حکم دیا گیا تو تم اسے بلا تامل
ادا کر دو گے۔ یقیناً تم باپ اور بیٹا دونوں اطاعت و تسلیم کے بلند ترین مقام پر فائز ہو،
اس بیٹے (حضرت اسماعیل) کو اللہ نے کعبہ کی تولیت کے لئے منتخب کر لیا۔ قرآن
میں بس اتنا ہی واقعہ ہے۔ توریت میں البتہ یہ بھی ہے کہ جبریل نے جنت سے ایک
مینڈھا لا کر اسے اس بیٹے کی جگہ لٹا دیا۔ اور چھری بیٹے کی جگہ مینڈھے کی گردن پر چلی

گئی۔ لیکن یہ تو اسرائیلی افسانوں میں سے ایک افسانہ ہے۔ قرآن اس کی تائید نہیں کرتا
اب اس پر غور کیجئے کہ اس قربانی کو جو ہمارے یہاں مروج ہے۔ سنت ابراہیمی قرار
دینا بھلا کس نسبت سے ہے۔ پھر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ خود رسول اللہ نے بھی
مدینہ میں قربانی نہیں دی۔ حج ۹ھ میں فرض ہوا۔ حضور اس سال خود تشریف
نہیں لے گئے۔ لیکن اپنی طرف سے کچھ جانور امیر کاروان حضرت ابوبکر صدیق کے
ساتھ کر دیئے کہ وہاں مصرف میں لائے جائیں اگلے سال خود حضور حج کے لئے
تشریف لے گئے۔ اور وہیں جانور ذبح کئے۔ لہٰذا ہر جگہ قربانی دینا نہ حکم خداوندی
ہے۔ نہ سنت ابراہیمی اور نہ ہی سنت محمدی۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں حاجی قربانی
دیتے ہیں۔ اور باقی جگہ کے مسلمان ان کی ہم آہنگی میں اپنی اپنی جگہ وہی کچھ کرتے
ہیں۔ اس دلیل کی عنکبوتیت خود واضح ہے۔ حاجیوں کی ہم آہنگی کے لئے۔ سارے
ارکان حج میں سے صرف قربانی کو ہی کیوں منتخب کیا گیا؟ پھر جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا
ہے۔ قربانی تو وہاں کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے کا ذریعہ تھی۔ اب جس طرح وہاں
جانور ذبح کر کے دبائے جاتے ہیں۔ نہ ہی وہ مقصود خداوندی ہے اور نہ ہی ان کی ہم
آہنگی میں ہر جگہ جانوروں کا ذبح کرنا کسی مقصد و غایت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے
وہاں بھی سب کچھ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اور یہاں بھی وذالك خسران المبین

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال ہو گا... کہ جب اس قربانی کے لئے کوئی حکم
اور کوئی سند موجود نہیں۔ تو ہزار برس سے یہ کس طرح متواتر چلی آرہی ہے۔ اس

کے خلاف کسی نے آواز کیوں نہ اٹھائی۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔ اور اس کا جواب اس وقت ملے گا۔ جب کوئی مرد حق گو اسلام کی تاریخ (مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) لکھیگا۔ اس لئے کہ یہ سوال صرف ایک قربانی تک ہی محدود نہیں۔ یہ تو پورے کے پورے اسلامی نظام کو محیط ہے۔ وہ دین جو محمدؐ رسول اللہ نے دنیا تک پہنچایا تھا اس کا کونسا گوشہ اور کون سا شعبہ ہے جس میں تحریف نہیں ہو چکی! تو پھر پوچھنے کا سوال یہ ہے کہ یہ کیا ہوا کہ ہزار برس سے اسلام میں ایسی کھلی ہوئی تحریف ہوتی چلی آرہی ہے اور کسی نے اس کے متعلق کوئی آواز نہیں اٹھائی (الا ماشاءاللہ) یہ سوال بڑا جگر خراش ہے۔ اور اس کا جواب اس سے بھی کہیں زیادہ دلسوز اور جانگسل ..... اور یہ جواب جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت پورے طور پر دیا بھی نہیں جا سکتا۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ اسلام دنیا سے ملوکیت اور پیشوائیت (ملائیت) مٹانے کے لئے آیا تھا۔ وہ ابن آدم کو ذہنی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے صرف خدا کا محکوم رکھنا چاہتا تھا۔ جو درحقیقت اس کی اپنی فطرت صالحہ کی محکومی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن جب اس دور حریت کے بعد پھر سے ملوکیت نے سر نکالا۔ تو اس کے ساتھ ہی پیشوائیت کی وہ روح بھی ابھری جسے قرآن نے مسل کر رکھدیا تھا اسلام اس طرح جگمگا کر دنیا کے سامنے آیا تھا۔ کہ اسے یک لخت نگاہوں سے اوجھل کر دینا ممکن نہ تھا۔ ملوکیت کی ابلیسانہ وسیسہ کاریوں نے اس کے لئے تلبیس کا دام ہمرنگ زمین وضع کیا۔ اور نہایت سادگی اور پرکاری سے وضع کیا۔ اسلام کے خارجی

Marfat.com

مظاہر کو بالکل اسی طرح رہنے دیا۔ لیکن ان میں سے روح پوری طرح کھینچ لی اسی غرض کے لئے اسے پیشوائیت سے سمجھوتا کرنا پڑا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سمجھوتہ کے بغیر کہیں بھی ملوکیت کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس پیشوائیت نے جس کا ہمارے یہاں ملائیت نام ہے، آہستہ آہستہ مسلمانوں کو یہ افیون پلانی شروع کی کہ دنیا کے معاملات دنیا داروں کا حصہ ہیں جو اس مردار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مذہب انسان کی عاقبت سنوارنے کے لئے ہے۔ اس نے جس قدر حکم دے رکھے ہیں ان کے متعلق یہ کبھی نہ پوچھو کہ ان کی غائت کیا ہے۔ یہ خدا کی باتیں ہیں۔ جو خدا ہی جان سکتا ہے۔ مذہب میں عقل کا کوئی کام نہیں۔ تم صرف یہ سمجھ لو کہ فلاں بات کا حکم ہے۔ اس لئے اسے کرنا ہے۔ اور اس کا "ثواب" تمہارے اعمال نامہ میں لکھا جائے گا۔ اور یہ تمام پڑیاں قیامت کے دن ترازو میں رکھ کر تولی جائیں گی۔ اور جنت میں لے جانے کا ذریعہ بن جائینگی۔ یہ وعظ اس لئے تھا کہ اگر دین کے مختلف ارکان و عناصر کی علت غائی سامنے آجاتی تو اس سے سب سے پہلے ملوکیت کی رگ جان کٹتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی پیشوائیت کی۔ لہذا انہوں نے اس تلبیس سے دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اب نماز۔ روزہ حج۔ زکوٰۃ، جماعت، امام وغیرہ کا مقصود رہ گیا "عاقبت سنوارنا" اور عبادات سے مفہوم سمجھ لیا گیا۔ خدا کی "پرستش" کرنا۔ لیکن تنہا اس وعظ سے کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ لوگ قرآن پڑھتے تھے۔ اور اس میں اصل مقصود کی طرف راہ نمائی کے نشانات (آیات) قدم قدم پر ملتے تھے۔ لہذا اس باب میں بھی اسی

تلبیس سے کام لیا گیا۔ اس کے لیے یہ عقیدہ پیدا کیا گیا کہ قرآن کا صحیح مفہوم ہر شخص... سمجھ نہیں سکتا۔ اس کے احکام مجمل ہیں اور ان کی تشریح و تفسیر رسول اللہ کے اعمال واقوال ہی ملتی ہے۔ بات بظاہر بڑی جی لگتی تھی۔ اب اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ رسول اللہ کے وہ اعمال واقوال کہاں سے ملیں گے، جو قرآن کی تفسیر ہیں۔ اس کے لیے روایات وضع ہونی شروع ہوگئیں۔ اب "دین" میں حک واضافہ اور تحریف والحاق کا وہ دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ جسے ختم نبوت یعنی قرآن کی محفوظیت نے اس طرح بند کیا تھا۔ اب پوری آزادی تھی کہ جو جسکے جی میں آئے وضع کرے اور اسے رسول اللہ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کرکے روایات کے زمرہ میں شامل کردے۔ ملوکیت قرآن کی نقیض تھی۔ اس لیے ملوکیت کی حمایت میں جو کچھ کہا جاتا تھا اس کا خلاف قرآن ہونا ظاہر تھا۔ اب دلوں میں یہ خلش پیدا ہوئی کہ کیا رسول اللہ کے اعمال واقوال قرآن کے خلاف بھی ہو سکتے ہیں۔ اس خلش کو دور کرنے کے لئے پہلے تو قرآن کی بے شمار آیات کو منسوخ قرار دیا۔ اور جب اس سے بھی کام نہ چلا۔ تو یہ عقیدہ پیدا کیا گیا کہ "حدیث قرآن کی ناسخ ہے۔" اور اس پر قاضی بھی۔ چلئے میدان صاف ہوگیا قرآن رہ گیا محض ثواب کی خاطر پڑھنے اور اس کا ثواب مُردوں تک پہنچانے کے لئے باقی رہا ندہب۔ سو وہ روایات کے مجموعہ میں سمٹ کر آگیا۔ اور جہاں روایات قرآن کے مخالف وضع کرنی پڑیں تو اس اختلاف کو اس عقیدہ نے گوارا کردیا کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہے!۔

Marfat.com

ایک گروہ اور اٹھا۔ اور اس نے کہدیا کہ قرآن اور حدیث دونوں کا صحیح مفہوم ائمہ فقہ کے فقہی فیصلوں میں ملے گا۔ جو کچھ وہاں سے ملے اسی کو اصلی دین سمجھو کہ دین میں تفقہ انہی تک محدود تھا۔ ہم عاجز بے چارے دین میں تفقہ کی اہلیت کہاں رکھ سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ پیدا کیا۔ اور اس کے بعد جو جی میں آیا ان آئمہ کرام کے سر تھوپ دیا۔ اب دین نام رہ گیا ان فتاوی کے مجموعوں کا جو ان آئمہ کبارؒ سے نسبت رکھنے والے گروہوں نے اپنے اپنے ہاں مدون کر رکھے تھے۔ ایک اور جماعت آگے بڑھی۔ اور اس نے کہدیا کہ یہ احکام اور ان پر اس طرح کی ظاہرداری کی یہ پابندی سب ہڈیوں کا ڈھیر ہے۔ اصل دین (جو مغز تھا) وہ ان الفاظ وارکان کے اندر چھپے ہوئے باطنی معانی میں پوشیدہ ہے۔ اور وہ رسول اللہ سے سینہ بسینہ بطور علم لدنی مستور طریقہ پر آگے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیجئے اب کسی دلیل و حجت اور سند و تائید کی بھی ضرورت نہ رہی اور مسلک صحیحہ یہ قرار پاگیا کہ ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا!

یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اور اس کے سائے تلے ملوکیت بڑھتی، پھولتی پھلتی چلی آرہی تھی۔ حتے کہ یہ عقائد و رسوم قوم کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ اور کچھ وصہ بعد یہ حالت ہوگئی کہ ان رسوم و عقائد کو حق و صداقت کا مسلک ثابت کرنے کے لئے کسی کاوش و کاہش کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اس طرح یہ تمام چیزیں

عین دین بن گئیں اور تقلیداً آگے بڑھتی چلی آئیں۔ اب ان کی صحت و جواز (نہیں بلکہ ان کے تقدس و عظمت) کے لئے سوائے اس کے اور کسی دلیل کی ضرورت ہی باقی نہ رہی کہ یہ چیزیں ہزار برس سے امت میں متواتر چلی آ رہی ہیں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ساری کی ساری امت غلط راہوں پر چلی آ رہی ہو؟ اور اس کے لئے اس قسم کی روایتیں بھی موجود ہیں کہ "میری امت کا سواد اعظم کبھی گمراہی پر نہیں ہو سکتا۔"

کیا اس کے بعد بھی اس سوال کا جواب آپ کے ذہن میں نہیں آ سکتا، کہ جب ہماری موجودہ قربانی ہزار برس سے اسی طرح متواتر چلی آ رہی ہے۔ تو پھر یہ روش غلط کس طرح ہو سکتی ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے ذہن میں مذکورہ صدر تصریحات کے بعد بھی اس کا صحیح جواب آ جائے۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ تقلید کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے قوائے فکریہ مفلوج اور اس کا ذہن شل ہو جائے۔ یہ بات صرف اسی کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جو پہلے اس حقیقت کو بطور ایمان اپنے سامنے رکھ لے کہ

(۱) دین فقط کتاب اللہ کے اندر ہے

(۲) کتاب اللہ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے اس لئے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۳) جو کچھ اس وقت ہمیں دین کہہ کر دیا جا رہا ہے۔ اس میں صرف وہی دین ہے۔ جو کتاب اللہ کے مطابق ہے۔ باقی بعد کے اضافے

Marfat.com

ہیں۔ خواہ ان پر تقدس و عظمت کے کتنے ہی بڑے غلاف کیوں نہ چڑھا رکھے ہوں۔

لیکن یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جب اس "ایمان" کو عام کیا جائے اور چونکہ اس "ایمان" کے عام ہو جانے میں ملوکیت اور ملائیت دونوں کی موت مضمر ہے۔ اور ملوکیت اور ملائیت ساری دنیا کے مسلمانوں کے اعصاب پر سوار ہے۔ خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ اس لئے اس "ایمان" کو آج کوئی بھی عام نہیں ہونے دے گا۔ ان کی پوری کوشش یہی رہے گی کہ

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

قربانی گذشتہ اشاعت میں قربانی سے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اس نے ذہنی اور قلبی فضا کو بڑی حد تک مرتعش کیا۔ جنھیں قرآن کے نام سے چڑ ہے انھوں نے حسب عادت "مقدس گالیوں" سے نوازا۔ سلیم فطرت سعید روحوں نے خدا کے حکم کے سامنے اپنے دل اور نگاہ ۔ ۔ ۔ کو جھکا دیا۔ بعض تحقیق پسند ذہنوں کی طرف سے مزید استفسارات موصول ہوئے۔ ان استفسارات

ہیں ایک ایسا بھی ہے۔ جسے ہم طلوع اسلام کے صفحات پر لے آنا ضروری سمجھتے ہیں سورہ کوثر تین آیات پر مشتمل ہے۔ (۱) اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ

ہم نے تجھے کوثر بخشا

(۲) فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

پس اپنے رب کیلئے نماز پڑھ اور اسی کیلئے نحر کر

(۳) اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ

تیرا دشمن محروم و نامراد رہے گا

کہا جاتا ہے کہ اس میں آیت ۲ (وانحر) سے قربانی کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ ہم اس وقت اس جلیل القدر سورت کے تفصیلی مطالب بیان کرنا نہیں چاہتے۔ موضوع گفتگو کو صرف وانحر اور اس کے متعلقات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اس آیت کے عام معنی کئے جاتے ہیں۔

"پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر"

لہٰذا اس میں سب سے پہلے نحر کے معنی غور طلب ہیں۔ آپ کتب لغت اور تفاسیر کو دیکھئے۔ اس لفظ کے متعدد معانی نظر آئیں گے

امام راغب لکھتے ہیں کہ النحر موضع القلادۃ من الصدر نحر چھاتی کے اوپر گلوبند کے مقام کو کہتے ہیں۔" اس کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ وانحر میں ہاتھوں کو نحر کے مقام پر رکھنے کا حکم ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے روایت ہے۔ کہ نحر

سے مطلب نماز میں ہاتھوں کو چھاتی کے اوپر رکھنا ہے۔ عطا کا بیان ہے کہ داخر کے معنی یہ ہیں کہ دو سجدوں کے درمیان اس طرح سیدھا ہو کر بیٹھ کہ تیری چھاتی نمایاں ہو جائے۔ ضحاک وغیرہ کا قول ہے کہ دعا کے بعد دونوں ہاتھ چھاتی کے اوپر کے حصے تک بلند کرو۔ امام بیہقی کے نزدیک اس کے معنی نماز میں ہاتھ یہاں رکھنا ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ اس سے مفہوم قبلہ کی طرف منہ کرنا ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز میں محراب کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا ہے۔

امام رازی اس سے " اونٹ ذبح کرنا " مراد لیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ قول عامة المفسرین ان المراد هو نحر البدن یعنی تمام مفسرین اس سے ذبح شتر مراد لیتے ہیں۔ یعنی یہ اس لفظ کے اصلی معنی نہیں مرادی معنی ہیں۔

اب ان تمام مختلف معانی میں سے اگر نحر کے معنی " اونٹ ذبح کرنا " ہی لے لئے جائیں۔ تو بھی اس سے (i) قربانی کرنا اور وہ بھی (ii) ہر گلی کوچہ میں قربانی کرنا کس طرح ثابت ہو سکتا ہے؟ فصل لربك وانحر میں صَلِّ (نماز پڑھ) اور انحر (اونٹ ذبح کرنے کا حکم مطلق (عام) ہے اسے مقید (خاص) کر کے صلِّ سے مراد "عید کی نماز" اور نحر سے مراد " اونٹ کی قربانی " کس اصول کے ماتحت لی جا سکتی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس سے مراد " اونٹ کی قربانی " نہیں۔ تو پھر اس حکم کے معنی کیا ہیں۔! اس کے لئے ہمیں سورہ کوثر کی پوری تفسیر لکھنی ہو گی۔ جس کے لئے

Marfat.com

اس وقت گنجائش نہیں۔ اشارۃً یوں سمجھ لیجئے کہ عام اقوال کے مطابق یہ سورت ہجرت سے ذرا پہلے مکہ میں نازل ہوئی۔ زمانہ وہ تھا کہ نبی اکرمؐ چاروں طرف سے مخالفتوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے۔ عام نگاہوں میں آپ کے پیغام حق و صداقت کے دشمن غالب اور کامیاب دکھائی دیتے تھے۔ حالات یہاں تک ناساعد ہو چکے تھے کہ آپ مکہ کو چھوڑنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ ناامیدیوں اور مایوسیوں کی اس تیرہ و تار فضا میں۔ عین ان ناساعد حالات کے اندر آپ کو بشارت دی جاتی ہے کہ گھبرانے اور فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کے خیر کثیر کے خزانے تمہارے منتظر ہیں۔ اور یہ دشمن جو اس طرح غرور و تکبر سے اپنے آپ کو کامیاب و شادکام سمجھ رہے ہیں۔ دنیا بھر کی تباہیاں اور محرومیاں انہی کے لئے ہیں۔ ذرا انتظار کرو اور دیکھو کہ یہ انقلاب کس طرح تمہارے سامنے آ جاتا ہے۔ مکہ سے ہجرت کے بعد مدینہ جانا تھا۔ وہاں یہود کا بڑا زور تھا۔ دنیاوی ڈپلومیسی پر نگاہ رکھنے والوں کو خیال آ سکتا تھا کہ قریش مکہ سے انتقام کی خاطر یہود مدینہ سے سمجھوتہ کیا جائے گا۔ قرآن نے اس کی نفی ایک لفظ میں فرما دی۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا۔ ان کے ساتھ سمجھوتہ کی صورت میں ان کے ان جذبات کا احترام ضروری تھا۔ لیکن قرآن نے پہلے ہی کہدیا کہ ان سے دب کر سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ ان کے علی الرغم اونٹوں کو ذبح کیا جائے گا[1]۔ یعنی وہاں بھی غلبہ تمہارا ہی رہیگا۔

---

[1]۔ ان مطالب کیلئے ہم نے معارف القرآن جلد چہارم سے استفادہ کیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت فتح مکہ کی بشارت ہے۔ اور اس بشارت پر کوثر نحر اور ان شانئک ھوالابتر کے ٹکڑے صاف دلالت کرتے ہیں۔ قریش کا زور فتح مکہ ہی سے ٹوٹا تھا۔ اور اسی کے ساتھ یدخلون فی دین اللہ افواجا (اللہ کے دین میں لوگوں کے فوج در فوج داخل ہونے کا) "خیر کثیر" کا منظر سامنے آیا تھا چنانچہ بعض مفسرین کا تو یہ بھی خیال ہے کہ یہ سورہ یا تو فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی یا صلح حدیبیہ کے روز (جسے قرآن نے فتح مبین کہا ہے) چنانچہ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ فصل لربك وانحر والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوئی"

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ

(۱) نحر کے معنی متعدد ہیں۔ "اونٹ کا ذبح کرنا" اس کے مرادی معنی ہیں۔

(۲) اگر فصل لربك وانحر میں نحر سے مراد "اونٹ کا ذبح کرنا" ہی لیا جائے۔ تو بھی یہ حکم عام ہے۔ اس سے ایام تشریق کی مروجہ قربانی کا حکم کس طرح نکل سکتا ہے؟

(۳) عام روایات کے مطابق سورۂ کوثر مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ اور اس وقت نہ عید و بقر عید کی نماز تھی (حتیٰ کہ جمعہ کی نماز بھی نہیں) اور نہ ہی قربانی کا کوئی سوال تھا۔

(۴) اگر "وانحر" سے مراد "قربانی" ہے۔ تو اس حکم کے مطابق قربانی صرف اونٹ

Marfat.com

کی دی جانی چاہیئے۔ نہ کہ بھیڑ بکری اور گائے بیل کی۔ نحر کا لفظ "اونٹ ذبح کرنے" کے لئے خاص ہے۔ اور جانوروں کے ذبح کرنے کے لئے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

(۵) آخر میں یہ کہ اگر تمام بحث کو چھوڑ کر اسے فرض بھی کر لیا جائے کہ وانحر سے مراد قربانی ہے۔ تو جب قرآن نے قربانی کا مقام متعین کر دیا (یعنی مکہ) تو وانحر کے معنی بھی انھی اونٹوں کی قربانی ہو گی۔ جو حج میں ذبح کئے جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ قربانی کا مقام بیت العتیق (کعبہ) ہے۔ اور اس کے سوا کہیں نہیں۔ یہ جو ہم ہر قریہ اور ہر بستی میں عید کے موقعہ پر جانور ذبح کرتے ہیں۔ اس کے لئے خدا نے کہیں حکم نہیں دیا۔ لہٰذا اگر بفرض محال سورۂ کوثر میں وانحر سے مراد "اونٹ کی قربانی" ہی لی جائے۔ تو بھی اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قربانی ہر مقام پر دی جا سکتی ہے۔ ہم مقام قربانی سے بحث کر رہے ہیں۔ نہ کہ حج کی تقریب پر جانور ذبح کرنے سے۔" حج کی تقریب پر مکہ میں جانور ذبح کرنے کھانے اور کھلانے کے علاوہ دیگر مقامات پر "جانوروں کی قربانی" کا حکم قرآن میں کہیں نہیں اور یہ وانحر سے بھی ثابت نہیں۔

Marfat.com

غلام اور لونڈیاں

میں نے ذیل کا خط محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا

"میں آپ کے اس مطالبہ سے متفق ہوں کہ پاکستان میں شریعت کا نظام نافذ ہونا چاہیئے۔ اس باب میں دو ایک باتیں دریافت طلب ہیں جن کی وضاحت کے لئے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ کیا نظام شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہوگی؟ کیا ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا؟ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہوگا اور اس پر تعداد کی تو کوئی قید نہ ہوگی؟

(۲) کیا اس نظام شریعت میں لونڈی اور غلام کی خرید و فروخت (علاوہ ان لونڈی غلاموں کے جو جنگی قیدی ہوں) ابھی پاکستان میں جائز ہوگی جس طرح آجکل حجاز میں بردہ فروشی ہوتی ہے!

Marfat.com

اس کے جواب میں مودودی صاحب کی طرف سے ذیل کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے۔

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ! آپ کا عنایت نامہ ملا جو سوالات آپ نے کئے ہیں۔ ان کا مختصر جواب تو "ہاں اور نہیں" کی شکل میں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے آپ کی تسکین نہیں ہوگی اس لئے میں ذرا تفصیل کے ساتھ آپ کو جواب دیتا ہوں

نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت ایسی صورت میں دی گئی ہے۔ جبکہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہوئی ہو نہ تو قیدی کے تبادلے پر راضی ہے۔ نہ فدیہ لے کر قیدی چھوڑے اور نہ فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے۔

آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں۔ وہ یا تو انھیں قتل کر دے گی۔ یا انھیں عمر بھر اس قسم کے "انسانی باڑوں" میں رکھے گی۔ جنھیں آجکل Concentration Camp کہا جاتا ہے۔ اور کسی قسم کے "انسانی حقوق" دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہیگی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ بھی ہے اور خود اس ملک کے لئے بھی زیادہ مفید نہیں ہے۔ جس میں اس قسم کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک خارجی عنصر کی حیثیت سے

Marfat.com

موجود ہے۔ اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کر دی جائے۔ اس طرح جو انفرادی رابطہ ایک ایک شخص کا ایک مسلم خاندان سے پیدا ہوگا۔ اس میں اس کا امکان زیادہ ہے کہ ان سے انسانیت اور شرافت کا برتاؤ ہو اور ان کا ایک اچھا خاصا حصہ تدریج مسلمانوں کی سوسائٹی میں جذب ہو جائے۔

جن مسلمانوں کو ایسے اسیران جنگ پر حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں ان کے لئے شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی لونڈی یا غلام ان سے درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری کر کے اپنے فدیہ کی رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں تو وہ اس کی درخواست کو رد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ انہیں از روئے قانون ایک خاص مدت تک کے لئے اس کو مہلت دینی ہوگی اور اس مدت میں اگر وہ اپنی رقم ادا کر دے۔ تو اسے آزاد کر دینا پڑے گا۔

ا اس قسم کے لونڈیوں اور غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک اس سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے۔ اس کو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص تک منتقل کر دیتا ہے۔ یہ قانون میں گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے۔ اس کو پوری طرح سے اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں۔ جبکہ کی

Marfat.com

دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا اتفاق ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے لئے گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برانہ ہو سکے اس کے حقوق ملکیت دوسرے کی طرف منتقل کر دے۔ تو یہ لوگ بلائے جان بن جاتے جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے (جبکہ نہ ان کا تبادلہ ہوا اور نہ فدیہ کا معاملہ طے ہو سکے) اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دیدی جائیں اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا۔ تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلنے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔ قانونی حیثیت سے "ملک یمین" اور عقد نکاح میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بلکہ "ملک یمین" تو باقاعدہ حکومت کے توسط سے حاصل ہوتی ہے۔ جو عورت کسی کے "ملک یمین میں دیدی جائے اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا جنسی تعلق جائز نہیں ہے۔ جو اولاد اس سے ہو گی۔ اس کا نسب اصل مالک ہی سے ثابت ہو گا اور وہ اپنے باپ کی اسی طرح جائز وارث ہو گی جس طرح کسی آزاد بیوی کی اولاد۔ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے۔ اسے بیچنے کا مالک کو حق نہیں رہتا۔ اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود

Marfat.com

آزاد ہو جاتی ہے۔

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے اگر لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا جائے۔ لیکن بعد کے ادوار میں امراء اور رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنایا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے۔ اور قانون کے منشاء کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے۔ تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روزانہ ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے۔

حجاز میں جو بردہ فروشی آجکل ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اصولی طور پر میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ جنگ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے آزاد آدمیوں کو پکڑنا اور ان کی خرید و فروخت کرنا شریعت میں حرام ہے۔ والسلام

بقلم ابو صالح اصلاحی بحکم حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

محترم مودودی صاحب نے میرے استفسارات کا جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا۔ لیکن ان کے خط سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہی۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان لونڈیوں سے تمتع بھی جائز ہوگا۔ اور اس پر تعداد کی کوئی قید نہیں ہوگی۔

اس کی تائید میں انھوں نے جو دلائل بیان فرمائے ہیں۔ کم از کم میں تو ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ میرا تو اس تصور سے دل کانپتا ہے کہ اسلام جو دنیا سے غلامی کو ہٹانے کا مدعی ہے۔ وہ خود انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دیتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے گذارش ہے کہ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا مودودی صاحب کے خط سے میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں وہ درست ہے۔ اور آیا اسلام کی یہی تعلیم ہے؟ جواب خواہ براہ راست مجھے تحریر فرمادیں۔ خواہ طلوع اسلام میں درج فرمادیں۔ والسلام

جواب۔

ہمارے بھائی نے مودودی صاحب کے خط سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ اسلام میں اسیران جنگ کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاسکتا ہے۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور ان لونڈیوں سے بلا قید نکاح و تعداد جنسی تعلقات بھی

Marfat.com

پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ باقی رہے ان کے دلائل تو وہ یقیناً ارسطو کے ان دلائل سے زیادہ وقیع اور قوی نہیں ہیں جو وہ نفس غلامی کے جواز بلکہ وجوب میں دیا کرتا تھا کہتے ہیں اس کے پاس ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے وجوب میں اتنے ہی دلائل رکھتا تھا جنہیں ناقابل تردید سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یونان کو ارسطو کے دلائل لے ڈوبے اور اسلام کو مودودی صاحب جیسے فقہا کی منطق۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ہمیں اس اضطراب کی علت بھی معلوم ہے جس کی وجہ سے مودودی صاحب کو اس سیدھے سادے جواب کے لئے دلائل و مصالح کے سہارے تلاش کرنے پڑے خواہ وہ دلائل و مصالح خود سہاروں کے محتاج ہی کیوں نہ ہوں۔ اور وہ علت یہ ہے کہ ایک طرف ان کا دامن روایات کی خاردار جھاڑیوں سے الجھا رہتا ہے اور دوسری طرف وہ "ماڈرن" بھی بننا چاہتے ہیں۔ لہذا کشمکش لازمی ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا ہے مرے آگے

طلوع اسلام خدا کے عطا فرمودہ دین ہی کو دین سمجھتا ہے جو حقائق کا صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قدامت و جدت کی کشمکشوں سے بلند ہے۔ وہ جب قدامت بھی حاصل کر سکنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ خدا کی کتاب میرے حامل ہوتا ہے۔ اس لئے اسے ان امور میں کبھی الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا

قرآن میں اسیران جنگ کے متعلق سورۂ محمد کی ایک ہی آیت میں حکم ہے اور
اس آیت کے چار لفظوں نے معاملہ کو صاف کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جنگ میں
جو قیدی تمہارے ہاتھ آئیں۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً
انھیں فدیہ لیکر چھوڑ دو یا احسان رکھکر

اللہ اللہ خیر سلا۔ باقی رہی وہ مدت جس میں وہ بطور قیدی تمہارے پاس
رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ انسان ہیں کہ اور ان سے انسانوں جیسا سلوک روا رکھا جائے
گا۔ کسی سے انسانیت سے گرا ہوا سلوک۔ خود مسلمان کے شعار کے خلاف ہے۔ کسی ان
پر دوسرے انسان کا "حق ملکیت" یکسر غیر فطری ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ ایک انسان کو دوسرے
انسان کی ملکیت میں دیدینے کی اجازت دیدے اور اس کے لئے راہیں کشادہ
کردے۔ غلامی اسی کو کہتے ہیں۔ اور اسلام کا دامن تقدس ان اتہامات سے یکسر پاک
ہے۔ جو اس کے دشمنوں نے وضعی روایات کے راستہ اس پر لگائے
اور جو آج ہماری شومئی قسمت سے ہمارا دین بن چکے ہیں سبحان اللہ تعالیٰ
عما یصفون۔

قرآن میں الک یمین (غلاموں اور لونڈیوں) کے متعلق جس قدر احکام

وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں۔ جو اس وقت عربوں کے ہاں موجود تھے اور جنھیں آہستہ آہستہ ان احکامات کی رو سے جزو سوسائٹی بنایا جا سکتا تھا۔ اس نے انھیں اس طرح بتدریج معاشرۂ اسلامی میں جذب کیا۔ اور آئندہ کے لیے غلامی کے دروازے اس حکم کی رو سے بند کر دیئے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی ملوکیت نے ان دروازوں کو ایک ایک کر کے پھر سے کھول دیا۔ اور قیامت بالائے قیامت کہ اس ننگ انسانیت مسلک کو وضعی روایات کی رو سے منسوب کر دیا اس ذات اقدس و اعظم کی طرف جس کے ظہور کا مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا تھا کہ وہ ان اغلال و سلاسل کو توڑنے کے لئے آیا ہے جس میں انسانیت جکڑی ہوئی آرہی تھی۔ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم

مودودی صاحب غلامی کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آجکل جنگ کے قیدی جس قسم کے Concentration Camp میں رکھے جاتے ہیں۔ اور ان سے وہاں جس قسم کا انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے اس سے بہتر ہے کہ انھیں غلام اور لونڈیاں بنا لیا جائے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

اول تو یہ کہ انھوں نے فرض کر لیا ہے کہ کہ قرآنی نظام میں بھی قیدیوں کے عبوری زمانہ میں کیمپوں کی یہی حالت ہو گی جیسی آجکل کی ابلیسی سیاست میں ہوتی ہے۔ اس نظام میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ انسانوں سے انسانی

Marfat.com

جیسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ وہ نظام ظلم روکنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔ نہ کہ ظلم کرنے کے لئے پھر یہ بھی دیکھنے کہ بجائے اسکے کہ ہم ان Camps کی اصلاح کا کوئی طریقہ سوچیں جو مسلمانوں کے ہاں اسیران جنگ کے لئے تیار کئے جائیں گے ہم کہتے ہیں تو یہ کہ اسلام نے اس خرابی کا حل یہ بتایا ہے کہ ان کے مردوں کو غلام بنا لیا جائے۔ اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں۔ کیا عمدہ اصلاح ہے۔ انسانیت اس پر ناز کرے گی، اور دنیا کے قیدی اس احسان عظیم پر سجدہ ریز جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ ان کی بیویاں۔ بہنیں، بیٹیاں۔ ان "مصلحین" کی ہوس رانیوں اور عیش جوئیوں کا سامان بن رہی ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ

فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

یعنی قیدیوں سے کام لینا مشکل ہے۔ اور اسی طرح ان کی عورتوں کو گھروں میں رکھنا بے حد پُر خطر

لیکن جب انہیں غلام بنا لیا جائے۔ تو پھر یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اور ان کی عورتوں سے جب ان کے مردوں کے سامنے ان کی اپنی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات قائم کر لیئے جائیں۔ تو اس سے وہ تمام خطرات رفع ہو جائیں گے۔ جو دشمن قوم کے افراد ہونے کی جہت سے ان کی طرف سے وارد ہو سکتے تھے،

پھر فرماتے ہیں۔

Marfat.com

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دی جائیں۔ اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا۔ تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔

یعنی اگر ایک شخص دس بیس عورتیں سنبھال لے۔ ان سے ان کی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات پیدا کیے اور پھر جب جی چاہے انھیں کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے۔ اور اس کی اس دوسرے سے قیمت بھی وصول کرے۔ تو یہ سب کچھ پاکیزگی اخلاق میں شامل ہے۔ اور اگر ان عورتوں کو اس طرح آپس میں نہ بانٹا جائے۔ تو وہ سوسائٹی میں "مستقل بداخلاقی" پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ اول الذکر بداخلاقی اس لئے حسن اخلاق میں داخل ہوگئی کہ آپ نے اسے مشروع قرار دیدیا۔ اور مؤخر الذکر اس لئے حرام کاری قرار پاگئی کہ آپ کی بارگاہ سے اسے جواز کا فتویٰ نہیں مل سکا۔ آریہ سماجی "نیوگ" کی تائید میں بھی یہی دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ جس قسم کے تعلق کو سوسائٹی جائز قرار دیدے۔ وہ جائز ہو جاتا ہے اس پر کسی کو اعتراض کا کیا حق حاصل ہے۔؟

لونڈیوں کی تعداد کو بے قید چھوڑ دینے کا فلسفہ بیان فرمانے کے بعد مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

Marfat.com

لیکن بعد کے ادوار میں امراء و رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنایا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قوم کے ہاں لونڈیاں دھڑا دھڑ آ رہی ہوں۔ ان کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کی طرف منتقل بھی کی جا سکتی ہوں۔ تو پھر وہ کون سی "عیاشی" ہے جسے آپ شریعت کی منشا کے خلاف کہہ سکتے ہیں۔ جسے لونڈی مل جائے اور "شریعت" اس سے جنسی تعلقات کی اجازت دیتی ہو۔ تو پھر اس لونڈی سے تمتع۔ عیاشی کا حیلہ کس طرح بن جائے گا۔ عیاشی کے سامان تو خود فراہم کر دیئے جائیں اور ان سے مستفید ہونے والوں پر الزام بھی دھرا جائے۔ باقی رہا ہر روز ایک نئی عورت سے نکاح کر کے دوسرے دن طلاق دیدینا۔ سو یہ بھی اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب نظام شریعت قرآن پر مبنی نہ ہو۔ قرآنی نظام میں طلاق دیدینا ایسا کھیل نہیں ہے۔ اس میں یہ مذاق نہیں ہو گا کہ طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہا اور بیوی کو ٹھوکر مار کر باہر نکال باہر کیا

مودودی صاحب نے لونڈیوں پر بڑا احسان یہ ظاہر فرمایا ہے کہ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے۔ اسے بیچنے کا مالک کو کوئی حق نہیں رہتا۔ اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔" لیکن کسی اور کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو انھیں تو یقیناً معلوم ہو گا کہ ان کی "شریعت" نے یہ تدبیر بھی خود ہی بنا دی ہے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات بھی قائم کئے جائیں اور پھر یہ خدشہ بھی نہ رہے کہ ان کے اولاد پیدا ہو جائے گی

Marfat.com

اور اس طرح اسے بیچنے کا حق باقی نہ رہے گا[1]

سنیے وہ تدبیر کیا ہے؟ صحیح بخاری کتاب البیوع، باب بیع الرقیق (مطبوعہ مصر، جلد دوم۔ صفحہ ۱۸) میں یہ حدیث بیان کی گئی ہے۔

ان ابا سعید الخدری اخبرہ انہ بینما ھو جالس عند رسول اللہ قال یا رسول اللہ انا نصیب سبیا فنحب الاثمان فکیف تری فی العزل فقال او انکم تفعلون ذالک لا علیکم ان لا تفعلوا ذالکم فانہا لیست نسمۃ کتب اللہ ان تخرج الا ھی خارجۃ۔

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک روز جبکہ رسول اللہ پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور سے یہ عرض کیا کہ ہم قیدی عورتوں کے ساتھ جماع کرتے ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ حاملہ نہ ہوں۔ کیونکہ ہم انھیں بیچنا چاہتے

---

[1] طلوع اسلام پر وہ وقت بڑا اذیت وکرب کا ہوتا ہے جب اسے کوئی ایسی بات درج کرنی پڑجائے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جائیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ بعض صورتیں ایسی پیش آجاتی ہیں کہ ان میں یہ ناگوار فریضہ ناگزیر ہوجاتا ہے۔ چنانچہ موضوع زیر نظر میں ہم عمداً اس سے گریز کرتے رہے کہ وہ روایات درج نہ کرنی پڑیں جو لونڈیوں کے بارے میں ہماری کتب احادیث میں موجود ہیں لیکن ایک دو روایات تو ضرور نقل کرنی ہی پڑ گئیں۔ ان کے بغیر اصلی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔

Marfat.com

ہیں۔ تو عزل کرنے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ حضور نے فرمایا کیا تم ایسا کرتے ہو۔ تم پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ جو بچہ پیدا ہونے والا خدا نے مقرر کیا ہے۔ وہ پیدا ہو کر رہے گا۔

عزل کے متعلق صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب العزل (جلد سوم ص۱۶۲) میں جابر بن عبداللہ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ۔

قال کنا نعزل علیٰ عهد النبی والقرآن ینزل

ہم حضور کے زمانہ میں عزل کیا کرتے تھے۔ اور قرآن نازل ہوا کرتا تھا اور اگر حمل ہو جائے تو؟ اسی صحیح بخاری (جلد دوم ص۱۸) میں یہ حدیث بھی موجود ہے کہ۔

لا باس ان یصیب من الجاریة الحامل مادون الفرج

اس میں بھی حرج نہیں کہ اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے علاوہ دوسری جگہ سے مجامعت کر لی جائے۔

معاذاللہ! معاذاللہ! یہ ہیں وہ احادیث جنھیں حضور ختمی مرتبت علیہ التحیہ والصلوٰۃ کی ذات گرامی اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور نہیں شرمایا جاتا کہ کل قیامت کو خدا اور اس کے رسول امین کے سامنے کیا جواب دیں گے۔

بہرحال یہ ہے کہ وہ "نظام شریعت" جسے مودودی صاحب یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ آپ لے اپنے ہاں رائج کریں گے اور قوم مخالف کے جنگی قیدیوں کو غلام

Marfat.com

اور ان کی مستورات کو لونڈیاں بنالیں گے تو آپ انھیں بھی نہیں روک سکتے کہ وہ آپ کے قیدیوں کو غلام بنائیں۔ اور آپ کی شریف بیبیوں کے ساتھ اسی طرح جنسی تعلقات قائم کر کے انھیں آگے منتقل کرتے رہیں۔ یہ سلسلہ جب عام ہو جائے گا تو مودودی صاحب اور ان کے ہم نوا حضرات خوش ہوں گے کہ "خدا کا دین کس طرح ساری دنیا میں خود بخود پھیل رہا ہے۔

گئے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے!
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

Marfat.com

ایصالِ ثواب

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ کسی کے مرنے کے بعد کھانے پکوا کر یا قرآن پڑھ کر اس کا ثواب مُردوں کو پہونچاتے ہیں۔ تو کیا یہ ثواب واقعی مردہ تک پہونچ جاتا ہے؟ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس کی دینی حیثیت کیا ہے؟"

جواب۔

"ایصال ثواب" کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ ضروری ہے کہ ثواب کا صحیح مفہوم متعین کر لیا جائے۔ اس لئے کہ جب تک یہ متعین نہ ہو کہ ثواب کہتے کسے ہیں اور یہ ہوتا کیا ہے۔ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آسکے گا کہ ایک کا ثواب دوسرے تک پہنچ سکتا ہے یا نہیں۔

اگر کوئی پوچھے کہ قرآن کا پیغام کیا ہے۔ اسلام کی تعلیم کا منشا اور مفہوم کیا ہے تو دو لفظوں میں اس کا جواب یہ ہے کہ اس تمام تعلیم کا مقصود و مفہوم ہے۔ مکافاتِ عمل

Marfat.com

قرآن کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کناں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ صرف اس اصل اصول پر قائم ہے کہ یہاں ہر حرکت ایک متعینہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ وہ عالم آفاق کے اس محسوس و مشہود نظام اور نظام کی ... علت سے اس حقیقت پر شہادت لاتا ہے کہ عالم انفس (دنیائے انسانیت) میں بھی یہی اصول جاری و ساری ہے۔ یعنی انسان کی کوئی حرکت دل کا ارادہ اور نگاہ کی جنبش تک بلا نتیجہ رہ نہیں سکتی۔ اور ہر حرکت و عمل کا نتیجہ متعین ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ خدا۔ ملائکہ۔ رسالت۔ آخرت پر ایمان کا تقاضا بھی اسی اصل الاصول پر یقین محکم کے لئے ہے کہ انسان کی کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی۔ خدا مالک یوم الدین ہے ۔ دین کے معنی مکافات عمل کے ہیں۔ ملائکہ عالم امر کی وہ تدبیری قوتیں ہیں جو ہر عمل کو اس کے نتیجہ تک پہونچانے کا ذریعہ بنتی ہیں رسول اس پیغام ازلی کو انسانوں تک پہونچانے کا واسطہ ہے کہ ان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ کتاب وہ محک اور میزان ہے جس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان کے فلاں عمل کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور یوم الدین اعمال کے ظہور نتائج کا وقت۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ اسی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

اسلام سے پہلے، مختلف مذاہب چونکہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہے تھے اس لئے ان کے ہاں مکافات عمل کا تصور بھی بڑا غلط اور گمراہ کن ہو چکا تھا۔ یہودیت

Marfat.com

ہیں خدا کا تصور ایک شاہنشاہ کا تھا جو اگر خوش ہو جاتا تھا۔ تو اپنی بخشش اور نوازشات کے دریا بہا دیتا تھا۔ اور اگر اسے غصہ آجاتا تھا۔ تو تباہ و برباد کر دیتا تھا عیسائیت دوسری طرف نکل گئی اور اس نے یہ عقیدہ پیدا کر لیا کہ تمام انسان آدم کے جرم کی وجہ سے پیدائشی طور پر گناہگار پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے گناہوں کا کفارہ خدا کے اکلوتے بیٹے نے اپنی جان سے دیدیا۔ اس طرح انسانوں کی نجات ہو گئی، نذر یا کفارہ کا یہی تصور ہمیں قدیم ایرانیوں کے ہاں بھی ملتا ہے جہاں سے یہ عقیدہ برہمنوں میں آیا۔ اور قریب قریب سارا مشرق اس سے متاثر ہو گیا۔ اس لئے کہ یہ بے عملوں کے لئے فریب نفس کا نہایت کامیاب حیلہ تھا۔ اسلام آیا۔ تو اس نے ان تمام باطل تصورات کو یک قلم مٹا دیا۔ اور ان کی جگہ مکافات عمل کا وہ تصور جو عین فطرت اور بصیرت کے مطابق تھا۔ انسانوں کو عطا کر دیا۔

یہ فطرت اور بصیرت کے مطابق تصور وہی ہے۔ جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ جو شخص کوئی کام کرتا ہے اس کام کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ اور وہ نتیجہ اس شخص کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس اصول کو طبیعاتی دنیا میں دیکھئے کہ کس طرح کارفرما ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ ایک شخص آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے، اس کی اس حرکت کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا ہاتھ جل جاتا ہے جس سے اسے تکلیف پہنچتی ہے۔ ایک دوائی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ وہ جلے ہوئے کو اچھا کر دیتی ہے۔ وہ اس دوائی کو لگاتا ہے۔ اور اس سے اچھا ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

کیا یہ ممکن ہے کہ آگ میں وہ اپنا ہاتھ ڈالے اور جل جائے میرا ہاتھ؟ یا یہ کہ دوائی میں اپنے ہاتھ پر لگاؤں۔ اور اچھا ہو جائے اس کا زخم؟

ایک شخص سنکھیا کھاتا ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سنکھیا وہ کھائے اور ہلاک میں ہو جاؤں؟

سنکھیا کا اثر زائل کرنے کے لئے گھی اور دودھ استعمال کرایا جاتا ہے کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ سنکھیا زید نے کھایا ہو اور دودھ اور گھی بکر کو پلایا جائے اور زید سے سنکھیا کی سمیت کا اثر زائل ہو جائے۔

صبح کی سیر صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ آپ صبح دو چار میل کی سیر کر آئیں۔ درآں نحالیکہ میں ہنوز بستر میں پڑا ہوا ہوں۔ اور آپ اپنی سیر کے اثرات کو میری طرف منتقل کر دیں؟ یہ ناممکن ہے۔ یہ خلاف فطرت ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ سیر کے جو اثرات آپ کی جسمانی حالت پر مرتب ہو رہے ہیں، آپ انھیں کسی طرح مجھ تک منتقل کر دیں۔ میں جب تک خود سیر کرنے نہ جاؤں گا سیر کے مفید اثرات سے بہرہ یاب نہیں ہو سکوں گا۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ جس طرح یہ جسمانی موثرات ہر روز تمہارے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ اسی طرح ہر عمل کے معنوی موثرات ہیں۔ جو تمہاری ذات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ (اسے روح کہہ لیجئے یا انسانی ذات بات ایک ہی ہے) اور جس طرح تمہارا یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ کسی ایک کے جسمانی اعمال کے موثرات دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی ایک کے نتائج معنوی اثرات دوسروں کی طرف منتقل ہو جائیں

Marfat.com

یعنی عمل تو میں کروں اور ذات کسی دوسرے کی ۔ ۔ ۔
اثر پذیر ہو جائے۔ ہر شخص کے عمل کا اثر اس کی اپنی ذات کو متاثر کرتا ہے۔ اگر اعمال صالح ہیں۔ تو وہ اس کی فطری صلاحیتوں میں بالیدگی اور ارتقار پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اگر اعمال باطل ہیں۔ تو وہ ان صلاحیتوں کو دبا دیتے ہیں۔ جس کی صلاحیتوں میں نشو و ارتقاء نہ آسکا۔ وہ نامراد رہا۔ (وقد خاب من دسّٰها)

عمل کا نتیجہ جو انسانی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ثواب کہلاتا ہے۔ سورۃ تطفیف میں ہے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۸۳/۳۶)

کفار کو ان کے اعمال ہی کا نتیجہ (ثواب) دیا گیا

ثواب کا مفہوم متعین کر لینے کے بعد اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا ایک کا ثواب (یعنی اس کے کسی کام کا نتیجہ) کسی دوسرے کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ ممکن ہے کہ دوائی میں پیوں اور بخار زید کا اتر جائے۔ تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اچھا کام میں کروں اور اس کے نتیجہ کا اثر زید پر مترتب ہو جائے۔ اور اگر وہ ممکن نہیں تو پھر ایصال ثواب کس طرح ممکن ہے؟ یہی حقیقت ہے جسے قرآن نے شروع سے آخر تک واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کر دیا ہے (اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہ چیز کس قدر عین مطابق فطرت اور بصیرت ہے) کہ ہر شخص کے عمل کا نتیجہ اسی کی ذات کو متاثر کرتا ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)

اچھا نتیجہ بھی اسی کے اپنے کام کا ہوگا۔ اور برا نتیجہ بھی اس کے اپنے کام کا (افراد میں بھی اور اقوام میں بھی۔ دیکھئے ۲/۱۳۴ - ۲/۱۴۱)

یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے غلط اعمال کے نتائج کو دوسرے شخص کے صحیح اعمال کے نتائج کو باطل کردیں۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵) نیز (۱۷/۱۵)

ہر شخص اپنے عمل سے جو کچھ کماتا ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے اوپر مرتب ہوتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

نہ کسی کے نیک عمل کا نتیجہ دوسرے کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ نہ برے کام کا۔ اس لئے کہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا (۴۱/۴۶) نیز (۴۵/۱۵)

جو اعمال صالح کرتا ہے۔ وہ بھی اپنی ذات کے لئے۔ اور جو برے کام کرتا ہے۔ وہ بھی اپنے لئے۔

حتیٰ کہ نہ باپ کے اعمال کے نتائج بیٹے کی طرف منتقل ہو سکتے ہیں۔ نہ بیٹے کے باپ کی طرف۔ یہ ناممکن ہے کہ ورزش بیٹا کرے اور صحت باپ کی اچھی ہو جائے یا دوائی باپ پئے اور صحت یاب بیٹا ہو جائے۔

يَوْمًا لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ

Marfat.com

عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا (۳۱/۳۳) نیز (۳۵/۱۸)

ظہور نتائج کے وقت نہ باپ اپنے بیٹے کے کام آسکتا ہے۔ اور نہ بیٹا باپ کے۔

اس لئے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) "انسان کے لئے اس کی اپنی کوشش کے نتائج ہی ہیں۔" یہاں فطرت کا اٹل قانون ہے۔ کسی کا یہ کہنا کہ میرے نیک اعمال کے نتائج کے بدلے میں فلاں کے برے اعمال کے نتائج محو ہو جائیں۔ فدیہ یا کفارہ کا عقیدہ ہے جس کی فطرت کے قانون مکافات میں کہیں گنجائش نہیں فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْکُمْ فِدْیَۃٌ (۵۷/۱۵) ظہور نتائج کے وقت تم سے فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ یہ فطرت کے قاعدے کے خلاف ہے۔ میری پیاس تمہارے پانی پینے سے نہیں بجھے گی۔ خواہ ہم دونوں کتنا ہی کیوں نہ چاہیں کہ ایسا ہو جائے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔ کہ "ایصال ثواب" کا عقیدہ کس طرح "مکافات عمل" کے اس عقیدہ کے خلاف ہے جو اسلام کا بنیادی قانون ہے، خدا جانے اس قوم نے کہاں کہاں سے ان عقائد کو پھر سے لے لیا۔ جنھیں مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اور اس صورت میں جبکہ خود قرآن اپنی اصل شکل میں ان کے پاس موجود ہے۔ اس سے بڑا تغیر بھی آسمان کی آنکھ نے کم ہی دیکھا ہوگا۔

Marfat.com

باقی رہا قرآن پڑھ پڑھ کر مردوں کو بخشنا۔ سو اگر قرآن پڑھنے سے کوئی ۔۔ ثواب حاصل ہوتا ہے۔ تو اس ثواب کا کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو جانے کا سوال تو اوپر حل ہو چکا ہے۔ لیکن ۔۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا قرآن کے الفاظ دہراتے رہنے سے ثواب بھی ہوتا ہے؟

ثواب کے معنی آپ نے اوپر دیکھ لئے ہیں۔ یعنی کسی کام کا نتیجہ۔ اب سوال یہ رہا کہ کیا محض قرآن کے الفاظ دہراتے رہنے سے کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا ہے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن ہے کیا؟ یہ مجموعہ ہے ان اصولات (یا قوانین) کا کہ فلاں قسم کے کام سے فلاں قسم کا نتیجہ مرتب ہوگا۔ اور فلاں قسم کے کام سے فلاں قسم کا۔ اگر کسی کتاب میں یہ لکھا ہو کہ "پانی پینے سے پیاس بجھ جاتی ہے۔" آپ کو پیاس لگ رہی ہو۔ اگر آپ ان الفاظ کو سو دفعہ بھی دہرا لیں تو آپ کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ یعنی ان الفاظ کے دہرانے سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ نتیجہ مرتب ہوگا ان الفاظ پر عمل کرنے سے (یعنی پانی پینے سے)۔۔۔ اسی سے آپ سوچئے کہ تلاوت قرآن کریم سے مفہوم کیا ہے۔ یعنی اس کتاب کو پڑھا جائے تاکہ اسے سمجھ لیا جائے اور سمجھا جائے تاکہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر ان میں سے ایک کڑی بھی کم ہے۔ تو آپ کے لئے اس کتاب کا عدم اور وجود برابر ہے۔ کتاب کے الفاظ دہرا لینے سے یہ سمجھ لینا کہ آپ کا مقصود حاصل ہو گیا اپنے آپ کو فریب میں رکھنا ہے۔ یہ فریب نفس چند الفاظ سے حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی ثواب۔ برکت۔ نیکی۔ "قرآن پڑھنے سے ثواب ہوتا

ہے۔" "اس سے برکت حاصل ہوتی ہے۔" "اس کے ایک ایک حرف سے دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔" (ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و آباءکم) (چند الفاظ جنھیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے وضع کر رکھا ہے) کسی سے کہئے کہ صاحب آپ ثواب، برکت، نیکی کے الفاظ کی جگہ عام الفاظ میں سمجھا دیجئے کہ قرآن کے الفاظ دہرانے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہ کچھ سمجھا نہیں سکے گا۔ وہ یہی کہے گا کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔

انسانیت کے عہد طفولیت کا زمانہ علم المذاہب کی اصطلاح میں عصر سحر Magic Age کہلاتا ہے۔ سحر Magic کی بنیاد اس نظریہ پر تھی کہ الفاظ میں (ان کے مفہوم میں نہیں بلکہ خود الفاظ میں) ایسا اثر ہے۔ کہ ان کے دہرانے سے ایک نتیجہ مرتب ہو جاتا ہے۔ ہندوؤں کے وید قریب قریب اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان کے اکثر منتروں کو اسی طرح پڑھا جاتا تھا۔ (آج بھی منتر کے معنی جادو ہیں) آپ کسی منتری سے منتر سنئے۔ منتر کے الفاظ کا مفہوم کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ منتر کے لئے بامعنی ہونا ضروری نہیں (اور اگر ان الفاظ کا کچھ مطلب ہوگا بھی تو … منتر پڑھنے والے کو اس کے مطلب سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ وہ الفاظ کی تاثیر کے لئے انھیں دہرا رہا ہوگا۔) اس کے متعلق عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ میں تاثیر ہے۔ ہم اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے۔ کہ جادو میں اثر کس طرح ہوتا ہے

(۱) اس کے لئے محترم پرویز صاحب کی کتاب معارف القرآن (جلد سوم)

اس وقت بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ سحر میں الفاظ کے متعلق یہ نظریہ ہوتا ہے کہ اثر الفاظ میں ہے۔ مفہوم میں نہیں۔ قرآن نے اپنے متعلق کھلے الفاظ میں وضاحت کردی ہے۔ کہ وہ سحر نہیں ہے۔ یہ عربی مبین (واضح عربی زبان) کی ایک کتاب ہے جس کا پڑھنا، پڑھانا، سمجھنا، سمجھانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کا منشاء انسانی زندگی کو صحیح راستہ پر لگانا ہے۔ وہ قرآن میں غور و فکر (تدبر و تفکر) نہ کرنے والوں کو جہنم کا ایندھن اور بدترین مخلوق (شر الدواب) قرار دیتا ہے۔ اب سوچئے، کہ کسی کتاب میں تدبر و تفکر کبھی ممکن ہے جب تک کہ اس کے معنے نہ سمجھے جائیں؟ اس لئے قرآن کے الفاظ کو بلا سمجھے دہراتے رہنا۔ اور سمجھ لینا کہ اس سے کچھ (ثواب، برکت) حاصل ہوتا ہے اس کتاب سے منتر بنا دینا ہے۔ اس کتاب کا اس سے زیادہ غلط استعمال اور کیا ہو سکتا ہے؟ غلط استعمال ہی نہیں بلکہ استہزاء، اور قرآن اور خدا سے کیا استہزاء ہوگا۔ یہ استہزاء ہے خود اپنی ذات سے جس کے عذاب میں یہ قوم صدیوں سے گرفتار چلی آرہی ہے۔ وماھم بخارجین من النار!

(س) تلاوتِ قرآن پاک

ایک اور صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو قرآن کریم کے الفاظ پڑھتے ہیں۔ لیکن ان کے معنی بالکل نہیں سمجھتے۔ کیا اس سے کچھ فائدہ بھی ہے؟

جواب۔

طلوع اسلام میں اس سے پیشتر اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے۔ لیکن سوال کی اہمیت کے پیش نظر اس کی تکرار بھی فائدے سے خالی نہیں ہوگی۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا میں کوئی اور کتاب بھی ایسی ہے۔ جسے آپ بلا سمجھے پڑھتے ہیں۔ کسی ایسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب تو ایک طرف رہی۔ جسے آپ جانتے ہی نہ ہوں۔ اگر کتاب کی زبان .. آپ جانتے ہوں۔ اور وہ کتاب آپ کی استعداد سے زیادہ مشکل ہو تو بھی آپ اسے نہیں پڑھیں گے کہ جب کچھ پلے ہی نہیں پڑتا تو پھر اسے پڑھا کس لئے جائے۔

جب یہ کیفیت ہے۔ تو پھر قرآن کو کیوں اس سے مستثنیٰ رکھا جاتا ہے؟ کتاب پڑھنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کتاب کے مضامین Contents کو سمجھ سکیں۔ اگر آپ اس کے مافیہ کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کا پڑھنا آپ کو کیا فائدہ دے گا۔ یہ ایک عام سمجھ کی بات ہے۔ پھر معلوم نہیں "مذہب کے معاملہ میں سمجھ کو کیوں الگ .. ... رکھ دیا جاتا ہے۔ قرآن ایک کتاب ہے۔ اور اس میں یہ لکھا ہے کہ ہمیں دنیا میں زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کتاب کو پڑھا اس لئے جائے گا کہ سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جائے گا کہ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ کہیئے اس کے الفاظ کو دہرا لینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا! قرآن اپنے آپ کو "کتاب مبین" (ایک واضح کتاب) کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ میری زبان "عربی مبین" (صاف اور سلیس عربی زبان) ہے۔ وہ اپنے آپ کو "ہدایت

راہ نمائی اور نور (روشنی) بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے بین اصول منضبط ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ اس میں ارتقاء شرف انسانیت کے قوانین و آئین مندرج ہیں۔ وہ اپنے مضامین پر بار بار دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ وہ ہر صاحب فکر و نظر کو اس میں تدبیر و تفکر کے لئے تاکید کرتا ہے۔ وہ اس میں تدبر نہ کرنے والوں کو سطح انسانیت سے گرا ہوا قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عقل کی آنکھ کے لئے سورج کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کا یہ مقصود بلا سوچ سمجھے پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے! ہم کہتے ہیں کہ قرآن پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہے کہ اسے بلا سمجھے پڑھا جائے۔ آپ کسی مصنف سے یہ کہئے کہ میں تمہاری کتاب کے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے باوجود ہر روز اسے پڑھتا ہوں۔ حتیٰ کہ مجھے وہ زبان بھی نہیں آتی۔ جس میں تم نے کتاب لکھی ہے۔ اس کے باوجود اس کے الفاظ کو دہراتا رہتا ہوں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ وہ مصنف آپ کو کیا جواب دے گا۔؟ حقیقت یہ ہے کہ امت کو قرآن سے دور لے جانے کا سب سے موثر حربہ یہ تھا کہ اس کے دل میں اس خیال کو راسخ کر دیا جائے۔ کہ قرآن کو بلا سمجھے پڑھنے سے بھی ثواب حاصل ہوتا ہے۔ یہ ان سازشوں میں سے بڑی سازش تھی۔ جو دنیا میں اس عظیم المرتبت قوم کو اس کے مقام سے گرانے کے لئے سوچی گئیں (ہم جانتے ہیں کہ وہ مسلمان جن کی زبان عربی ہے یا جو عربی جانتے ہیں) وہ بھی دوسروں کے ساتھ ہی ذلیل ہیں۔ لیکن اس کے لئے اور وجوہات ہیں۔ جیسا کہ ہم

Marfat.com

پہلے لکھ چکے ہیں۔ یہ عقیدہ کہ بلا سمجھے قرآن کے الفاظ دہرانے سے "ثواب" ہوتا ہے کیسر غیر قرآنی عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ درحقیقت "عہد سحر کی یادگار ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ الفاظ اپنے اندر تاثیر رکھتے ہیں (معانی نہیں بلکہ تاثیر) یہ قرآنی اعمال۔ تعویذ۔ نقوش۔ وظائف اوراد سب اسی عقیدہ کی مستعار شکلیں ہیں۔ قوم ہزار برس سے ان توہمات میں الجھی چلی آ رہی ہے۔ اور ان سے نجات کی اب بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے کہ قوم کو جہالت کی ان وادیوں میں گھیرے رکھنے سے ایک طبقہ کی روٹی وابستہ ہے۔ اس لئے وہ اسے ظلمات سے نور کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ جب کوئی اللہ کا بندہ اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ تو بھوک کا تصور اس طبقہ کو ہر قسم کی مخالفت کیلئے کمربستہ کر دیتا ہے۔ اور وہ اس آواز کو "مذہب اور سلف صالحین کے طریقہ" کے خلاف قرار دے کر عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیتا ہے۔ یہی ہے مترفین اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنیوالوں کا وہ گروہ جو ہمیشہ حق کی آواز کے خلاف محاذ قائم کرتا رہا ہے۔ اور آج یہی کچھ کر رہا ہے اسلئے کہ انہیں معلوم ہے کہ قرآن (حضرت) موسیٰ کا وہ اژدہا ہے۔ جو ان ساحرین کی نگاہ فریب رسیوں کو صاف نگل جائے گا۔ اسی لئے۔۔ وہ قرآن کریم کو قوم کے سامنے کبھی بے نقاب نہیں ہونے دیں گے۔ اور اسی کے لئے وہ ان پڑھوں کو قرآنی الفاظ کے دہرانے کے "ثواب" اور لکھے پڑھوں کو اسرائیلی روایات پر مشتمل تفاسیر کے حقائق کے فریب میں مبتلا

Marfat.com

رکھیں گے۔ تاکہ ؎

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

Marfat.com

ترکہ اور وصیت

ایک صاحب رقمطراز ہیں۔

آپ نے کئی مرتبہ لکھا ہے کہ قرآن کریم کے احکام ... ہمارے وقتی مصالح اور مقتضیات کی رعایت رکھتے ہوئے ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اپنے حالات کے مطابق فیصلے کر لیں۔ لیکن اس باب میں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ قرآن کریم انسان کو اس کی ملکیت کی چیزوں پر تصرف کا حق دیتا ہے لیکن ان کی تقسیم کے لئے اس کے مقتضیات کی کوئی رعایت نہیں رکھتا بلکہ تقسیم وراثت کے ایسے حصے مقرر کرتا ہے جن میں تغیر و تبدل کا اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا مثال کے طور پر لیجئے۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو لکھایا پڑھایا۔ ولایت تک پاس کرایا۔ اب وہ نہایت معقول ملازمت میں ہے۔ ہزاروں روپے کی آمدنی رکھتا ہے۔ خود صاحب جائداد بھی ہے۔ اس شخص کا دوسرا لڑکا ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا کہ اس کی موت کا وقت قریب آجاتا ہے۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ اس ننھے یتیم کی کفالت کے لئے ترکہ الگ کر دیا جائے۔ لیکن اسے اس پر کچھ اختیار

نہیں۔ قرآن کی رو سے بڑا بیٹا برابر کا حصے جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے پنجاب کی زراعت پیشہ اقوام نے زمین میں سے لڑکیوں کو حصہ دینا بند کر دیا تھا۔ ایک شخص کی تھوڑی سی اراضی ہے۔ اس کی لڑکی پچاس میل کے فاصلہ پر کسی گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس شخص کے ورثہ میں سے اس لڑکی کا حصہ نکالیے تو چپہ بھر زمین نہ لڑکی کے کسی کام کی نہ اس کے بیٹے کے۔ اسی طرح کی اور مثالیں ہیں۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ ان امور میں ذاتی مصالح اور مقتضیات کا لحاظ کیسے رکھا جائے گا۔

جواب۔

آپ نے جن دقتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ وراثت کے اس قانون کی پیدا کردہ ہیں جو ہمارے ہاں صدیوں سے مروج چلا آرہا ہے۔ لیکن جو بدقسمتی سے یکسر قرآن کے خلاف ہے۔ یہ مشکلات اس بنا پر پیش آتی ہیں کہ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے (اور یہی ہمارے ہاں کا مروجہ قانون وراثت ہے) کہ کسی شخص کو اپنے مال اور جائداد میں وصیت کا حق نہیں۔ قرآن نے جو حصے مقرر کر رکھے ہیں اس کا ترکہ بالکل انہی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔ یہ غلط ہے اور قرآن کی تعلیم کے صریحاً خلاف۔ قرآن نہ صرف وصیت کی ہی اجازت ہی دیتا ہے بلکہ اسے فرض قرار دیتا ہے سورہ بقرہ میں ہے

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ

حقًا علی المتقین (۲/۱۸۰)

مسلمانو! یہ بات تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی محسوس کرے کہ اس کے مرنے کی گھڑی آگئی ہے۔ اور وہ اپنے مال و متاع میں سے کچھ چھوڑ جانے والا ہے۔ تو وہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے وصیت کر جائے۔ جو متقی انسان ہیں ان کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

اس آیۂ مبارکہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس سے زیادہ واضح اور صریح حکم اور بھی کوئی ہو سکتا تھا؟ آیت کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ تم پر وصیت فرض قرار دی گئی ہے۔ اور انتہا اس پر یہ کہ وصیت متقیوں کے لئے نہایت ضروری ہے۔ پھر سورۂ مائدہ آیات (۵/۱۰۶-۱۰۷) میں یہ تاکید آئی ہے کہ اس وصیت کے لئے گواہ بھی مقرر کئے جائیں۔ اور ان گواہوں کی شہادت مشکوک نظر آئے تو پھر کیا کیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان کو اس کے ترکہ کی تقسیم کے لئے وصیت کی اجازت (بلکہ تاکید) ہے۔ تو پھر قرآن کریم نے تقسیم وراثت کے حصے کس لئے متعین کئے ہیں۔ اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں ہے۔ اور ان آیات کے اندر جن میں وراثت کے حصے متعین کئے گئے ہیں۔ احکام وراثت سورۂ نساء کے شروع میں آتے ہیں۔ آیات ۴/۱۱ تا آیت ۴/۱۲ کو دیکھئے۔ پہلے اولاد، والدین اور بہن بھائیوں کے حصوں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا ہے مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ

Marfat.com

يُوصِىْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ (۲) یہ حصے اس وصیت کے بعد تقسیم ہوں گے۔ جو میت نے کی ہو یا جو کچھ اس نے قرض چھوڑا ہو اس کی ادائیگی کے بعد۔ اس کے بعد پھر اور رشتہ داروں کے حصوں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد پھر ارشاد ہے کہ یہ تقسیم، وصیت کی تعمیل اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔ پھر تیسری مرتبہ بھی یہی ارشاد فرمایا ہے اس کے بعد باقیماندہ حصوں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد پھر چوتھی مرتبہ وہی ارشاد ہے کہ یہ تقسیم میت کی وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی اور اس کے بعد فرمایا کہ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ (۲) یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ ان الفاظ پر احکام وراثت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچ لیجئے کہ بات کس قدر واضح ہے۔ یعنی ہر مسلمان پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ اسے اپنی جائداد اموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح و مقتضیات کے مطابق جسے جی چاہے۔ اور جتنا جی چاہے دیدے۔ لیکن اگر اتفاق ایسا ہو جائے کہ کسی وجہ سے انسان وصیت نہ کر سکا ہو۔ یا اس کا ترکہ وصیت سے بڑھ جائے۔ تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ورثے کی تقسیم اس کے وارثوں پر نہیں چھوڑی بلکہ اس کے حصے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ ہیں وہ حصے جو غیر متبدل ہیں۔

لیکن تقسیم جائداد کے اس اختیار کو بھی بدلگام نہیں چھوڑا گیا کہ انسان مستحقین کو محروم کر دے اور اپنی جائداد کی تقسیم میں ناانصافی سے کام لے۔ اس لئے اس

وصیت اور قرضہ کا ذکر فرمایا۔ وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ غَیْرَ مُضَآرٍّ (۴/۱۲) بشرطیکہ وصیت اور قرضہ سے مقصود (حقداروں کو) نقصان پہونچانا نہ ہو۔ اگر کسی نے ایسا کیا ہے اور اس کا علم اس کی زندگی میں ہو گیا ہے۔ تو جماعت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ اصلاح حال کی صورت پیدا کرے

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ (۲/۱۸۲)

اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے سے بے جا رعایت کرنے یا کسی معصیت (بے انصافی) کا اندیشہ ہو تو (اسے چاہیئے کہ) وہ بر وقت مداخلت کرکے اور وارثوں کو (سمجھا بجھا کر) ان میں مصالحت کرا دے۔

اور اگر یہ صورت اس کی موت کے بعد واقع ہو۔ تو اس کی وصیت میں ضروری ردوبدل کر دیا جائے۔ لیکن یہ اختیار صرف اسلامی عدالت کو حاصل ہو گا۔ افراد کو نہیں یہ ہیں۔ وصیت اور ترکہ کی تقسیم کے بارے میں قرآن کے احکام۔ غور کیجئے کہ کس قدر واضح اور غیر مبہم ہیں یہ احکام۔ لیکن اس کے باوجود مقام صد حیرت ہے کہ مسلمانوں کا "مسلمہ" قانون وراثت کس قدر قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ قانون وراثت ہم میں صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس پر سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جائے اور کیا کرے اس قانون میں یا تو سرے سے وصیت کی اجازت ہی نہیں۔ اور اگر اجازت ہے تو صرف تہائی مال میں۔ اور وہ بھی وارثین کے لئے نہیں۔ او یا للعجب! کہ اس قانون کو

Marfat.com

منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ گرامی کی طرف جس کی حیات طیبہ کا ایک ایک سانس قرآن کی اتباع میں گزرا۔ اور یہ صرف اس لئے کہ بدقسمتی سے ہمارے مجموعہ روایات میں کسی طرح سے دو چار روایتیں اس قسم کی شامل ہو گئیں۔ اب رواۃ پرستی کا تقاضہ تھا کہ ان روایات کو صحیح سمجھا جائے خواہ اس سے قرآن کریم کے صریح احکام کی مخالفت ہی کیوں نہ ہوتی ہو اور خواہ اس سے حضور صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کی ذات اقدس پر بھی طعن کیوں نہ آئے۔ آپ اس کا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم وصیت کو فرض قرار دے۔ اور بلا مشروط۔ یعنی پورے مال میں وصیت کا حق دے۔ (اور اس کی تاکید کرے) اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرمائیں کہ نہیں! وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی غیر وارثین کے لئے۔ خدا کے حکم میں ایسا رد و بدل یقیناً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان اقدس کے سخت خلاف ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہمارے یہاں یہ قانون موجود ہے۔ اور صدیوں سے اس پر امت کا عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

امید ہے کہ آپ کے وہ شکوک اب رفع ہو گئے ہیں۔ جن کا ذکر آپ نے اپنے خط میں فرمایا ہے۔ لیکن ایک بات قابل گذارش اور ہے۔ اور وہ زمین کے ترکہ کے ضمن میں ہے۔ جس کا ذکر آپ نے اپنے خط کے آخری حصہ میں فرمایا ہے، قرآن کی رو سے زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ اس لئے زمین کی تقسیم

Marfat.com

وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین رزق کا سرچشمہ ہے۔ اس کی تقسیم، ہر ضرورت مند کی ضرورت کے مطابق اسلامی حکومت کرے گی۔ لہٰذا اس کی خرید و فروخت اجارہ داری، زمینداری یا تقسیم بطور ترکہ خارج از بحث ہے (لیکن یہ سوال الگ ہے اور جداگانہ تفصیل کا محتاج ہے)

آخر میں اتنی وضاحت اور بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مصالح اور مقتضیات کے مطابق جزئیات متعین کرنے کے لئے صرف انہی امور میں مجاز ہیں جن کی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ جن جزئیات کو قرآن نے خود متعین کر دیا ہے ان میں کسی کو ردوبدل کا حق نہیں۔ اور قرآن کریم نے اگر ان کے ساتھ خود ہی بعض شرائط بھی لگا دی ہیں تو ان شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے (تقسیم وراثت کے احکام مشروط ہیں وصیت کے ساتھ)

(س) یتیم پوتے کا حصہ

کچھ عرصہ سے ہمارے پاس قرآن کریم کے قانون وراثت سے متعلق بہت سے استفسارات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں سوال یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ہمارا مروجہ فقہی قانون جس کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے کیسا ہے؟ (ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے اس موضوع پر الگ پمفلٹ شائع کیا گیا ہے۔ [illegible])

Marfat.com

جواب۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانون وراثت جس حسن وخوبی اور جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی نگاہ اس قانون پر پڑتی ہے۔ جو ہمارے فقہا نے مرتب کیا ہے۔ اور جو ہزار سال سے مسلمانوں میں مروج چلا آرہا ہے۔ تو درطہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا قانون ہے۔ اس مروجہ قانون میں نہ صرف یہ کہ باہمگر متضاد شقیں موجود ہیں۔ بلکہ اس میں قرآنی اصول کی صریح مخالفت بھی ہے۔ جنہیں قرآن وارث قرار دیتا ہے یہ قانون انھیں وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن ان کے لئے کچھ حصہ مقرر کرتا ہے۔ یہ قانون اس کے خلاف کچھ اور ہی دیتا ہے۔ کہیں ایک ہی درجہ کے دو رشتہ داروں میں ایک وارث قرار پاجاتا ہے۔ دوسرا محروم رہ جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی افسوسناک صورت یہ کہ اس قانون کی رو سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ (معاذاللہ) خدا چوتھی جماعت کے بچوں جتنا بھی حساب نہیں جانتا۔ اس اصول کو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ جب کسی چیز کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ تو تمام حصوں کی حاصل جمع ایک (۱) آنی چاہیئے۔ اگر حاصل جمع ایک نہیں آتی تو ریاضی کے ابتدائی قاعدے کی رو سے یہ تقسیم غلط ہے۔ مثلاً ($\frac{1}{2}+\frac{1}{4}+\frac{1}{4}=1$) یہ تقسیم درست ہے۔ لیکن ($\frac{1}{2}$

Marfat.com

$\frac{1}{2}+\frac{1}{2}=\frac{3}{2}$) یہ تقسیم غلط ہے۔ کیونکہ ان حصوں کا مجموعہ (۱) نہیں بلکہ
($1\frac{1}{2}$) ہے۔

یہ ہے بہرحال وہ قانون وراثت جسے ہم بڑے فخر سے دنیا کے سامنے
پیش کرتے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ اس سے ہم ایک طرف اللہ تعالیٰ کے
متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف کس طرح علمی دنیا میں اپنے
آپ کو اضحوکہ بناتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو اس سے کیا غرض کہ ان کے کسی عمل سے
خدا کے متعلق کیا تصور پیش ہوتا ہے اور دنیائے علم وبصیرت میں ان کی پوزیشن
کیا رہ جاتی ہے۔ انھیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے بس اسی
طرح ہوتا چلا جائے۔ اور جو شخص اس کے خلاف ذرا سی آواز بلند کرکے انہیں کہے کہ آؤ ہم
اس روش کو اللہ کی کتاب کے مطابق کرلیں۔ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑجائیں۔

اس مختصر سی تمہید سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ ہمارا مروجہ قانون
وراثت پورے کا پورا ایسا ہی کہ قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے اور
اس کی جگہ اس قانون کو رائج کیا جائے۔ جو خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔
اس وقت ہم اس قانون کے اس ایک گوشہ کو سامنے لائیں گے۔ جس کے متعلق
نمایاں طور پر استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ یعنی یتیم پوتے کی وراثت کا سوال
قانونِ وراثت چونکہ ایک فنی Technical مسئلہ
ہے۔ اس لئے اسے سمجھنے کے لئے ذرا دقت نظر کی ضرورت ہوگی۔ ہم کوشش

Marfat.com

کریں گے کہ اس کی فنی اصطلاحات سے بچ کر اسے عام فہم اور سلیس انداز میں پیش کریں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ اسے یونہی رواں نہ پڑھتے جائیں بلکہ ایک ایک ٹکڑے کو سمجھ کر آگے بڑھیں وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اصل مسئلہ ہے کیا۔ یہ اس طرح سمجھ میں آئیگا

زید

بکر (زید کی زندگی میں فوت ہوگیا) — عمر (زید کی وفات کیوقت زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

خالد اور حامد دونوں زید کے حقیقی پوتے ہیں۔ خالد یتیم ہے۔ اس کا باپ (بکر) زید کی زندگی میں فوت ہو چکا ہے تا
زندہ ہے اور حامد کا باپ بھی زندہ ہے۔ زید کی وفات پر اس کی جائیداد کی تقسیم کا سوال پیش آتا ہے۔ ہمارا فقہی قانون وراثت کہتا ہے کہ اس جائداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی (اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو) اگر محض عقل عامہ کی رو سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دے گا۔ خالد یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ لیکن یہی اس کا جرم قرار دیدیا جاتا ہے اور اس طرح اسے اپنے دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ برابر کا حصہ لیتا۔ وہ مر چکا ہے۔ اس لئے اب خالد کو کچھ

نہیں مل سکتا۔ اس کا چچا جائیداد کا وارث ہوگا۔

اب آیئے اس طرف کہ ہمارے فقہا اس کے لئے دلائل کیا پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں دو دلیلیں اہم ہیں۔

(۱) وہ کہتے ہیں کہ جو شخص مرنے والے کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے۔ وہ شخص اسکی موجودگی میں ترکہ نہیں پا سکتا۔

یعنی خالد کا رشتہ اپنے دادا زید کے ساتھ اپنے والد بکر کے واسطے سے ہے براہ راست نہیں، ٹھیک ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ بکر تو مر چکا ہے۔ اس لئے اب خالد اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام ہے۔ اور اس کے دادا (زید) کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا چچا (عمر) درمیان میں واسطہ نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ خالد کا اپنے دادا سے رشتہ اپنے چچا عمر کے واسطے سے نہیں ہے۔ اپنے باپ کے واسطہ سے تھا۔ اور یہ واسطہ اب درمیان سے نکل چکا ہے۔

اب اس مقام پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے فقہا خود اپنے وضع کردہ اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ وہ خالد کو اپنے دادا (زید) کی وراثت سے تو محروم کرتے ہیں۔ لیکن اگر زید کی زندگی میں خالد مر جائے۔ تو اس کی جائیداد زید کو دیتے ہیں یعنی دادا تو یتیم پوتے کا براہ راست رشتہ دار ہوتا ہے۔ لیکن وہی پوتا اپنے دادا کا براہ راست رشتہ دار نہیں ہوتا۔

Marfat.com

اب ان کا دوسرا اصول لیجئے۔ دراصل یہ دوسرا اصول ہی وہ محکم اصول قرار دیا جاتا ہے جس کی رو سے یتیم پوتا وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہ اصول ہے

الاقرب فالاقرب۔ یعنی قریب کے رشتہ دار کے ہوتے ہوئے

بعید کا رشتہ دار محروم رہتا ہے۔

(دادا اور پوتے والی مثال میں) چونکہ عمر (زید کا بیٹا ہونے کی جہت سے) زید کا قریب کا رشتہ دار ہے۔ اس لئے خالد (جو پوتا ہونے کی جہت سے زید کا بعید کا رشتہ دار ہے) عمر کی موجودگی میں محروم رہ جائے گا۔

زید

بکر (قریب کا رشتہ دار) — عمر (قریب کا رشتہ دار)

خالد (عمر کی موجودگی میں زید کا بعید کا رشتہ دار)

اول تو یہ سن لیجئے کہ ہمارے فقہا خود اپنے اس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ اصول یہ ہے کہ

قریب کے رشتہ دار کی موجودگی میں بعید کا رشتہ دار محروم رہ جاتا ہے۔

مثلاً رشید کا انتقال ہو گیا۔ اس کا دادا بھی موجود ہے اور بیٹا بھی۔ ظاہر ہے کہ بیٹا قریب کا رشتہ دار ہے۔ اور دادا بعید کا۔ لہٰذا اس کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے دادا کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے فقہا دادا کو حصہ دیتے ہیں۔ اور اس طرح خود اپنا قائم کردہ اصول بھی قائم نہیں رہنے دیتے۔

Marfat.com

اب آیئے اس اصول کی طرف۔ اس اصول کو اس آیت سے مستنبط کیا جاتا ہے

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ

وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ۔ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا (۴/۷)

مردوں کو حصہ ملے گا۔ ان میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے۔ اور

عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے۔ خواہ

ترکہ تھوڑا ہو یا بہت ایک معین حصہ (جو بعد میں بیان کیا گیا ہے۔)

یہ آیت میراث کے قانون کی تمہید ہے۔ اس وقت اس عظیم اصول کی تشریح میں نہیں جانا چاہیئے جو اس قانون میں بیان کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں کہ جب والدین خود اقربا میں شامل ہیں تو ان کا الگ ذکر کیوں کیا گیا۔ یہ نکات اپنے مقام پر سامنے آئیں گے۔ اس وقت صرف نقطۂ زیرِ نظر مرکوز رہنا چاہیئے۔ آیت میں اقربون آیا ہے جس سے یہ مطلب ہے کہ چونکہ رشتہ دار قرابت کے لحاظ سے بہت قریب اور بعید ہوتے ہیں۔ مثلاً والدین۔ اولاد۔ اولاد کی اولاد۔ بھائی بہن۔ چچا۔ پھوپھی وغیرہ۔ اور یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب خواہ قریب ہوں یا بعید، ایک ساتھ وارث ہوں، اس لئے کہ وراثت کا مدار قربیت پر ہے۔ یعنی میت کے ترکہ میں سے اسی کو حصہ ملیگا جس کا وہ (مرحوم) اقرب ہوگا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اقربا جو چھوڑ کر مریں اس میں سے ان مردوں اور عورتوں کو حصہ ملیگا۔ یہ نہیں کہا کہ میت کے اقربین کو حصہ ملیگا۔ یہ فرق

Marfat.com

بڑا نازک ہے۔ اور اس کو نظر انداز کر دینے سے تدوین فقہ کے وقت یہ اصول بنایا گیا کہ میت کا قریبی رشتہ دار اپنے سے دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے، اور اس اصول کی بنا پر یتیم پوتے کو مرنے والے کے بیٹے کی موجودگی میں وراثت سے محروم کر دیا۔

یہ فرق چونکہ بڑا نازک ہے اس لئے اسے اور وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے اقرب جو چھوڑ کر مریں اس کی تقسیم یوں ہوگی یعنی دیکھنا یہ ہوگا کہ مرنے والا اپنے زندہ رشتہ داروں میں سے کس کس کا اقرب تھا، اقرب کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اور میت میں کوئی درمیانی واسطہ موجود نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ زندہ رشتہ داروں میں سے جو میت کا سب سے قریبی ہو اُسے حصہ ملے گا جو اس سے دور کا رشتہ دار ہو اسے حصہ نہیں ملے گا۔ ہر اقرب کو حصہ ملیگا۔ یعنی ہر اس رشتہ دار کو جس کے اور میت کے درمیان کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ مثلاً

سعید ——— کریم کا دادا زندہ ہے
رحیم ——— کریم کا والد فوت ہو چکا ہے
کریم ——— اس کی وفات ہوئی ہے
رشید ——— کریم کا بیٹا زندہ ہے۔

کریم کا قریب ترین رشتہ دار رشید ہے (بیٹا جو بلا واسطہ رشتہ دار ہے) سعید (کریم کا دادا) کریم کا بالواسطہ رشتہ دار ہے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ قریب ترین کی

Marfat.com

موجودگی میں اس سے بعید رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے تو رشید کی موجودگی میں سعید کو محروم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ رحیم کی وفات کے بعد سعید اور رشید دونوں کریم کے اقرب ہو گئے۔ اوپر کی طرف کریم اور سعید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور نیچے کی طرف کریم اور رشید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ لہذا اقرب کے معنی ہوئے وہ رشتہ دار جس کے اور متوفی کے درمیان متوفی کی وفات کے وقت کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ جب یہ صورت ہے کہ تو پھر پہلی مثال کو سامنے لائیے۔

زید

بکر (وفات پاچکا ہے) — عمر (زندہ ہے)

خالد (زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

جس طرح اوپر کی مثال میں رحیم کی وفات سے سعید اور کریم اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہو گئے تھے۔ اسی طرح بکر کی وفات سے زید اور خالد اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہو گئے ہیں۔ اور براہ راست رشتہ دار (اقرب) وارث ہوتا ہے لہذا خالد کو زید کے ترکہ میں سے حصہ ملیگا۔ حامد کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس کے اور زید کے درمیان عمر موجود ہے۔ اگر عمر بھی فوت ہو چکا ہوتا۔ تو پھر خالد کی طرح حامد کو بھی حصہ مل جاتا۔

وراثت کے قانون میں ایک چیز کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے۔ اور وہ ہے قائم مقامی۔ باپ کی وفات سے اس کا بیٹا اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بکر کی وفات

Marfat.com

سے خالہ نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ وراثت کا سارا دارومدار قائم مقامی پہ ہے درمیانی واسطہ اٹھ جانے سے بعید کا رشتہ دار، درمیانی واسطہ کا قائمقام اور اس طرح سے میت سے اقرب ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کے حکم کے مطابق مرنے والا (مورث) جن کا لوگوں کا اقرب ہوگا وہ لوگ وراثت پائیں گے۔ فقہا نے اقرب کا استعمال ورثہ (زندہ رشتہ داروں) کے لئے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کردہ اصولوں کے بعد ہم کو صرف یہ متعین کرنا تھا کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی قاعدے بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت بھی غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متفرع کئے ان پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا۔ جس کی وجہ سے کہیں خود اپنے بنائے ہوئے قواعد کے خلاف چل نکلے۔ اور کہیں قرآن کے بھی خلاف۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے فقہا (رحمہم اللہ) نے دانستہ ایسا کیا ہر انسان سے تفقہ میں غلطی کا امکان ہے۔ اس لئے قصور ان کا بھی نہیں۔ اصل قصور ہے اس ذہنیت کا جس کی رو سے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہدیا ہے وہ منزل من اللہ کی طرح تنقید کی حد سے بالا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کسی پس آئند کا سوچنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کر کے چلتے جانا چاہیئے۔ یہی اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔ اسی ایک مسئلہ وراثت کو لیجئے۔ قرآن نے وصیت کا حکم دے کر انفرادی

مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا تھا۔ فقہ اور روایات نے وصیت کو ممنوع قرار دے کر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا جس سے عجیب عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں پھر قانون وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآنی قانون کو کچھ سے کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں جائز وارث اپنے آبا و اجداد کی جائیدادوں سے محروم ہو گئے۔ اگر اسلاف پرستی نہ ہوتی تو ایک کی اجتہادی غلطی کی گرفت دوسرا کر لیتا۔ اور اس طرح اس کے نقصانات آگے نہ بڑھتے۔ اس ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون اسلامی کا مدار قرآن پر ہونا چاہیئے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ آپ اندازہ فرمالیجئے کہ اگر ہم نے اس فیصلہ کے بعد کہ ہماری حکومت کا آئین اسلامی ہونا چاہیئے آئین و قانون سازی کا کام ان کے سپرد کر دیا جن کا عقیدہ ہے کہ فقہ اور روایات میں جو کچھ لکھا چلا آرہا ہے وہ وحی منزل کی طرح منزہ عن الخطاء ہے اور ہمیں اس پر تنقید کا کوئی حق نہیں۔ تو ان کا وضع کردہ آئین و قانون کس حد تک قرآنی ہو سکتا ہے؟ قرآنی آئین و شریعت صرف قرآن سے اخذ کیا جا سکتا ہے، جب ہم قرآن سے باہر جائیں گے۔ تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے۔

وَفِيهَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ

(س) اوقاف ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ اس غرض کے لئے وقف کر دیا تھا کہ اس کی آمدنی سے ایک خانقاہ

(مزار) کی دیکھ بھال کا انتظام کیا جائے۔ ہم اس وقف کے متولی ہیں۔ لیکن قبر پرستی کو شرک سمجھتے ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی کیا صورت ہو۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ وقف کی اصلی حیثیت کیا ہے۔؟

جواب،

وقف کی شرعی حیثیت اہل فقہ اور اہل حدیث دونوں کے ہاں مسلم چلی آرہی ہے۔ وقف سے مفہوم یہ ہے کہ الوقف لا یملك۔ ولا یباع ولا یوھب ولا یورث یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے نہ فروخت کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے، نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس قسم کے وقف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ قرآن کے منشار کے خلاف ہے، قرآن میں انتقال اموال کی جتنی شکلیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے کہیں بھی اس قسم کے وقف کا جواز نہیں نکلتا۔ مثلاً خرید و فروخت، بخشش، وصیت، وراثت قرض، خیرات وغیرہ میں سے کوئی ایسی شکل نہیں جس میں منتقل کردہ مال دوسرے کی ملکیت میں نہ چلا جائے، اور اس پر پہلے مالک کا بدستور قبضہ رہے۔ اور یہ قبضہ اس کی زندگی تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ابدالآباد تک مسلسل چلا جائے۔ کیونکہ قبضہ کے معنی یہ ہیں کہ مال کا تصرف مالک کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور وقف کی یہی خصوصیت ہے کہ اس میں قیامت تک مال موقوف واقف کی مرضی کے مطابق صرف ہوتا ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت وقف کا جذبہ محرکہ صاحب اموالِ وجائیداد کی وہ ہوسِ اقتدار ہے جس کی بنا پر وہ دوسروں سے اپنی مرضی کے مطابق کام کراتے ہیں۔ موت کا ہاتھ اس قوت واختیار کو ان سے چھیننا چاہتا ہے لیکن انھوں نے اس کی بقا کی یہ شکل پیدا کرلی ہے کہ وہ اپنی جائیداد کو وقف کرجائیں، اور اس طرح قیامت تک ان کی مرضی ومنشا رجاری وساری رہے یہاں یہ کہا جائے گا کہ وقف عام طور پر "نیک کاموں" کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے اوقاف تو قوم کا مستقل سرمایہ ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچئے کہ قوم کے کام تو وہی سرمایہ آسکتا ہے۔ جو قوم کی ضرورت کے وقت کام آئے۔ اور قوم کی ضرورتیں صبح وشام بدلتی رہتی ہیں۔ مستقبل کی ضروریات کا تعین مُردوں کے سپرد کردینا قوم کو ماضی کی زنجیروں کے ساتھ باندھ دینا ہے۔ جو مرچکا ہے اسے کیا علم کہ قوم کو آج کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ قوم کے سرمایہ (یعنی جائیداد موقوفہ) کو جامد Freeze کرکے رکھ دیتا ہے۔ غور کیجئے کہ اگر تمام صاحب جائیداد اپنی اپنی جائیداد کو مخصوص مقاصد کے لئے وقف کرتے جائیں۔ تو کچھ عرصہ کے بعد قوم ان مخصوص مقاصد کے علاوہ باقی امور کے لئے پائی پائی کی محتاج ہوجائے۔ "نیک کام" وہ ہے جو دنیا میں خدا کا قانون رائج کرنے والی جماعت کی تقویت کا موجب ہو۔ اس تقویت کے لئے اسباب وذرائع آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ بحالتِ امن اس تقویت کا راز کسی اور چیز میں ہوتا ہے۔ اور بحالت جنگ اس کے تقاضے کچھ اور ہوجاتے ہیں۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ اس لئے اگر

Marfat.com

ہر صاحب جائیداد، قومی سرمایہ کو ان مقاصد کے ساتھ وابستہ کرتا جائے. جنھیں وہ اپنی دانست اور اپنے زمانہ میں "نیک کام" سمجھتا تھا تو اس سے قوم محتاج سے محتاج تر ہوتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ جب ایک شخص اپنے مال میں وصیت کر سکتا ہے. تو وقف بھی تو وصیت ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وصیت میں موصی کے مرنے کے بعد جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو وہ اس مال کا مالک بن جاتا ہے۔ اور اسے اپنی منشار کے مطابق تصرف میں لا سکتا ہے۔ برعکس اس کے وقف میں متولی کو اس مال میں کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہیں ہوتا۔ اسے وصیت کرنے والے کی مرضی کے مطابق صرف کرتے رہنا ہوتا ہے۔

لہٰذا قرآن کی رو سے وقف کا کوئی جواز نہیں نکلتا۔ اگر کوئی شخص اپنے مال کو "نیک کاموں" میں صرف کرنا چاہتا ہے تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ وہ مال بروئے وصیت ثلث کے نظام اجتماعی کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں اسے استعمال میں لے آئیں۔ یعنی ضروریات کا تعین زندوں کے سپرد ہو نہ کہ مُردوں کے اختیار میں۔

لیکن جس قوم نے "خدائی اختیارات" کو بھی مُردوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہو؟ انسانی اختیارات کو ان کے ہاتھ سے چھیننے پر آمادہ کیوں ہونے لگی؟

Marfat.com

ماں باپ کی اطاعت

ایک نوجوان رقمطراز ہے۔

میرے ماں باپ نے میری شادی اپنی مرضی کے مطابق کی، اب وہ میری بیوی سے ناراض ہیں۔ اور مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اسے طلاق دیدوں یا اس سے ناروا سلوک کروں۔ حالانکہ میری بیوی سے میرے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ میں اس پر آمادہ نہیں ہوتا تو وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو ماں باپ کا فرمانبردار نہیں اس لئے تو خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جائے گا۔ برائے کرم مطلع فرمایئے کہ قرآن کی رو سے اس باب میں کیا حکم ہے۔

جواب۔

انسان کی حالت یہ ہے کہ خود ہی پتھر کے نیچے اپنا ہاتھ دے لیتا ہے اور پھر خود ہی چلاتا ہے۔ قرآن نے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ وہ کہتا ہے انھوں نے تمہاری اس وقت پرورش کی تھی جب تم دوسروں کے محتاج تھے، اب

کبرسنی کی وجہ سے تمہارے محتاج ہیں۔ اس لئے تم ان کی پرورش کرو۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن تم انھیں جھڑکو نہیں۔ بلکہ ان سے نرمی سے پیش آؤ۔ بس یہ ہے ماں باپ کے متعلق قرآن کا ارشاد۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن جو ہر نئی نسل کو آزاد پیدا کرتا ہے۔ اور انھیں اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے لئے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق آپ راہیں تلاش کرے۔ اور اپنے مقدرات کے ستارے خود تراشے۔ وہ ان ابھرنے اور بڑھنے والی نسلوں کو ان سے کے فیصلوں کا تبع قرار دے گا جن کا زمانہ بدل چکا ہے؟ قرآن جو انسانیت کو حریت فکر وعمل کا درس دینے کے لئے آیا ہے۔ انسان کو کبھی گزرے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا۔ اس نے خود کہا ہے کہ عمر کی زیادتی سے انسان کی عقل منکوس (اوندھی) ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کیا وہ حکم دے گا۔ کہ صحیح الدماغ نوجوان ان کے فیصلوں کے مطابق چلے۔ جن کی عقل اوندھی ہو چکی ہے؟ یقیناً یہ قرآن کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر قرآنی تعلیم کا اسی ایک مسئلہ میں باقی مذاہب اور مکاتب اخلاق سے مقابلہ کیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ قرآنی تعلیم کس قدر شرف انسانی کے مطابق اور ارتقائے آدمیت کے لئے مؤید ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب اور اخلاق کے تمام دبستانوں میں یہ چیز ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے"۔ ایسے مسلمہ کی حیثیت جو کسی غور وفکر یا تنقید و تبصرہ کا محتاج ہی نہیں۔ ان کے ہاں کبھی کسی نے اتنا خیال کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس

Marfat.com

میں دو رائیں ہو سکتی ہیں! لیکن قرآن کو دیکھئے کہ اس نے دنیا میں پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی ہے کہ جو لوگ عقل کے انحطاط کے دور میں پہونچ چکے ہوں، ان کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے۔ ماں باپ حسن سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں اور بس۔ جب تک بچہ بچہ ہے وہ اس کے نگران اور کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہونچ جاتا ہے تو اپنے لئے آپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربوں سے مشورۃً فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اسے اس کے فیصلوں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ وہ وحی کی حدود کے اندر نظام ملت کے متعین کردہ طرق و اسالیب کی ہم آہنگی میں اپنے لئے آپ فیصلے کرے گا۔

یہ تھی قرآن کی تعلیم۔ لیکن جب ملوکیت کے استبداد نے انسانی حریت و آزادی کا گلا گھونٹا ہے۔ تو ہر "زیردست" کو "بالادست" کے فیصلوں کا پابند قرار دیدیا گیا۔ سیاسی زندگی میں بادشاہ کے فیصلوں کا۔ "روحانی زندگی" میں احبار و رہبان (علما و مشائخ) کے فیصلوں کا اور معاشرتی زندگی میں بزرگوں کے فیصلے کا۔ اب اگر ایک طرف یہ تعلیم بطور اخلاقی اساس انسانوں کے رگ و پے میں پیوست کردی گئی کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں ‌‌ ‌ ‌ بباید گفت اینک ماہ و پرویں!

تو دوسری طرف ان کی گھٹی میں یہ افیون بھی ڈال دی گئی کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یہی وہ دور تھا کہ ماں باپ نے بھی اپنی "بزرگی" سے فائدہ اٹھایا۔ اور یہ

عقیدہ عام کردیا کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے!" یعنی جب تک ماں باپ زندہ ہیں۔ ان کا لڑکا خواہ خود ساٹھ ستر برس کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے اپنی صوابدید کے مطابق کرے۔ اسے ان کے فیصلوں کی تعمیل کرنی ہوگی۔ جن کی عقل کے متعلق اسکے خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اس عمر میں دندھی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کو فرض سمجھنے والے، ساری عمر عقلی طور پر اپاہج اور ذہنی طور پر بچے کے بچے رہ جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کہ ہماری موجودہ معاشرت (جس میں خاندانوں میں مشترکہ زندگی بسر ہوتی ہے) عائلی زندگی کا تقاضا ہے کہ افراد خاندان متفقہ فیصلوں کے ماتحت زندگی کی منازل طے کریں۔ اور خودسر اور سرکش نہ بن جائیں۔ لیکن خودسری اور سرکشی اور شے ہے اصابت رائے اور شےلہ

عمرانی زندگی کے فیصلے باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں۔ اور مشاورت میں کوئی کسی دوسرے کے فیصلے کا مطیع نہیں ہوا کرتا۔ ماں باپ کی اطاعت کو فرض مان لیا جائے۔ تو اس میں مشاورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ان کا فیصلہ غلط ہو یا صحیح، اس کی اطاعت فریضۂ خداوندی کی حیثیت سے واجب ہوگی، اور یہ یکسر قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔

لہ یاد رکھیئے خود فیصلے کرنے کے لئے عقل کی پختگی اور رائے کی اصابت لاینفک شرط ہے۔ اسلئے جب تک بچہ اس منزل تک نہ پہونچ جائے۔ اس وقت تک اسے لامحالہ بڑوں کے فیصلوں کے مطابق چلنا ہوگا۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن ہمیں کہاں لے جانا چاہتا ہے اور ہم اپنے وضع کردہ یا دوسروں سے مستعار، اصولات، اخلاق اور تصوراتِ نیکوکاری کے ماتحت کہاں جا چکے ہیں، اور کدھر چلے جا رہے ہیں، اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم تمام غیر قرآنی تصورات حیات سے کٹ کر ایک مرتبہ پھر خالص قرآنی نظریۂ زندگی سے اپنے آپ کو پیوست کر لیں۔

دگر بشاخ گل آویز و آب و نم در کش
پریدہ رنگ ز باد صبا چہ می جوئی!

Marfat.com

نکاحِ نابالغان

ایک محترمہ خاتون راولپنڈی کے ایک صاحب کے توسط سے دریافت فرماتی ہیں

آج سے تقریباً انیس سال قبل جبکہ میری عمر تقریباً ایک سال تھی میرے والد .... نے مسمی .... نابالغ کے ساتھ جس کی عمر اس وقت تقریباً دو سال تھی۔ میرا نکاح کر دیا۔ نکاح کی قبولیت .... مذکور کے لئے اس کے بڑے بھائی .... نے کی۔

اب جبکہ میری عمر تقریباً بیس سال ہو چکی ہے۔ اور لڑکا تقریباً اکیس سال کا ہے۔ تو ہمارے آپس کے حالات اس قسم کے ہیں کہ میں کسی شکل میں بھی .... مذکور کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ میں اسے مطلق طور پر پسند نہیں کرتی، میری اور اس کی طبیعت اور خیالات بالکل متضاد ہیں۔

چنانچہ میرے والدین نے میری نارضامندی کو دیکھتے ہوئے کوشش کی ہے کہ یہ نکاح فسخ ہو جائے۔ مگر فریق ثانی .... ہزار روپے کی رقم بعوض طلاق طلب کرتے ہیں۔ اور یہاں حالت یہ ہے کہ .... ہزار تو بجائے خود ہے..

Marfat.com

...... روپے کی ادائیگی بھی مشکل ہے۔

مجھے بالغ ہوئے تقریباً سات آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ اور میری زندگی برباد ہو رہی ہے، میں نے اس سلسلہ میں اپنے چند ایک خیر خواہوں کی معرفت علاقے کے مولویوں سے مسئلہ پوچھا۔ بعض کے نزدیک چونکہ یہ نکاح والد کا کیا ہوا ہے۔ اور والد اولاد کے لئے شفیق ہوتا ہے۔ لہذا یہ نکاح تادمِ حیات بلا طلاق کے فسخ نہیں ہو سکتا۔ چاہے میں ساری عمر گھٹ گھٹ کر بالآخر جان دے دوں۔

لیکن کچھ علماء ایسے بھی ہیں۔ جو اس بناء پر اس مجوزہ نکاح کو نکاح ہی تسلیم نہیں کرتے کہ وہ بغیر صیغہ ایجاب و قبول اور عدم علمیت میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے فیصلے کے مطابق میں جب چاہوں۔ نکاح ثانی کر سکتی ہوں۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ ہر دو میں سے کون سا فیصلہ درست ہے۔ جو احکام خداوندی کے مطابق ہو۔ اس صورت میں مجھے مشورہ دیا گیا ہے کہ میں آپ کی طرف رجوع کروں۔ براہِ کرم آپ میری حالت زار پر رحم فرماتے ہوئے میری مشکلات کا حل تجویز فرمائیں، اور عند اللہ ماجور ہو ویں۔

(یہ امر قابل ذکر ہے کہ میرا ...... کے ساتھ سوائے شناسائی کے قطعی طور پر کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہوا۔ نہ ہی میں اس کے گھر گئی۔ اور نہ ہی وہ کبھی ہمارے گھر آیا)

یہ بات زیادہ مناسب ہو گی کہ میرے سوال کا جواب بذریعہ طلوعِ اسلام

Marfat.com

دیا جائے۔ تاکہ وہ دیگر گم کردہ اشخاص اور ان کے مقابل مظلوم اور بیکس مخلوق خدا کی ہدایت کا باعث ہو۔

جواب۔

یہ خط دلیسے تو صرف ایک خاتون کی طرف سے ہے لیکن ترجمانی کر رہا ہے ان لاکھوں مظلوم عورتوں کی۔ جو بھیڑ بکریوں کی طرح قصابوں کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔ اور جہاں پھر ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ جو تراضی مابین (فریقین کی مرضی) سے طے پاتا ہے۔ وَاخذن منکم میثاقاً غلیظاً (۴/۲۱) دنیا کے ہر قانون میں معاہدہ Agreement کے لئے بالغ ہونا شرط ہے۔ قرآن کا اعجاز ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے بلوغت کو سن نکاح سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی بلوغت اسے کہتے ہیں جب لڑکا یا لڑکی نکاح کی عمر کو پہونچ جائے، سورہ النساء کے شروع میں مذکور ہے کہ جب کوئی بچے یتیم رہ جائیں تو تم ان کے اموال وجائیداد کی حفاظت کرو، اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہو حتیٰ اذا بلغوا النکاح (۴/۶) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اس وقت ان کے اموال وجائیداد ان کے سپرد کر دو (بشرطیکہ وہ فاترالعقل نہ ہوں) یہاں یہ حقیقت بلا شک وشبہ سامنے آگئی،

کہ قرآن کی رو سے نکاح کی عمر بلوغت کی عمر ہے، بلوغت سے پہلے نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی صراحت فرما دی کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْهًا (۴/۱۹) یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ یعنی مرد اس عورت سے شادی کرے جو اسے پسند ہو (مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ۴/۳) لیکن عورت کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ بلوغت سے قبل نہ لڑکے کا نکاح نکاح ہے۔ اور نہ لڑکی کا عقد، عقد، اور یہ تلاعب بالدین (دین سے مذاق) ہے۔ اور دنیا و آخرت میں رسوائی کا موجب، نکاح کے لئے ایجاب و قبول ایک لاینفک شرط ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی بچہ کا ایجاب و قبول کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔ "ایجاب و قبول" کی رسم اب بھی ہمارے ہاں رائج ہے لیکن جس طرح آجکل اس کی مٹی پلید ہو رہی ہے (بالخصوص لڑکیوں کے معاملہ میں) وہ ظاہر ہے، ہمارے ہاں نابالغ تو ایک طرف بالغ لڑکیوں سے بھی کون پوچھتا ہے کہ تمہارا نکاح کہاں کیا جائے؟ منوسمرتی (ہندوؤں کی معاشرت) میں لڑکی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے ساری عمر دوسروں کی مرضی کے تابع رہنا ہوگا۔ لڑکی ہے تو ماں باپ کی، بیوی ہے تو مرد کی، بیوہ ہے تو لڑکے کے رحم و کرم پر۔ وہ دنیا میں کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔ یہی کچھ ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ نے حضرت عائشہؓ سے شادی کی

تو ان کی عمر چھ برس کی تھی۔ اس لئے بچپن کی شادی جائز ہے۔ ہم اس وقت اس تاریخی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ برس کی تھی۔ یہ ایک جداگانہ مبحث ہے اور تفصیل کا محتاج۔ اس وقت ہم صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ سورۃ النساء کے وہ احکام جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، وہ مدینہ میں نازل ہوئے تھے۔ اور حضرت عائشہؓ کا نکاح اس سے قبل ہو چکا تھا۔ لہٰذا اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے۔ کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر بلوغت سے کم تھی تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس باب میں قرآن کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ ان احکام کے نزول کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھی جائے گی۔ جیسے رسول اللہؐ نے اپنی تین صاحبزادیوں (حضرت زینب، حضرت ام کلثوم اور حضرت رقیہ) کی شادیاں اپنے خاندان کے جن لڑکوں سے کی تھیں وہ مشرک تھے، اور قرآن میں مومن عورت کی شادی مشرک مرد سے جائز نہیں۔ لیکن یہ شادیاں اس زمانہ میں ہوئی تھیں جب قرآن کا یہ حکم نازل نہیں ہوا تھا کہ مشرک سے شادی جائز نہیں۔

فلہٰذا آج ہمارے لئے واجب الاتباع قرآن کے وہ احکام ہیں۔ جو اس باب میں مذکور ہیں۔ اور ان احکام کی رو سے بلوغت سے پہلے نکاح ہو نہیں سکتا۔ اور نکاح کے لئے بہرحال فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ لیکن ہماری بدبختی کہ ہمارے ہاں نکاح نابالغان نہ صرف یہ کہ مروج ہی ہے، بلکہ اسے "عین دین" سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے۔ کہ

Marfat.com

جب ہندوستان میں سارڈا بل پیش ہوا ہے۔ جس کی رو سے نکاح نابالغان ناجائز قرار دیئے جانے کی تجویز تھی۔ تو اس بل کی مخالفت میں سناتنی ہندوؤں کی ہمنوائی میں مسلمان بھی نہایت شدومد سے شریک تھے۔ اور اس انداز سے شریک کہ گویا وہ بل ان کے دین کے کسی بنیادی رکن کو منہدم کر رہا تھا ہمارے ارباب شریعت کبھی کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہوتے۔ مختلف فرقے، مختلف مسائل میں اپنے اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں۔ اور آپس میں ہمیشہ مصروف جدل و پیکار۔ لیکن یہ ہماری سوختہ بختی کی انتہا تھی کہ سارڈا بل کی مخالفت میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد اللسان تھے، اور اس باب میں جو وفد عظیم وائسرائے کے پاس پہنچا تھا اس میں قریب قریب ہر فرقے کے نمائندے موجود تھے۔ یہ تمام ارباب شریعت ایک عیسائی حکمراں کے حضور یہ کہنے کے لئے جا رہے تھے۔ کہ اس ہندو کے بل کو پاس نہ کیا جائے جو نابالغوں کا نکاح ناجائز قرار دے رہا ہے، ان کا وفد یہ کہنے جا رہا تھا اور آسمان ان کی اس حرکت پر رو رہا تھا۔ اور دنیا ہنستی تھی۔

بہرحال یہ ہے نکاح نابالغان سے متعلق قرآن کا فیصلہ۔ ہمیں تفصیلاً معلوم نہیں کہ ملک کا حالیہ قانون اس باب میں کیا کہتا ہے اور ہمارے ہاں جو شادیاں بچپن میں کر دی جاتی ہیں وہ انھیں از خود فسخ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یا اس کے لئے کسی عدالت کے فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس باب میں کسی وکیل سے پوچھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ مروجہ قانون اپنی مخالفت

Marfat.com

کو جرم قرار دیتا ہے۔ خواہ یہ مخالفت قرآن ہی کے کسی حکم کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔

(س) **تعدادِ ازواج** ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

ایک شخص کی بیوی موجود ہے، بچے موجود ہیں۔ گھر میں امن چین سے رہتے ہیں یکایک اٹھتے ہیں تو کسی نوجوان لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ سارا گھر جہنم بن جاتا ہے۔ جب پوچھتے ہیں۔ تو کہتے ہیں کہ شریعت نے چار تک کی اجازت دی ہے۔ تو اس پر اعتراض کرنے والا کون ہے۔ چونکہ اس میں "شریعت کی اجازت" کا بھی سوال آجاتا ہے اسی لئے شاید وہ لوگ جو شریعت کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ دو تین چار بیویاں دھڑا دھڑ گھر میں لے آتے ہیں۔ کیا اسلام نے واقعی اس کو یوں کھلا چھوڑ دیا ہے۔ کہ جس کا جی چاہے بیویاں کرتا چلا جائے۔

جواب۔

تعدادِ ازواج کا رواج مسلمانوں میں اس عمومیت سے چلا آرہا ہے۔ کہ اسے اسلام کے مسلمات میں سے سمجھ لیا گیا ہے۔ مخالفین اس پر اعتراض کرتے ہیں تو، اور مسلمان اس کی مدافعت کرتے ہیں تو دونوں صورتوں میں اسے ایسا مسئلہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔

قرآن کریم میں صرف ایک مقام پر ایک سے زیادہ بیوی کا ذکر آتا ہے۔ اور وہ

Marfat.com

ہے سورۂ النسا کی تیسری آیت، اس سورہ کی دوسری آیت میں ہے

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا (۴:۲)

اور یتیموں کو ان کے مال دیدو۔ اور اچھی چیز کو ردی سے نہ بدلو، اور ان کے

مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔ کیونکہ یہ بڑا گناہ ہے"

یہ ہے ان یتیموں کے بارے میں حکم جو صاحب مال وجائیداد ہوں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ ان کے اموال کو بطور امانت رکھو اور ان میں تصرف بیجا نہ کرو۔

اب دوسری صورت یہ ہے کہ قوم میں ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ بہت سے یتیم رہ جائیں۔ مثلاً جنگ میں مرد ضائع ہو جائیں یا وبا، وغیرہ میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بیوہ عورتیں اور ان کے ساتھ یتیم بچے رہ جائیں تو قوم کے سامنے ان کی حفاظت اور پرورش کا سوال بہت اہمیت رکھیگا۔ ایسی حالت میں جو قوم ان بیواؤں اور یتیموں کا ... مناسب انتظام نہیں کرتی وہ اپنے نظام معیشت اور معاشرت میں ایسی خرابیوں کی ذمہ دار بن جاتی ہیں، جس سے تمام معاشرے میں فساد ہی فساد رونما ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اگر نوجوان بیوہ عورتوں کو بلا سرپرستی کے چھوڑ دیا جائے تو اس سے بہت ہی خرابیوں کے جراثیم پھیل جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر یتیم بچوں کی کفالت کا مناسب انتظام نہ کیا جائے تو وہ یا تو بھکاری بن جائیں گے یا عادی جرائم پیشہ۔ جب کسی قوم میں بعض ہنگامی حوادث کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں

تو اس صورت حالات کا کیا علاج کیا جائے۔ قرآن نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ

وَإِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ
لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (۳/۴)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے۔ تو
ایسی عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں۔ نکاح کر لو۔ دو تین، چار تک

سارے قرآن میں یہی ایک آیت ہے۔ جس میں تعدد ازدواج کا ذکر ہے
اب ظاہر ہے کہ یہ اجازت غیر مشروط و غیر مقید نہیں۔ بلکہ اس آیت کی ابتدا ہی
ایک شرط سے ہوتی ہے۔ یعنی وان خفتم (اگر تمہیں اندیشہ ہو) الا تقسطوا
فی الیتمٰی (کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے) تو تمہیں اس امر کی
اجازت ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں، چار کی حد تک اور بیویاں کر لو، اور
اس طرح معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے بچاؤ جو ان بیوگان کو بلا سرپرست
اور ان کے یتیم بچوں کو بلا وارث چھوڑنے سے پیدا ہو جاتی تھیں، ان سے نکاح کر
لینے کی شکل میں یہ "محصنات" (قلعہ کے اندر محفوظ ہو گئیں) اور ان کے بچے
بمنزلہ تمہاری اولاد کے ہو گئے، اب وہ اپنے آپ کو "یتیم خانے" کی غیرت کش فضا
میں نہیں بلکہ اپنے باپ کے گھر میں خیال کریں گے۔ اس باپ کے گھر میں جسکے ترکے سے وراثت کے بھی
حقدار ہوں گے۔ قرآن نے اس مصیبت کا یہ حل تجویز کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک قومی مسئلہ کا حل ہے اسلئے ظاہر ہے
کہ اس امر کا فیصلہ بھی قوم ہی کر سکتی ہے کہ اس قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں جن میں ایک مرد

Marfat.com

کی کفالت میں ایک سے زیادہ عورتیں دیدینے کی ضرورت لاحق ہوگئی ہے۔ اگر اسلامی نظام سمجھے کہ ایسا وقت آگیا ہے۔ تو وہ اس قسم کا قانون نافذ کردے گا اور اس وقت ایک ملی ضرورت کے پیش نظر تعدد ازدواج جائز ہو جائے گا۔ جب وہ ہنگامی ضرورت ختم ہو جائے گی تو پھر وہی عام حالات عود کر آئیں گے۔ جن میں اصولی طور پر ایک ہی بیوی کی اجازت ہوگی۔

ان ہنگامی حالات میں بھی ہر شخص کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں اپنے نکاح میں لائے۔ یہ اجازت صرف اسے دی جائے گی۔ جو اس کا اہل ہوگا۔ کہ سب بیویوں کی ضروریات زندگی کا منصفانہ بوجھ اٹھا سکے چنانچہ آیت مندرجہ کا اگلا ٹکڑہ ہے فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ (۴/۳) اور اگر تم کو ڈر ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے۔ تو پھر ایک ہی بیوی رہے گی، اب سوال یہ ہے کہ اس عدل سے مفہوم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیوی سے لگاؤ کا تعلق جذبات سے ہے، اور یہ مشکل ہے کہ انسان "جذبات کی تقسیم" بھی مساویانہ کر سکے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

چنانچہ خلاق فطرت نے خود اس کی شہادت دی ہے کہ

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم (۴/۱۲۸)

تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہشمند کیوں نہ ہو۔ یہ بات تمہاری طاقت

Marfat.com

سے باہر ہے کہ تم عورتوں میں (ہر معاملہ میں) عدل کر سکو۔"

اب یہاں ایک الجھاؤ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے ہنگامی حالات میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ تم ان میں عدل کر سکو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکو گے۔ یہ تو عجیب بات ہوئی۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ایک طرف تو اجازت دی۔ اور دوسری طرف اس اجازت کو ایک ناممکن شرط سے مشروط کر دیا۔ بھلا اس اجازت سے فائدہ کیا جو ناممکن العمل ہو۔؟ لیکن قرآن نے اسے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ جس عدل سے تعداد ازدواج مشروط ہے اس عدل سے مفہوم کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تو تمہارے بس کی بات نہیں کہ تم قلبی لگاؤ میں بھی میزان کے دونوں پلڑے برابر رکھ سکو۔ اس لئے تم سے جس عدل کا تقاضہ ہے وہ یہ ہے کہ

فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ (۴/۱۲۹)

"پس ایسا نہ کرو کہ ایک طرف ایسا جھک جاؤ کہ دوسری "معلقہ" بن کر رہ جائے۔"

"معلقہ" اس عورت کو کہتے ہیں کہ جو نہ تو بیوہ ہو۔ نہ مطلقہ، نہ اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر سکے۔ اور نہ ہی اس کا خاوند اس کا حق ادا کر سکے۔ اور اس طرح بین بین لٹکی رہے۔ یعنی جن امور پر تم قدرت رکھتے ہو۔ ان میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کرو۔ اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تمہارا طبعی میلان تمہیں اس مساویانہ سلوک پر قادر نہ رکھ سکے گا

Marfat.com

تو پھر ایک سے زیادہ بیوی کو اپنے نکاح میں مت لاؤ۔

یہ ہیں تعدد ازدواج سے متعلق قرآنی احکام۔ ان سے واضح ہے کہ

(۱) اسلام میں تعدادِ ازدواج۔ اصول معاشرت نہیں، بلکہ ایک استثنا ہے

(۲) یہ استثنا ایسے ہنگامی حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ جن میں عورتوں اور لاوارث یتیموں کی تعداد بڑھ جائے۔ اور وہ عام معاشرے کے لئے ایک مشکل بن جائے۔

(۳) ایسے حالات میں اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ ان لوگوں کو جو ایک سے زیادہ خاندانوں کی کفالت کی استطاعت رکھتے ہوں، ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت دیدی جائے۔ تاکہ معاشرہ کا یہ مشکل مسئلہ حل ہو سکے۔

(۴) یہ اجازت بھی اس شرط سے مشروط ہوگی کہ (قلبی میلان کے علاوہ) وہ تمام بیویوں سے مساویانہ سلوک کر سکنے کا اہل ہو۔

(۵) اس صورت میں اس ہنگامی، قومی مسئلہ کا حل ہو جائے گا۔

یہ ہے قرآن کی رو سے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت۔ اور وہ ہے مسلمانوں کا عمل۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ ان کے اس عمل کو جس کی رو سے جس کا جی چاہے دھڑا دھڑ بیویاں کرتا چلا جائے۔ قرآنی اجازت سے کیا نسبت ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآنی اجازت کو اپنی ہوس رانیوں کی تسکین کے لئے ایک مقدس بہانہ بنا لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ چار کے بعد سب سے بڑی (یعنی پہلی) بیوی کو طلاق دے کر

Marfat.com

الگ کر دیا جاتا ہے، اور اس کی Vacancy میں ایک اور دوشیزہ بھرتی کر لی جاتی ہے، اور یہ تو محض "بیویوں" کا تذکرہ ہے۔ لونڈیوں پر تو تعداد کی بھی کوئی قید نہیں۔ ایک ایک محل سے ہزاروں کے قافلے برآمد ہو جاتے ہیں۔ اور تماشہ یہ کہ انھیں بھی عین شریعت حقہ کے مطابق قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے دورِ ملوکیت کی وہ خود ساختہ شریعت جس نے ہمیں کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا (اور جسے خیر سے ہمارے "مدعیانِ شریعت" اب بھی دنیا میں رائج کرنے کے متمنی ہیں۔ تفصیل اس کی کسی دوسرے مقام پر ملے گی جہاں غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں بحث ہوئی ہے)

بہرحال اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف سورۂ نساء کی تیسری آیت میں ہے، اور اس آیت کی ابتداء ان الفاظ سے ہوئی ہے کہ

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمٰی

اگر تمہیں خوف ہے کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے — تو

ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت ہے۔

جو شخص ایک بیوی کی موجودگی میں اور شادی کرے اس سے ذرا پوچھئے کہ اس نے اس شرط کو پورا کر لیا ہے۔ اور پھر ساتھ ہی ذرا جائزہ لیجئے، ان "مقدس حرم سراؤں" کا جس میں ہر سال یوں بیویاں بدلتی رہتی ہیں، جیسے نئے سال کا کیلنڈر۔ اور پھر سوچئے کہ انھوں نے اپنی کامجوئیوں کے لئے کس طرح "مذہب" کو آڑ بنا

رکھا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(س) تعدد ازواج

جہلم سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں

باب المرسلات ۱۱ اگست ۱۹۴۹ء میں تعدد ازواج کے سوال کے جواب میں طلوع اسلام کا شذرہ شائع ہوا ہے، جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مذہب اسلام میں تعدد ازواج کی اجازت بطور استثناء ہنگامی صورت حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دی گئی ہے۔ جس کا فیصلہ نظام اسلامی کرے گا۔ اور یہ اجازت مساویانہ سلوک کے شرط سے مشروط ہوگی۔

قرآن خوانی کے دوران میں مجھے بارہا خیال آیا کہ قرآن مجید (سورۂ نساء) میں تعدد ازواج کا ذکر قوم میں یتیموں کی تعداد میں اضافہ کے ضمن میں آیا ہے، اور اس لئے ایک خاص صورت حالات کے متعلق ہے۔ مگر مسلمانوں میں تعدد ازواج کی عمومیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس خیال کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

مسلمانوں میں تعدد ازواج رسول کریم سے شروع ہوا اور صحابہ کرام میں بھی اس کا رواج عام تھا، رسول اکرم قرآن کے سب سے بڑے مفسر تھے، اور صحابہ کرام ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے۔ جنھوں نے قرآن کا علم رسول اکرم سے حاصل کیا تھا، اس لئے ان کی قرآن فہمی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو سوالات

میرے ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ وہ جواب کے لئے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ قرآن کریم میں یہ اصول کہ مرد کو صرف ایک بیوی کی اجازت ہے۔ کہیں بھی مذکور نہیں، اسلام سے پہلے عرب میں تعدد ازدواج عام تھا۔ مگر اس کے برخلاف حکم نہیں دیا گیا تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام اس رواج کو توڑنا نہیں چاہتا تھا؟ "ازدواج معاشرت کا بنیادی مسئلہ ہے اور یہ بات حیران کن ہے کہ کتاب مقدس اس بنیادی مسئلہ کے متعلق خاموشی اختیار کرے۔ یا کم از کم کوئی قطعی حکم نہ دے۔ جبکہ معاشرت کے معمولی مسائل پر ناطق احکام موجود ہیں۔

۲۔ رسول اکرم کا تعدد ازداج ایک تاریخی امر ہے، کیا حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بعد تمام ازواج مطہرات کے نکاح اس وقتی ضرورت کو مدنظر رکھ کر کئے گئے جس کا ذکر سورۂ نساء آیت ۳ میں ہے؟ اگر نہیں تو اسوۂ رسول کی پیروی امت مسلمہ کیوں نہ کرے؟

(۳) کیا تمام صحابہ کرام کے تعدد ازدواج میں یہی شرط مضمر تھی؟ اور کیا یہ بات حتمی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے؟

۴۔ رسول کریم کے نواسہ امام حسنؓ کے متعلق ایک دفعہ پڑھا تھا کہ ان کی شادیاں کی تعداد سینکڑوں تک پہونچی۔ بلکہ ان کی کنیت "بہت طلاق دینے والا" مشہور تھی اگر یہ درست ہے۔ تو ان کے طرز عمل کی بنیاد کس پر تھی؟

۵۔ اگر واقعی رسول اکرم صحابہ اور رسول کے نزدیک ترین قرابت داروں کا طرز

Marfat.com

عمل تعدد ازدواج کے حق میں ہے۔ تو یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ سورۂ نساء کی آیت صرف یتیم لڑکیوں سے نکاح کے متعلق نہیں ہے۔ اور اسلام میں تعدد ازدواج جائز ہے؟ اور ایسے تعدد کی کوئی حد (Limit بھی مقرر نہیں۔؟

(۶) ہنگامی حالات مثلاً جنگ وغیرہ جن میں یتیم لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا، ان میں بیواؤں، باپ والی لڑکیوں اور غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگی، اس استثناء کو صرف یتیموں تک ہی کیوں محدود رکھا گیا۔ اور باقی اقسام کے متعلق کیا حکم ہوگا؟ وغیرہ

یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ سوالات نکتہ چینی کے لئے نہیں کئے گئے۔ بلکہ ایک طالب علم کی حیثیت سے، یہ اور اس قبیل کے سوالات پڑھے لکھے طبقہ کے افراد میں جو قرآن فہمی کی کوشش کرتے ہیں اکثر اٹھائے جاتے ہیں، باب المراسلات کے جواب نگار صاحب سے استدعا ہے کہ وہ محترم غلام احمد پرویز سے عرض کریں کہ اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ کی ضرورت ہے۔ جو جلد ہی شائع ہونا چاہیئے۔

جواب۔

جناب مستفسر صاحب نے بڑے اہم اور معقول سوالات اٹھائے ہیں جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے۔ ان کے مفصل و مشرح جواب کے لئے بسوط مقالہ کی ضرورت ہے، لیکن طلوع اسلام اپنی تنگیٔ داماں کا ہمیشہ گلہ سنج رہا ہے، اس لئے سر دست مختصر اشارات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ جوابات نمبر وار عرض کئے جاتے ہیں۔

Marfat.com

۱۔ قرآن میں یہ اصول کہ عام حالات میں ایک ہی بیوی کی اجازت ہے مذکور ہے۔ خود سورہ نساء میں جہاں خاص حالات میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ موجود ہے کہ الا تعدلوا فواحدۃ (۳/۴) "اگر تم عدل نہ کر سکو تو پھر ایک ہی عورت رکھو" اس سے ظاہر ہے کہ عام اصول ایک ہی بیوی سے رشتۂ مناکحت کا ہے۔ صرف خاص حالات میں بشرط عدل ایک سے زائد کی اجازت دی جاسکتی ہے مثنیٰ وثلث وربع (دو، تین اور چار) کے الفاظ خود اس پر شاہد ہیں کہ عام اصول ایک ہی کا ہے۔ خاص حالات میں اجازت دو سے شروع ہوتی ہے، اور چار تک جاکر رک جاتی ہے۔

اسی سورہ میں چند آیات آگے جاکر طلاق سے متعلق احکام میں ہے کہ

وان اردتم استبدال زوج مکان زوج (۲۰/۴)

اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو!

واٰتیتم احدٰھن قنطارًا فلا تاخذوا منہ شیئًا

اور اگر تم اسے سونے کے ڈھیر بھی دے چکے ہو، تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔"

یعنی اگر موجودہ بیوی سے نباہ نہ ہو، تو اسے طلاق دو اور اس کے بعد دوسری عورت سے شادی کرو۔ اس آیت کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس میں صرف "ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنے" کا ذکر ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے۔ کہ ایک

شخص کی چار بیویاں ہوں۔ اور اُن کی جگہ بدل بدل کر نئی عورتوں سے شادی کرنا چاہے تو اس کے متعلق حکم ہے کہ ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری عورت کو لے آؤ، لیکن اس آیت کو جب فواحدۃ والی آیت کی روشنی میں پڑھا جائے تو اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ عام حالات میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری کی اجازت نہیں، پہلی بیوی کے (قرآنی شرائط و حدود کے مطابق) طلاق پا لینے کی صورت میں اس کی جگہ دوسری بیوی کی اجازت ہوگی۔

قرآن اور تاریخ کی حیثیت

اس کے بعد سوالات ۲ تا ۵ کو لیجئے۔ ان میں جناب مستفسر نے ایک بہت ہی اہم موضوع کو پیش کیا ہے۔ یعنی قرآنی احکام اور تاریخ کی باہمی حیثیت۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان جس پریشانی فکر و نظر سے گزر رہا ہے (اور اس کی یہ کیفیت آج سے نہیں صدیوں ہی سے ایسی چلی آ رہی ہے) اور وہ مسائل حیات میں تضاد اور ذہنی خلفشار سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ قرآن اور تاریخ کے صحیح موقف (پوزیشن) کا عدم تعین ہے۔ یعنی اس نے دین اور تاریخ کا صحیح صحیح مقام متعین نہیں کیا جس کی وجہ سے زندگی کی کوئی حقیقت اور دین کا صحیح نظام اس کے سامنے واضح طور پر نہیں آتا۔ جس معاملہ میں دیکھو اختلاف، جس مسئلہ میں غور کرو، تشتت و افتراق۔ اگر ہم قرآن کو اس کے صحیح مقام پر رکھیں، اور تاریخ کو اس کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیں۔ تو ہماری بہت سی مشکلات کا حل آج ہی ہو جائے۔

Marfat.com

قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ ایک یقینی صحیفہ ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ بعینہٖ وہی ہے، جو نبی اکرمؐ کے حسن وساطت سے نوع انسانی کو ملا، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، کسی رد و بدل کا امکان نہیں۔ لہٰذا جو چیز قرآن میں ہے اسے بلا توقف و تامل حتمی اور یقینی تصور کرنا ہوگا۔ یہ ایک مسلمان کا ایمان ہے۔ جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

قرآن کے بعد تاریخ دین ہمارے سامنے آتی ہے۔ تاریخ دین سے مراد یہ ہے کہ عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں قرآنی نظام کس طرح متشکل ہوا۔ تاریخ دین کی کتابوں میں کتب احادیث کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ ان کی صحت کو عقیدہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ۔ --- (قرآن کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ صحیح کتاب) مانا اور منوایا جاتا ہے۔ لیکن کتب احادیث (یعنی دیگر کتب تاریخ تو ایک طرف۔ خود کتب احادیث بھی) جس زمانہ میں اور جس انداز سے مرتب ہوئی ہیں وہ اس پر شاہد ہے کہ انہیں کس حد تک حتمی اور یقینی کہا جا سکتا ہے۔ بخاری شریف عہد رسالت مآب سے قریب سوا دو سو سال بعد مرتب ہوئی ہے، اور اس کا مدار تمام تر ان روایات پر مشتمل ہے جنھیں امام بخاریؒ نے لوگوں کی زبانی سنا۔ انھوں نے قریب چھ لاکھ روایات جمع کیں۔ اور انھیں اپنے قیاس سے چھانٹا۔ اور قریب چھ ہزار اپنے مجموعہ میں داخل کیں۔ اب اس سے خود اندازہ فرمائیے کہ جہاں تک حتم و یقین کا تعلق ہے۔ قرآن کے مقابلہ میں

Marfat.com

تاریخ کی ان "صحیح ترین" کتابوں کی حیثیت بھی کیا رہ جاتی ہے[1]

اب اس سے آگے بڑھیئے۔ نبی اکرمؐ کی پوری حیات طیبہ، قرآن کے مطابق تھی۔ خود قرآن میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ آپ وحی کی اتباع کریں۔ حضورؐ کا دعوےٰ بھی یہی تھا کہ میں قرآن کی اتباع کرتا ہوں۔ اگر قرآن میں یہ کچھ بہ صراحت مذکور نہ بھی ہوتا تو بھی اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ حضورؐ کی سیرت طیبہ قرآن کی اتباع تھی۔ اس لئے کہ اگر رسولؐ بھی اپنی وحی کی اتباع نہیں کرے گا، تو اور کون اسکی اتباع کرے گا۔ رسولؐ کے ساتھ وہ جماعت سامنے آتی ہے، جو رسول کی تربیت یافتہ اور قرآنی نظام کے قیام کی اولین ذمہ دار تھی، ظاہر ہے کہ قدسیوں کی اس جماعت کی زندگی بھی قرآن ہی کی اتباع تھی۔

تاریخ ظنی ہے

اب اگر ہم دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے، اور تاریخ (کتب روایات وسیر) میں نبی اکرمؐ یا صحابہؓ کا کوئی عمل یا قول اس کے خلاف مذکور ہے۔ تو ہمیں اسی نتیجہ پر پہنچنا ہوگا کہ تاریخ نے اس واقعہ کو ہم تک صحیح طور پر نہیں پہونچایا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہ عمل یا قول۔ قرآنی حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ ہے ہی نہیں جو قرآن کو ماننے والوں کے نزدیک قابل قبول ہو، اس لئے کہ قرآن حتمی ہے، اور تاریخ ظنی۔ اور جب بھی ظن اور یقین میں تصادم و تنازع ہوگا تو یقین کو بہر حال و بہر نوع صحیح تسلیم کیا جائے گا۔ ان الظن لا یغنی عن الحق شیئًا۔

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "مقام حدیث"

لیکن ہماری بدبختی کہ ہم نے ظن کو یقین پر غالب قرار دے رکھا ہے۔ چنانچہ یہ چیزیں ہمارے عقیدہ میں داخل ہیں کہ حدیث، قرآن پر قاضی ہے حتیٰ کہ اس کی ناسخ بھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دین یکسر ظنیات کا مجموعہ بن چکا ہے۔ حتیٰ کہ اس ذات اقدس و اعظم کی حیات طیبہ بھی جو اپنی سیرت کی رفعت اور کردار کی پاکیزگی میں انسانی کمال کے افق اعلیٰ پر فائز المرام ہے۔ ایسے واقعات سے ملوث کر دی گئی ہے جنہیں دیکھ کر نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ اس کے لئے آپ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" یعنی بخاری شریف کو ہی اٹھا کر دیکھئے۔ حقیقت سامنے آجائے گی، احکام و مسائل کو چھوڑیئے۔ صرف تاریخی واقعات کو لیجئے اور سوچئے کہ کیا یہ تاریخ کسی صورت میں بھی قابل اعتماد قرار پاسکتی ہے۔ مثلاً بخاری شریف (کتاب الوضوء) میں ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ عکل یا عرینہ کے چند آدمی آئے۔ اور مدینہ میں انھیں پیٹ کی بیماری ہو گئی۔ رسول اللہ نے انھیں اونٹنیوں میں جانے اور ان کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ گئے جب تندرست ہو گئے۔ تو حضورؐ کے چرواہے کو قتل کر کے اونٹنیوں کو ہانک کر لے گئے۔ جب صبح کو آپ کو خبر ہوئی، تو آپ نے ان کے پیچھے آدمی دوڑائے۔ سورج چڑھتے ہی وہ لوگ (گرفتار کر کے) لائے گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، اور سیسہ پگھلا کر ان کی آنکھوں میں ڈالا جائے۔ اور مقام حرہ میں پھینک دیا جائے

Marfat.com

وہ لوگ شدت پیاس سے پانی مانگتے تھے۔ لیکن انھیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ ؎

کیا آپ کا خیال ہے کہ حضورؐ نے انھیں اونٹنیوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا ہوگا؟ اور اس ذات رحمت اللعالمین نے ان مجرمین کو اسی طرح قتل کردیا ہوگا۔ جس طرح اس حدیث میں مذکور ہے۔؟ یا مثلاً کعب بن اشرف کے واقعہ قتل کو لیجئے۔ جو بخاری کی ایک حدیث میں شرح و بسط سے مذکور ہے۔ مختصراً یہ کہ حضور نے فرمایا کہ "کعب بن اشرف نے خدا اور اس کے رسول کو تکلیف دی ہے۔ لہٰذا اس کو کون قتل کریگا محمد ابن مسلمہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے قتل کردوں؟ فرمایا۔ ہاں۔! ابن مسلمہ نے عرض کیا کہ پہلے مجھے اس سے بات بنانے کی اجازت دیجئے۔ فرمایا۔ جو تدبیر چاہو کرو۔" چنانچہ اس کے بعد "اس بات بنانے اور تدبیر کرنے" کی پوری تفصیل موجود ہے۔ کہ حضرت مسلمہؓ نے کس طرح کعب بن اشرف کو بہانہ سازی اور فریب دہی سے بلایا۔ اور اس کے سر کی خوشبو سونگھنے کے بہانے سے اسے قتل کردیا۔

ظاہر ہے کہ حضورؐ سرور کائنات یا صحابہؓ کبار تو ایک طرف دشمن کو اس طرح بہانہ سازی سے قتل کرنا عام عربوں کی قومی خصوصیات کے بھی منافی تھا! اسلام

؎۔ ہم نے احتیاطاً ترجمہ بھی خود نہیں کیا۔ "مولانا مولوی حکیم دائم صاحب جلالی" کے مطبوعہ ترجمہ کو نقل کردیا ہے۔

Marfat.com

نے آکر انھیں مکارم اخلاق کی جن بلندیوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اسے سورج کی آنکھ نے دوبارہ نہیں دیکھا۔ لیکن ان کا تو زمانہ جاہلیت میں بھی یہ عالم تھا کہ ان کی دوستی اور دشمنی بالکل للکار کر ہوتی تھی۔ خدع و دنائت ان کے قومی خصائص کے منافی تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ تاریخ کا یہ واقعہ قطعاً قابل اعتماد نہیں۔

یا مثلاً بخاری شریف میں ہے کہ

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے محمدؐ کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور ان پر کتاب نازل کی۔ اس میں سنگساری (زنا کی سزا میں رجم) کی آیت موجود ہے۔

قرآن ہمارے پاس موجود ہے، اس میں سنگساری کی آیت کہیں نہیں اب اگر کوئی شخص اس روایت سے یہ دلیل لے آئے کہ جو قرآن اس وقت ہمارے پاس موجود ہے یہ وہ قرآن نہیں جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تھا۔ اس قرآن میں اس سے کچھ زیادہ بھی تھا۔ تو یہ دلیل اس لئے غلط ہوگی کہ قرآن اپنی حفاظت کے لئے خود اللہ تعالیٰ کو ذمہ دار بتاتا ہے، اور یہ روایت اس حفاظت کی تکذیب کرتی ہے۔ یا مثلاً ازواج نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں بخاری میں یہ روایت ہے کہ فتح خیبر کے بعد (حضرت صفیہؓ) کے حسن و جمال کا چرچا حضورؐ تک پہنچا تو حضورؐ نے (قیدیوں میں سے) انھیں اپنے لئے انتخاب فرما لیا + فرمایئے۔ اگر ہم اس تاریخی بیان کو صحیح مان لیں تو بات کہاں تک جا پہونچتی ہے۔ یا بخاری کی یہ روایت کہ حضور اپنی گیارہ

(یا نو) ازواج مطہرات کا دورہ ایک شب میں فرلیا کرتے تھے"۔ چنانچہ جب لوگوں کو اس روایت پر تعجب ہوا، تو اس کے راوی (حضرت انسؓ) نے ان سے کہا۔ کہ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔" نبی اکرمؐ میں تیس آدمیوں کی قوت رجولیت تھی"

اس بیان سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ تاریخ کے واقعات ظنی ہوتے ہیں اس لئے انھیں کسی حتمی نتیجہ کا مدار نہیں قرار دینا چاہیئے۔ اور جب صورت یہ ہے تو قرآن کی تفسیر تاریخی واقعات کے تحت بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ تاریخی واقعات کو ہمیشہ قرآن کے تابع رکھنا چاہیئے۔[1]

اس اصولی تمہید کے بعد اس سوال کو سامنے لائیے کہ کیا رسول اللہ یا صحابہ کبارؓ کے تعدد ازواج میں یہی شرط (یعنی یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کی کثرت وکفالت کی شرط) مضمر تھی۔ اور کیا یہ بات حتمی طور پر ثابت کی جاسکتی ہے؟"

رسول اللہ کی ازواج مطہرات

تاریخ سے کون سی بات "حتمی طور پر ثابت" کی جاسکتی ہے؟ جب تاریخ کا مدار ہی ظنیات پر ہو۔ لہٰذا ہمارے سامنے سوال کی صورت یوں آئے گی کہ قرآن میں

[1] ہمارے ہاں اس قسم کی سیرت کوئی نہیں لکھی گئی۔ جس میں تاریخ کو قرآن کے تابع رکھا گیا ہو۔ معارف القرآن (جلد چہارم) اس قسم کی پہلی کوشش ہے۔ جس میں حضورؐ کی سیرت طیبہ کو قرآنی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ اور تاریخ کو اس حد تک قابل اعتماد سمجھا گیا ہے جہاں تک وہ قرآن کے تابع جاتی ہے۔

Marfat.com

(۱) عام اصول یہی ہے کہ ایک مرد کی بیک وقت ایک بیوی ہو اور (۱۱) خصوصی حالات میں بشرط عدل تعددِ ازدواج کی اجازت دی گئی ہے۔ لہذا ـــــ نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی ایک سے زائد بیویاں یا تو اس حکم سے پہلے موجود ہوں گی۔ اور یا پھر لامحالہ اسی شرط سے مشروط، سورۂ النساء کی (تعددِ ازدواج کی) آیت زیر بحث کے متعلق عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول، یا فتح مکہ کے قریب کا ہے۔ یا ۵ھ۔ چونکہ اس حکم میں ... تعدد ازدواج کی حدبندی کی گئی ہے، اور حضورؐ کا آخری نکاح (حضرت صفیہؓ کے ساتھ) فتح خیبر کے وقت ۷ھ میں ہوا تھا اس لئے اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس حکم کا زمانہ نزول فتح مکہ (۸ھ) کے قریب کا ہے۔ اگر تاریخ کی روایات اس کے خلاف ہیں۔ تو ان روایات کو قرآن سے تطبیق دینی ہوگی۔ اور اگر ان میں تطبیق کی صورت نہ ہوگی۔ تو انھیں غلط تصور کرنا ہوگا۔ قرآن کے ایسے کھلے حکم کی موجودگی میں تاریخ کی ان روایات سے (کہ رسول اللہؐ یا صحابہ کبارؓ کی متعدد بیویاں تھیں) یہ دلیل لانا کہ تعدد ازدواج غیر مشروط جائز ہے۔ قرآن کو تاریخ کے تابع کرنا ہے۔ حالانکہ اصولاً تاریخ (ظن) کو قرآن (یقین) کے تابع رہنا چاہیئے۔

ممکن ہے یہاں یہ کہہ دیا جائے کہ اس صورت میں تاریخ کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ درست ہے۔ ظنی علم کی حیثیت دوسرے ظنی علم کے مقابلہ میں باقی رہ سکتی ہے۔ یقینی علم کے مقابلہ میں اس کی کیا حیثیت رہ سکتی ہے؟ باقی

Marfat.com

دنیا کو اس لئے تاریخ پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے کہ ان کے پاس یقینی علم کہیں بھی نہیں ہے تمام اقوام عالم میں یہ خصوصیت کبریٰ صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کے پاس چودہ سو سال سے ایک ایسا یقینی صحیفہ ہے۔ جس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ سے بھی زیادہ پائیدار اور محکم ہے۔ لہٰذا ہمیں اس یقینی ذریعہ علم کو چھوڑ کر ظنی ذریعہ علم کو دلیل و حجت بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس دن مسلمانوں نے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اسی دن ان کی قسمت بدل جائے گی۔ اس لئے کہ اس کے بعد ان کا دین پھر اپنے اصلی اور یقینی خطوط پر متشکل ہو جائے گا۔ اور اپنے فطری نتائج سے انھیں اقوام عالم کی امامت و قیادت کا مستحق بنا دے گا۔

امام حسنؓ اور تاریخ

محترم مستفسر نے رسول اکرمؐ کے نواسہ امام حسنؓ کی شادیوں اور طلاقوں کا ذکر فرمایا ہے، یہ درست ہے کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انھوں نے سو سے زیادہ بیویاں کیں اور انھیں طلاقیں دیں۔ اور دوسری طرف حدیث میں یہ بھی ہے کہ طلاق کو حضورؐ نے بہت ناپسندیدہ عمل (ابغض) قرار دیا ہے۔ اب فرمائیے کہ تاریخ کے ان بیانات کی روشنی میں رسول اللہ کے نواسہ حضرت امام حسنؓ کے متعلق آپ کس نتیجہ پر پہونچتے ہیں؟

یزید کے متعلق روایت

اور اگر تاریخ کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ سننا ہو تو وہ بھی سن لیجئے، بخاری شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا وہ

Marfat.com

بخشا جاچکاہے (اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم بخاری)
اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطیہ پر حملہ کیا تھا اس کے ایک دستہ
کا سپہ سالار یزید (ابن معاویہؓ) تھا۔

فرمائیے! واقعہ کربلا بخاری شریف کی بشارت جنت اور قسطنطیہ پر لشکر کشی
سے متعلق تاریخی بیانات میں آپ تطبیق کی کیا صورت پیدا کریں گے؟ اگر آپ اس
کی کوئی صورت پیدا بھی کرلیں تو ان لوگوں سے ذرا پوچھئے کہ وہ کیا جواب دیتے
ہیں جو ایک طرف بخاری شریف کو دین تسلیم کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف یزید پر لعنت
بھیجنے کو بھی جزو عقیدہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن مسلمان نے تو کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا
ہی نہیں کی کہ میں کیا کیا کچھ مانتا ہوں اور کیا کیا کچھ کرتا ہوں۔

تعداد ازدواج اور یتیم سوال نمبر ۶ میں بھی ایک اصولی نکتہ سامنے آگیا ہے۔
یعنی قرآن نے اس استثناء کو صرف یتیموں تک ہی
کیوں محدود رکھا ہے۔ حالانکہ ہنگامی حالات میں جن یتیم لڑکیوں میں اضافہ ہوگا ان
میں بیواؤں، باپ والی لڑکیوں اور غیر شادی شدہ عورتوں کی تعداد میں بھی ازدیاد ہوگی۔
ان اقسام کے متعلق کیا حکم ہوگا؟

محکمات و متشابہات قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصولی بات بیان کر دیتا
ہے۔ اس کے تمام متعلقات و تضمنات سے بحث نہیں کرتا،
یہی وہ تقسیم ہے۔ جسے اس نے محکمات و متشابہات سے تعبیر کیا ہے۔ محکمات وہ

Marfat.com

محور ہیں جن کے گرد متشابہات (ملتے جلتے حالات کے مطابق احکام) گھومتے ہیں مثلاً قرآن نے سارق (چور) کی سزا قطع ید (ہاتھ کاٹنا) بتائی ہے لیکن سرقہ کی تفاصیل سے بحث نہیں کی۔ حالانکہ تعزیری قانون کی تکمیل کے لئے سرقہ اور اس کے متعلقات کی مختلف جزئیات کی تعیین ضروری ہے۔ ان جزئیات کو قرآن اسلامی نظام کے اجتہاد پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ بدلتے رہنے والے حالات کے تقاضوں سے ملتے جلتے (متشابہ) قوانین خود مرتب کرلئے جائیں۔ یا مثلاً وہ کہتا ہے کہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء (عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو) تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ حق انتخاب صرف مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ اس حکم میں تخاطب مردوں سے ہے۔ لیکن دوسری طرف عورتیں بھی اس میں شامل ہیں یعنی جس طرح مردوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کریں اسی طرح عورتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کے مرد سے نکاح کریں۔ یا پھر ما طاب (پسندیدگی) بھی بلا حدود و قیود نہیں ہوگی (حالانکہ آیت زیر نظر میں اس کی شرائط و حدود کہیں بیان نہیں کی گئیں) اولاً محرمات اس سے بکسر خارج ہوں گی۔ پھر پسندیدگی کے لئے اختلاط فاحشہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ نہ ہی ایسے ارتباط کی جو قرآن کی دوسری حدود سے جا کر ٹکرائے۔ قرآن نے ان تفاصیل کو بیان نہیں کیا۔ لیکن اصول پسندیدگی میں یہ تمام مستثنیات و تعلیقات شامل ہیں۔

یا دوسری طرف مثلاً ارشاد ہے کہ

Marfat.com

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق

(اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو)

اس سے یہ مطلب نہیں کہ اولاد کو مفلسی کے خوف کی بنیاد پر قتل نہ کرو۔ باقی حالات میں بیشک قتل کر دیا کرو۔ قتل اولاد تو بہر کیف منع ہے۔ اس خصوصیت (املاق) کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس زمانہ میں قتل اولاد کا محرک جذبہ بیشتر افلاس ہی ہوتا تھا۔ یا مثلاً ارشاد ہے کہ ولا فسوق ولا جدال فی الحج (حج میں فسق اور جدال سے احتراز کیا کرو) تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ عام حالات میں بیشک فسق و فجور اور جنگ و جدل میں الجھے رہا کرو۔ البتہ حج کے اجتماع میں اس سے مجتنب رہنا ضروری ہے۔

ہاں تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے، اور اس کے بیان کرنے میں ان علل و اسباب کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے جو زمانہ نزولِ قرآن میں خصوصی طور پر ابھرے ہوئے تھے۔ اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ وہ حکم صرف اسی اصول تک محدود اور انہی علل و اسباب سے مشروط ہے۔ جو قرآن نے بیان کئے ہیں۔ وہ حکم ایک مرکزی نقطہ ہوتا ہے جس پر پرکار کا ایک پاؤں رکھ کر دوسرے پاؤں سے تمام تشابہ (ملتے جلتے حالات کے لئے) جزئیات کا دائرہ کھینچا جا سکتا ہے اگر اس نقطہ کے گرد اگر دائرہ نہ کھینچا جائے تو زندگی کے بدلنے والے تقاضے دم گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ یا اپنی تسکین کے لئے اور راہیں تلاش کر لیتے ہیں (جیسا کہ ہمارے ہاں

ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے) اور اگر یہ دائرہ کھینچتے وقت پرکار کا پاؤں مرکزی نقطے سے اکھڑ جائے تو سارا دائرہ خراب ہو جاتا ہے۔

ان مبادیات کی روشنی میں تعدد ازدواج سے متعلق قرآنی راہنمائی کو دیکھئے عام حالات میں قرآن سے ایک وقت میں ایک بیوی کا اصول سمجھ میں آتا ہے، تعدد ازدواج کے لئے ایک ہی مقام پر اجازت ہے۔ اور وہ سورۂ نسار کی یہ آیت ہے فان خفتم الا تقسطوا فی الیتمیٰ (اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو . . . . ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت ہے) اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اجازت صرف ہنگامی حالات سے وابستہ ہے۔ عمومی حالات میں اسی فواحدۃ (ایک بیوی) کے اصول پر عمل کیا جائے گا۔

اس ہنگامی اجازت کے لئے قرآن نے یتیموں کے مسئلہ کے حل کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ اس وقت یہی مسئلہ جاذب توجہ تھا۔ اگر اسی قسم کے ملتے جلتے اور ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو نظام ملت اسی اصول کی روشنی میں ان حالات کے متعلق بھی فیصلہ کرسکتا ہے۔ لیکن عمومی حالات میں انفرادی طور پر تعدد ازدواج کی اجازت کہیں سے نہیں ملتی۔

اب رہا یہ کہ صحابہ کبارؓ کے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ تو تاریخ کے اس بیان کے متعلق ہم یہی کہیں گے کہ (۱) یا تو یہ تعدد قرآنی حکم سے پہلے کا تھا۔ اور اگر یہ قرآنی حکم کے بعد کی بات ہے۔ تو لامحالہ۔ یہ اسی شرط (یعنی ہنگامی حالات) سے

Marfat.com

مشروط ہوگا۔ جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ اگر تاریخ کی تفاصیل اس سے مختلف ہیں یا اس کی تصریحات قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔ تو ہم اس ظنی شہادت کے مقابلہ میں قرآن کے یقینی حکم کو رد نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اس یقین کو اس ظن کے تابع رکھ کر قرآنی حکم کی اس قسم کی تاویل کر سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک قرآن اور تاریخ کا یہی تعلق صحیح تعلق ہے۔

(س) زمانہ عدت

کیا مطلقہ عورت کے لئے زمانہ عدت میں بھی تجدید نکاح کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت ہے تو زمانہ عدت اور بعد از عدت میں کیا فرق ہوا؟

جواب۔

طلاق کا فیصلہ کر دینے کے بعد سابقہ نکاح (معاہدہ) کالعدم ہو جاتا ہے اس لئے تجدید نکاح کی بہرحال ضرورت ہوتی ہے۔ زمانہ عدت میں عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی (صرف اپنے سابقہ شوہر سے کر سکتی ہے) عدت کے بعد اس پر اس کی کوئی پابندی نہیں رہتی۔ وہ جس سے چاہے شادی کر لے

(س) عورتوں کو مارنا

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن نے مردوں کو یہ اجازت دی ہے (بلکہ حکم دیا گیا ہے) کہ اگر وہ عورت میں سرکشی دیکھیں تو انہیں سمجھائیں اور اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو ان سے

علیحدگی اختیار کرلیں اور اگر اس پر بھی وہ اپنے آپ کو درست نہ کرلیں تو انھیں پیٹا جائے، اس سے مرد کے اختیارات ایسے وسیع ہو جاتے ہیں کہ عورت بے چاری اس کے سامنے بھیڑ بکری بنکر رہ جاتی ہے۔ کیا قرآن کا منشا یہی ہے؟

جواب۔

قرآن کا یہ منشا قطعاً نہیں ہے۔ ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے ان احکام کو انفرادی سمجھ رکھا ہے۔ یعنی ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن ہر مرد کو یہ اختیار دیدیتا ہے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور جس وقت وہ خود فیصلہ کرلے کہ عورت اپنی سرکشی سے باز نہیں آتی، اسے سزا دینا شروع کردے، اور اس سزا میں مارپیٹ بھی شامل ہے، تعزیری احکام کے معاملہ میں سب سے پہلے یہ اصول ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ وہ احکام افراد کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ حکام کے لئے ہیں۔ یعنی ان عدالتوں کے لئے جو حکومت قرآنی کی طرف سے ان امور کے لئے مقرر کی جائیں پھر عائلی زندگی میں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کی رو سے جو حقوق و فرائض مردوں کے لئے ہیں۔ اسی کے مثل حقوق و فرائض عورتوں کے بھی ہیں یہ قانون معاشرت کی اصل ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ عائلی زندگی میں قرآن سب سے پہلے باہمی افہام و تفہیم تجویز کرتا ہے۔

وان امرأۃ خافت من بعلہا نشوزًا او اعراضا فلا جناح علیہما ان یصلحا بینہما صلحًا (۴/۱۲۸)

Marfat.com

"اگر کسی عورت کو اپنے خاوند سے سرکشی یا اعراض کا اندیشہ ہو۔ تو اس
میں کوئی ہرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح کرلیں"
یعنی ضروری نہیں کہ یونہی معاملہ کو عدالت تک لے جائیں اسی طرح
والتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع
واضربوهن رہے
جن عورتوں سے سرکشی کا ڈر ہو تو اس کے لئے پہلے تو باہمی انہام و تفہیم
سے صلح صفائی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر معاملہ اس سے نہ سلجھے۔ تو پھر
بات حکام تک جائے گی، اب فیصلہ وہاں سے صادر ہوگا۔ اگر عورت کا جرم
ثابت ہوگیا۔ تو ہلکی سزا تو یہ ہے کہ اسے ایک مدت معینہ کے لئے خاوند سے الگ
کردیا جائے۔ اور انتہائی صورت میں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اسے بدنی سزا دی جائے
ظاہر ہے کہ اگر یہی جرم مرد کے خلاف ثابت ہوگا تو اسے بھی اسی قسم کی سزا ملیگی
لہٰذا یہ تعزیری احکام عدالت کی رہنمائی کے لئے ہیں، سزا کی مجاز صرف عدالت
ہوگی۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ خواہ مرد ہو
یا عورت۔ حتیٰ کہ طلاق میں بھی انفرادی اختیار نہیں ہے۔ میاں بیوی دونوں کی باہمی
شکر رنجی کی صورت میں عدالت پہلے ثالث مقرر کرے گی۔ اور ان ثالثوں کی رپورٹ
کے بعد وہ فیصلہ دے گی کہ باہمی موافقت کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ یا انقطاع
تعلقات ناگزیر ہے۔ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ جب چاہے اٹھ کر عورت کو
طلاق دیدے۔ (دیکھئے ۴/۳۵)

Marfat.com

لہذا تعزیری احکام کے متعلق یہ حقیقت ہمیشہ سامنے رکھنی چاہیئے کہ ان کا خطاب حکام (عدالتوں) سے ہے۔ افراد سے نہیں۔ اسلامی نظام میں یہ تمام معاملات حکومت کی طرف سے متعین کردہ قضاۃ Judges فیصل کریں گے۔ اور سزائیں باب حکومت کی طرف سے ملیں گی۔ نہ کہ افراد اپنی مرضی اور اختیار سے جو جی میں آیا کریں گے۔ پھر یہ حدود بھی حکومت متعین کرے گی کہ جرم کی کس نوعیت میں کس حد تک سزا دی جا سکتی ہے۔ قرآن کی مقرر کردہ سزائیں انتہائی سزائیں ہیں (اور یہ سزائیں چار پانچ جرائم سے زیادہ کے لئے متعین ہی نہیں وہ جرائم جن سے حفاظت نفس (قتل) حفاظت اموال (سرقہ) حفاظت عصمت (زنا اور قذف) اور حفاظت مملکت (بغاوت) خطرہ میں پڑ جائے۔) یہ حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ ان حدود و قیود کو متعین کرے جن کی رو سے یہ انتہائی سزائیں دی جائیں گی۔ اور ان احوال و ظروف Circumstances کی تبیین کرے جن میں معافی دی جائے گی۔ یا انتہائی سزا سے کم درجہ کی سزا دی جائے گی۔ بہرحال یہ بحث الگ ہے۔

Marfat.com

شرعی سزائیں

طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء میں آپ نے لکھا ہے کہ قرآن نے جو سزائیں بتائی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ حدود شرعی نافذ کرنے والے احوال وظروف اور جرم کی نوعیت کے پیش نظر ان سے کم سزا بھی دے سکیں گے۔

کیا یہ آپ ہی کا اجتہاد ہے۔ یا اس سے پہلے کہیں اس کی مثال بھی ملتی ہے

۲۔ زانی کی سزا سو کوڑے لکھی ہے۔ کیا کوئی شخص سو کوڑے کھا کر زندہ بچ سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی کی سزا موت ہے۔ اور موت کا طریقہ کوڑے مارنا ہے۔ اس لئے اس کی سزا اگر سنگساری کردی گئی تھی۔ تو اس میں کیا حرج تھا؟

جواب۔

جی نہیں۔ یہ ہمارا ہی اجتہاد نہیں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا قطع ید ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے۔ جو قرآن نے متعین کی ہے۔ کس قدر چوری اور کن حالات میں چوری کے جرم میں مجرم اس سزا کا مستحق ہوگا۔ اور کن حالات میں اس سے کم سزا کا سزاوار۔ اس کے متعلق فقہ اور روایات دونوں میں تفصیلی

Marfat.com

مباحث موجود ہیں۔ روایات (مسلم اور بخاری) میں ہے کہ دینار سے کم کی چوری میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ فقہ میں اس کو نصاب کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک نصاب ایک دینار ہے۔ اور بعض کے نزدیک ایک ربع (چوتھائی) دینار۔ یہ تو رہا مقدار کا سوال۔ اب لیجئے احوال وظروف کو۔ فقہ کی رو سے چور کو اس وقت تک قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی جب تک اس نے مال کسی محفوظ جگہ سے نہ چرایا ہو۔

سارق کسے کہتے ہیں؟

نسائی کی ایک روایت ہے کہ حضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ جو جانور پہاڑوں پر چرتے پھرتے ہوں ان کی چوری کی بابت کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایسا جانور چرا لے تو وہ جانور اور اس جانور جیسا ایک اور جانور پیش کرے، اور اسے کوڑوں کی سزا دی جائے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ جو شخص بھوکا ہو۔ وہ اگر اپنی ضرورت کے مطابق کسی درخت سے پھل توڑ کر کھا لے (بشرطیکہ ساتھ باندھ کر نہ لے جائے) تو اس پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور اگر کچھ ساتھ لے جائے تو اس کا دگنا معاوضہ اور کوڑوں کی سزا ہوگی۔ اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے زمانۂ قحط میں روٹی چرا کر کھانے والے کو سارق نہیں ٹھہرایا ہے۔ امام ابن حزم ایسے مواقع کے متعلق یہاں تک کہتے ہیں کہ جب غرباء پر ایسا وقت آ جائے اور دولت مند اس اضطرار کا احساس نہ کریں تو بھوکے غریبوں کو اجازت ہے کہ ان لوگوں کو لوٹ کر اپنی خوراک حاصل کر لیں۔ اگر اس کشمکش میں غریب مارا جائے۔ تو اس کے قاتل پر اس کا خون بہا ہوگا

اور اگر امیر مارا جائے۔ تو اس امیر پر خدا کی لعنت ہوگی۔ غریب قاتل پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا
"مال محفوظ" کی شرط کے متعلق ایک لطیفہ بھی سنیئے۔ جب فقہ کا قانون بنا تو
(جن دلوں سے تقویٰ اٹھ چکا تھا انھوں نے) اس قانون سے بچ نکلنے کے حیلے بھی وضع
کرنے شروع کردیئے، اسے کتاب الحیل کہتے ہیں۔ یہ وہی قانونی موشگافیاں اور لفظی ذہب
کاریاں ہیں جو بالعموم وکلاء کی روزی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

ایک شرعی حیلہ

کتاب الحیل میں ہے کہ ایک شخص اور اس کا بیٹا چوری کرنے گئے
انھوں نے نقب لگائی اور مال چرایا۔ اس کے بعد گرفتار
ہوگئے اور سرقہ کا جرم ثابت ہوگیا۔ اب وہ حیلہ سنیئے جس سے قطع ید کی سزا سے بچنے
کی تدبیر نکالی گئی۔ باپ نے کہا کہ میں نے مکان میں نقب لگائی تھی لیکن مال نہیں اٹھایا
تھا۔ لہٰذا سارق نہیں ہوں۔ بیٹے نے کہا کہ مال بے شک میں نے اٹھایا تھا لیکن ایسے
مکان سے اٹھایا تھا جس میں نقب لگی تھی۔ اس لئے وہ مال "مال محفوظ" نہیں تھا۔
میں بھی سارق نہیں ہوں۔

"قانون" کی رو سے دونوں کا جواب دعوے درست تھا۔ اس لئے سرقہ کی
حد کسی پر بھی عائد نہیں کی جاسکتی۔

غور کیجئے! ملوکیت کی لعنتیں کس انداز سے رگ و پے میں سرایت کرجاتی ہیں جب
اسلامی نظام کا مقصد "انسان سازی" تھا۔ تو اس وقت کیفیت یہ تھی کہ ایک عورت سے
بستی سے دور خلوت میں ایک فاحش جرم صادر ہوگیا۔ وہ خود عدالت میں آگئی۔ اور اطرار

کیا کہ شریعت کے مطابق سزا دی جائے تاکہ وہ خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔ اور ایک زمانہ یہ تھا (کہ قانون بھی وہی تھا۔ اور ماننے والوں کے ایمان کے الفاظ بھی وہی لیکن روح بدل چکی تھی۔ اس لئے) جرم ثابت ہو چکنے کے بعد ایسے حیلے وضع کئے جاتے تھے جن سے قانون کی گرفت سے نکلا جا سکے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتے تھے کہ ارباب اقتدار اپنے مفاد و خواہشات کو بروئے کار لانے کے لئے ہر روز قانون بدلتے بدلواتے رہتے ہیں۔ اس لئے انھیں خیال پیدا ہوتا تھا کہ اگر ہم قانون بدلنے پر قادر نہیں۔ تو قانون سے بچنے کی راہیں کیوں نہ ڈھونڈھ نکالیں۔

بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا۔

آپ کا دوسرا سوال کوڑوں کے متعلق ہے۔ کوڑے اس قسم کے نہیں ہوتے تھے کہ سو کوڑوں سے انسان کی موت واقع ہو جائے۔ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ ملتا ہے کہ عہد حضرت عمرؓ میں ایک شخص نے دھوکے سے بیت المال سے کچھ روپیہ وصول کر لیا حضرت عمرؓ نے اس کو سو کوڑے لگوائے، پھر دوسرے دن مزید سو کوڑوں کی سزا دی اور پھر تیسرے دن سو کوڑے اور لگوائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوڑے ایسی چیز نہ تھے کہ جن سے موت واقع ہو جائے۔

باقی رہا یہ کہ زنا کی سزا سنگساری (رجم) کیا ہے ؟ سو ہر ج یہ ہے کہ جب خدا نے حکم دیدیا کہ اس کی سزا سو کوڑے ہے، تو کس کی مجال ہے کہ اس حکم کو کسی دوسرے حکم سے بدل دے !

حرمتِ شراب

ایک صاحب محترز ہیں۔

قرآن شریف میں شراب کے متعلق لفظ حرام کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ اکثر ان حضرات سے گفتگو ہوئی جو اس کی حمایت میں تھے۔ تو انھوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر شراب کو حرام کرنا مقصود ہوتا تو جیسا کہ زنا، سور اور مردار وغیرہ کے لئے صاف صاف کہدیا ہے۔ اس کے لئے بھی صاف لفظ حرام استعمال ہوتا بلکہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ "اس میں فائدے بھی ہیں۔ لیکن نقصانات فائدوں سے زیادہ ہیں۔ اس لئے تم پرہیز کرو۔ لفظ پرہیز کی تفسیر علما نے "حرام" کی ہے۔

مہربانی فرماکر آپ اس کی وضاحت کیجئے کہ قرآن کے ان الفاظ کا کیسا مفہوم لیا جائے؟

جواب۔

قرآن کریم میں (سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۹۱-۹۰) شراب (خمر) کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" ہے اور اس کے بعد

فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اس کے بعد ہے کہ شیطان اس کے ذریعہ چاہتا ہے کہ تم میں بغض اور عداوت پیدا ہو جائے۔ تم ذکر اللہ اور الصلوٰۃ سے رک جاؤ! اور اس کے بعد ہے فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے شراب کو

(۱) ناپاک کہا ہے

(۲) شیطانی عمل قرار دیا ہے

(۳) مانع فلاح و بہبود ٹھہرایا ہے

(۴) باہمی عداوت اور بغض کا موجب قرار دیا ہے

(۵) الصلوٰۃ اور ذکر اللہ کی راہیں مسدود کرنے والی بتایا ہے

اور (۶) اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا شراب کے بارے میں خدا کا منشاء اور اس کا حکم معلوم کرنے کے لئے اس سے زیادہ اور وضاحت کی بھی ضرورت ہے؟ ان چیزوں کے ہوتے ہوئے جو شخص شراب پیتا ہے وہ اگر خدا کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تو اور کیا کرتا ہے۔ اور جو شخص خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور شیطانی عمل کا اتباع۔ تو اسے آپ حزب اللہ (خدا کی پارٹی) میں شامل کریں گے یا حزب الشیطان (شیطان کی پارٹی) میں؟ واضح رہے کہ قرآن نے ان دو پارٹیوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل قرار دیا ہے۔ کیا شراب کی ممانعت کے لئے یہ تصریحات کافی نہیں! لفظ حرام کی بحث تو ذرا آگے چل کر آئے گی۔ یہاں اتنا سمجھ رکھئے کہ کسی کام سے اجتناب

کا حکم تو ایک طرف رہا۔ جن چیزوں کے متعلق اللہ نے کہا ہے کہ لا تقربوھا ہے (ان کے قریب مت جاؤ) ان کاموں کو کرنے والا بھی قانون خداوندی کی رو سے مجرم اور انہیں جائز سمجھنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

اب رہا یہ کہ قرآن کریم نے بعض چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ بعض کے متعلق کہا ہے کہ وہ اثم ہیں عدوان ہیں۔ بعض کے متعلق کہا ہے کہ ان سے مجتنب رہو وغیر ذلک، تو اس امتیاز کا مطلب کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ قانون کی رو سے مختلف جرموں کی سزائیں مختلف ہوتی ہیں، یہ امتیازات قانونی سزاؤں کے متعلق ہیں۔ جب اسلامی قانون کو مرتب کیا جائے تو اس وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ فلاں جرم کو قرآن نے کس درجہ میں رکھا ہے، اور اسی درجہ کے مطابق اس کی سزا مقرر کی جائے گی

سزا کا فلسفہ

سزا کا فلسفہ ایک اہم موضوع ہے، اور مفصل گفتگو کا محتاج۔ جس کے لئے نہ یہ محل مناسب ہے اور نہ سردست گنجائش۔ لیکن مختصراً اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مختلف جرائم کا ایک اثر تو معاشرہ پر پڑتا ہے۔ اور ایک انسانی سیرت پر۔ جہاں تک معاشری اثرات کا تعلق ہے اس کے لئے قانون میں سزائیں تجویز کی جاتی ہیں۔ لیکن جہاں تک ان اثرات کا تعلق ہے۔ جو خود سیرت انسانی پر مترتب ہوتے ہیں۔ وہ ان سزاؤں سے زائل نہیں ہوتے۔ ان کے زائل کرنے کے اور طریقے ہیں۔ وہ طریقے بھی قانون خداوندی میں مذکور ہیں۔ اور ان میں "باطنیت" کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ لیکن بہرحال وہ طریقے الگ ہیں۔ اگر کسی معاشرہ میں کسی ایسے عمل کو جرم نہیں قرار دیا گیا جس سے قرآن نے روکا ہے

Marfat.com

تو اس فعل کا مرتکب معاشرتی سزا سے تو بچ جائے گا۔ لیکن جو اثرات اس کی سیرت پر مترتب ہوئے ہیں اس سے وہ کسی حالت میں بچ نہیں سکتا کہ یہ اثرات قانون مکافات عمل کے ماتحت مترتب ہوتے ہیں۔ اور وہ قانون اٹل اور غیر متبدل ہے یہی کیفیت حسن عمل کی ہے۔ ایک تو ان کے وہ خوشگوار نتائج ہیں جو معاشرے میں نمودار ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کا اثر انسانی سیرت پر مترتب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جس معاشرہ کا نظام اسلامی ہو گا۔ اس میں کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس کا اثر صرف انسانی سیرت پر مترتب ہو اور اس کے خوشگوار نتائج معاشرہ میں نمودار نہ ہوں۔ اسلامی نظام میں انسان کی داخلی اور خارجی بالیدگیاں ساتھ کے ساتھ نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

اعمال کی اجزاء کے یہی دو پہلو ہیں جنھیں قرآن نے نہایت لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ بعض جگہ وہ کہتا ہے جزآءً بما کانوا تعملون یعنی وہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہیں اس سے مفہوم ہے اعمال کے وہ نتائج جو خارجی طور پر مترتب ہوتے ہیں اور کہیں وہ کہتا ہے اعمال جو اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ مثلاً ہماری روزمرہ کی دنیا میں دیکھئے۔ ہم کسی شخص کو کسی ایسی جگہ بھیجتے ہیں جو دو میل کے فاصلہ پر ہے، اس کے معاوضہ میں اسے ایک روپیہ دیتے ہیں۔ اس کے لئے اس دو میل کے سفر میں اپنا کوئی مقصد نہیں۔ اس کے اس عمل کا معاوضہ وہ روپیہ ہے۔ جو ہم نے اسے دیا ہے۔ دوسری طرف ایک شخص صبح کو سیر کے لئے جاتا ہے اور دو میل کا چکر کاٹ کر واپس آتا ہے۔ تاکہ اس کی صحت ٹھیک رہے۔ اس کے لئے یہ دو میل کا سفر اپنی جزا آپ ہے۔

یہ چند باتیں محض سرسری طور پر سمجھانے کی خاطر لکھ دی گئی ہیں۔ ورنہ جیسا کہ پہلے

Marfat.com

لکھا جا چکا ہے۔ جزا اور سزا کا فلسفہ یعنی قرآنی قانون مکافات عمل ایک الگ موضوع ہے، تفصیل طلب۔

بہرحال جہاں تک اس بات کا تعلق ہے۔ جس کے متعلق پوچھا گیا ہے اس کے متعلق پھر سمجھ لیجئے کہ ہر وہ شے جس سے باز رہنے کا حکم قرآن میں دیدیا گیا ہے۔ خواہ اس کے لئے الفاظ کوئی بھی استعمال کیوں نہ کئے گئے ہوں، اس کا ارتکاب خدا کی معصیت (نافرمانبرداری) ہے۔ اور اسے جائز سمجھنا یا یہ سمجھنا کہ اس سے کچھ ہرج واقعہ نہیں ہوتا۔ خدا کے قانون سے انکار ہے۔ اور خدا کے قانون سے انکار کا نام کفر ہے

اجتناب کا حکم باقی رہا یہ کہ قرآن نے خمر اور میسرہ (شراب اور قمار بازی) کے متعلق کہا ہے کہ ان دونوں میں منافع بھی ہیں اور اثم بھی۔ لیکن ان کا اثم ان کے منافع سے زیادہ ہے، تو اس سے بعض لوگ یہ دلیل لایا کرتے ہیں کہ شراب یا قمار بازی اس حالت میں ناجائز ہے۔ جب ان کا نقصان ان کے نفع سے بڑھ جائے۔ لیکن اگر ان کا نفع ان کے نقصان سے پر غالب رہے، تو ان میں کوئی ہرج نہیں۔ سو واضح رہے کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ شراب کے نقصانات سے بچو۔ اس نے کہا کہ شراب سے مجتنب رہو، یعنی اس نے یہ چیز بطور ایک امر واقعہ کے بیان کی ہے کہ ان چیزوں میں فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن اس کے بعد یہ نہیں کہا کہ تم ایسا انداز اختیار کرو کہ جس سے فائدے ہی فائدے ہوں نقصان نہ ہو یا نقصان ہو تو کم۔ اس نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں کچھ فائدے بھی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ان کے نقصان بہر نوع دبہرحال فائدوں

سے زیادہ ہیں۔ اور اس کے بعد مستقل طور پر یہ حکم دیدیا کہ ان سے اجتناب کرو۔ یہ شیطانی اعمال ہیں، اس لئے قرآن کا حکم یہی رہا کہ یہ شیطانی اعمال ہیں۔ ان سے بچو، یہ نہیں کہ ان کے نقصانات سے بچو۔

چونکہ ایک بات سامنے آگئی ہے۔ اس لئے جی نہیں چاہتا کہ اسے چھوڑ کر سلسلۂ کلام ختم کردیا جائے۔ قرآن نے کہا ہے کہ خمر اور میسرہ میں "اثم کبیر" ہے۔ اثم کے معنی غور طلب ہیں۔ اسلام نام ہے اس جماعتی زندگی کا۔ جس میں افراد ملت ایک دوسرے سے ہم آہنگ باہوں میں باہیں ڈال کر قدم ملائے ہوئے جانب منزل رواں دواں بڑھتے چلے جاتے ہیں

یا ایھا الذین امنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔

(اے افراد جمیعۃ اسلامیہ، خود ثابت قدم رہو، اور ربط باہمی سے دوسروں کی ثابت قدمی کا ذریعہ بنو۔ اور اس طرح سب مل کر ایک منظم طریقہ سے قانون خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کرو۔ تاکہ تمہاری محنتیں بارآور ہوں۔)

لہٰذا اس نظام میں جماعت سے الگ ہوجانا جرم عظیم ہے "تسالم" کے معنی گھوڑوں کا باہمی قدم ملا کر چلنا ہے، جماعت کی صف سے الگ ہونے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یا نظم وضبط (قانون خداوندی) سے سرکشی اختیار کرکے آگے نکل جانا اسے "عدوان" کہتے ہیں۔ یا ضعف و ناتوانی، سستی اور کاہلی۔ گراں باری اور زمین گیری تساہل اور تکاسل کی وجہ سے پیچھے رہ جانا۔ اسے اثم کہا جاتا ہے۔ اثم اس اونٹنی کو کہتے

ہیں۔ جو تساہل اور تکاسل یا ضعف و اضمحلال کی وجہ سے قافلہ سے پیچھے رہ جائے۔

خمر ہر اس شے کو کہتے ہیں۔ جو قوائے عقلیہ کو مضمحل کر دے (خمر اس چادر کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو ڈھانپ دے) اور میسرہ ہر وہ مال ہے جو بلا محنت اور مشقت آسانی (دیڑ) سے ہاتھ آجائے۔ اور اس طرح انسان کے قوائے عملیہ کو معطل کر دے۔ لہذا خمر اور میسرہ کا لازمی نتیجہ قوائے عقلیہ اور عملیہ میں ضعف اور اضمحلال ہے جس کی وجہ سے انسان جماعتی نظام کے ساتھ نہیں چل سکتا، پیچھے رہ جاتا ہے، اس زندگی کو قرآن نے مترفین کی زندگی کہا ہے۔ اور مترفین کی جو خصوصیات قرآن نے بیان کی ہیں اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے قوائے عقلیہ اس درجہ مفلوج ہو چکے ہوں کہ وہ حقائق پر غور کرنے کی بجائے تقلیدی روش کو ہی محفوظ مسلک سمجھیں، اور جن کے قوائے عملیہ اس طرح معطل ہو چکے ہوں کہ وہ دوسری کی کمائی پر گزارہ کریں۔ بہر حال یہ ایک ضمنی چیز تھی۔ جو سامنے آگئی۔ اور جس کی طرف محض چند اشارات کر دیئے گئے۔ ورنہ یہ اجمال خود ایک بڑی تفصیل کا متقاضی ہے۔

(س) شراب کا استعمال بطور دوائی

پچھلے دسمبر میں ہمارے باب المراسلات کے تحت امتناع شراب کے قرآنی حکم کی توضیح کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں مقامی میڈیکل کالج کے ایک طالب علم نے لکھا ہے کہ شراب کئی دواؤں کا جزو ہے۔ اور وہ دوائیں کئی امراض میں مفید اور مجرب ثابت ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ پوچھتے

Marfat.com

ہیں کہ کیا شراب کا یہ استعمال جائز ہے یا نہیں۔

جواب۔

اس قسم کے استفسارات ہمارے پاس اکثر و بیشتر آتے رہتے ہیں اور ہم ان کا جواب دینے میں تامل برتتے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ ہمارے تصور کے مطابق دین کوئی ذاتی شے نہیں۔ یہ ایک اجتماعی نظام ہے۔ لہذا اجتماعی نظام سے متعلق امور کا فیصلہ مفتیانہ حیثیت سے نہیں کیا جاتا۔ قانونی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اسلامی حکومت میں ان کا استعمال قانونی جرم بھی ہوتا ہے۔ جب وہ حکومت اس کے متعلق قانون مرتب کرے گی تو وہ اس جرم سے متعلق تمام تفاصیل۔ اس کے تضمنات، اس کے عواقب اور مخصوص حالات میں مستثنیات وغیرہ سب کا ذکر کرے گی۔ اس کے بعد اس جرم کے متعلق ان تمام امور کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ قرآن نے اضطراری حالت میں حرام اشیاء کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ اضطراری حالت کسے کہتے ہیں؟ اس حالت میں ممنوع اشیاء کا استعمال کس حد تک جائز ہوگا؟ وغیرہ۔ یہ تمام امور بھی قانون سے متعلق ہیں۔ اور قانون ہی اس کا صحیح صحیح تعین کرے گا۔ اس میں نہ کسی فرد سے فتوے مانگنے کی ضرورت ہوگی۔ اور نہ کسی کو فتوے دینے کا حق ہی ہوگا۔ بجز ان ذمہ دار لوگوں کے جن کو خود حکومت نے ان کاموں کے لئے مامور کیا ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں زیر نظر استفسار کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ البتہ اس کے بعد سوال یہ

Marfat.com

پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی جگہ اسلامی قانون رائج نہ ہو تو انفرادی طور پر ان احکام کی پابندی کس طرح کی جائے۔ سو اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا دیا جا سکتا ہے کہ ان امور کی پابندی اپنے اپنے طور پر کی جائے۔ شراب کی ممانعت کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں، اس کی اجازت اضطراری حالت ہی میں دی جا سکتی ہے۔ بیماری کی حالت، اضطراری حالت ہو سکتی ہے لیکن اس کا فیصلہ کہ کس بیماری اور بیماری کی کس حالت میں شراب کا یا کسی ایسی دوائی کا جس میں شراب کی آمیزش ہو، استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔

(س) رجم

قرآن کریم میں زنا کی سزا سو کوڑے مذکور ہیں۔ لونڈی اور غلام کے لئے اس کے نصف۔ لیکن شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے رجم (سنگسار) کی سزا بتائی جاتی ہے۔ رجم کا نصف کس طرح سے ہوگا؟

جواب۔

قرآن کریم میں زنا کی سزا رجم (سنگسار) کہیں نہیں آئی۔ نہ شادی شدہ کے لئے، نہ غیر شادی شدہ کے لئے۔ سنگسار کی سزا بعد کی وضع کردہ ہے۔ اور اسے منسوب کیا جاتا ہے حضور رسالت مآب کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ (معاذ اللہ) قرآن کے احکام کے خلاف بھی فیصلے دیا کرتے تھے۔ کیا عرض کیا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے دین میں کیا کیا کچھ داخل کر لیا ہے۔ اور پھر ان چیزوں کو کس قدر مقدس بنا

Marfat.com

دیا گیا ہے۔!

(س) آیۂ رجم

ایک صاحب لکھتے ہیں۔

نومبر کے طلوعِ اسلام میں آپ نے صحیح بخاری کی ایک روایت نقل کی ہے۔ کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں قرآن میں ایک آیت موجود تھی جس میں زانی کو سنگسار کرنے کا حکم تھا۔ اور اس کے بعد وہ آیت قرآن میں نہیں رہی۔ اسے پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بات تو بہت دور تک پہونچ رہی ہے۔ کیا اس موضوع پر ہماری تفسیر کی کتابوں میں کوئی بحث ہوئی ہے، اسے ذرا تفصیل سے لکھئے مجھے تو اس دن سے نیند نہیں آتی۔

جواب۔

اس روایت کو پڑھ کر آپ کی نیند کا اچاٹ ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ ہر سعید روح پر یہی کیفیت گزرے گی۔ ابھی تو آپ نے صرف ایک روایت دیکھی ہے۔ اگر آپ کہیں روایات کی ان تمام کتابوں کو دیکھ لیں۔ تو معلوم آپ پر کیا گزرے! اس موضوع پر ہماری کتب تفسیر میں لمبی چوڑی بحثیں موجود ہیں۔ اور انھوں نے بڑے شد و مد سے "ثابت کیا ہے!" کہ واقعی قرآن کریم میں اس قسم کی آیت موجود تھی۔ اور وہ اب قرآن میں نہیں۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر (جس کا شمار بلند پایہ تفاسیر میں ہوتا ہے) سورۂ نور کی آیت متعلقہ زنا کے ضمن میں حسب ذیل تصریحات موجود ہیں۔

Marfat.com

موطا مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا۔ اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کی۔ یاد کی۔ اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضور کے زمانے میں بھی رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد بھی رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانے گذرنے کے بعد کوئی یہ کہنے لگے۔ کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضہ کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا چھوڑ کر مر جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق حق ہے۔ اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ جبکہ اسکے زنا پر کوئی شرعی ثبوت یا حمل موجود ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مطول بو دیر مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ نے لکھ دیا۔ تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا۔ جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں رجم کا ذکر کیا۔ اور فرمایا رجم ضروری ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود

Marfat.com

میں سے ایک ہے۔ خود حضورؐ نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی۔ تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت رجم لکھ دیتا۔ عمر بن خطاب عبداللہ بن عوف۔ اور فلاں اور فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں۔ جو رجم کو اور شفاعت کو اور عذاب قبر کو جھٹلائیں گے۔ اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم سے اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہو گئے ہوں۔ مسند احمد نے لکھا ہے کہ امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا رجم کے حکم کے انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا۔ الخ۔ امام ترمذی بھی اسے لائے ہیں۔ اور اسے صحیح کہا ہے ابو الیعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت زید بن ثابت بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زناکاری کریں۔ تو انہیں ضرور رجم کر دو۔ مروان نے کہا کہ پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا۔؟ فرمایا سنو ہم میں جب اس کا ذکر چلا۔ تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہاری تشفی کر دیتا ہوں کہ ایک شخص نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ آپ

رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ اب تو میں اسے لکھ نہیں سکتا۔ یا اسی کے مثل۔ یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔ پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی۔ پھر تلاوت میں منسوخ ہو گئی۔ اور حکم باقی رہا۔ واللہ اعلم۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی بیوی کے رجم کا حکم دیا۔ جس نے اپنے ملازم سے بدکاری کرائی تھی۔ اسی طرح حضورؐ نے ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اور ایک غامدیہ عورت کو رجم کرایا۔ ان سب واقعات میں یہ مذکور نہیں کہ رجم سے پہلے آپ نے انہیں کوڑے بھی لگوائے ہوں۔ بلکہ ان سب صحیح اور صاف حدیثوں میں صرف رجم کا ذکر ہے کسی میں بھی کوڑوں کا بیان نہیں۔ اسی لئے جمہور علماء اسلام کا یہی مذہب ہے۔ ابو حنیفہ مالک شافعی رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں، امام احمدؒ فرماتے ہیں پہلے اسے کوڑے مارنے چاہئیں پھر رجم کرنا چاہئے تاکہ قرآن و حدیث دونوں پر عمل ہو جائے جیسے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب آپ کے پاس سراحہ لائی گئی۔ جو شادی شدہ عورت تھی اور زناکاری میں آئی تھی۔ تو آپ نے جمعرات کے دن کوڑے لگوائے۔ اور جمعہ کے دن سنگسار کرا دیا۔ اور فرمایا کہ کتاب اللہ پر عمل کر کے میں نے کوڑے پٹوائے۔ اور سنت رسول اللہ پر عمل کر کے سنگسار کرایا۔ مسند احمد سنن اربعہ اور مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمایا میری بات سن لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے رستہ نکال دیا۔ کنوارا کنواری کے ساتھ زنا کرے تو سو کوڑے، اور سال بھر کی جلاوطنی اور شادی شدہ کے ساتھ کرے تو رجم۔

ملاحظہ فرما لیا آپ نے اسلاف کا تفسیری بیان؟ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ وہ آیت جس میں زنا کی سزا سنگساری تھی۔ کہاں چلی گئی اور جب آیت ہی نہیں رہی تو اس کا حکم کیسے باقی رہ گیا۔ لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ قرآن میں بیشتر آیات ایسی ہیں۔ جن کی تلاوت تو کی جاتی ہے لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ حکم بعض دوسری آیات سے منسوخ سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات احادیث بھی قرآن کا حکم منسوخ کر دیتی ہیں۔ اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں۔ کہ جو قرآن میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ یعنی ان کی تلاوت منسوخ ہو گئی ہے۔ اور حکم باقی ہے۔

آپ شاید ہنسیں گے کہ ہم یہ کس قسم کی باتیں لکھ رہے ہیں۔ لیکن ہنسئے نہیں بلکہ روئیے اس قوم کی حالت پر جس میں ہزار برس سے یہ عقائد مسلسل چلے آرہے ہوں۔ اور جو شخص ان کے خلاف آواز اٹھائے، اسے خارج از اسلام ٹھہرا دیا جائے۔ باقی رہا یہ کہ "بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے"۔ سو مولوی کو اس سے کیا غرض کہ بات کہاں تک پہونچ جاتی ہے۔ اس نے اشخاص کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ اسے صرف اس سے غرض ہے کہ اس کے معبود محفوظ رہیں۔ خواہ ان کی حفاظت میں خدا۔ رسول۔ قرآن۔ دین۔ علم۔ عقل سب کے

سب سیلاب کی نذر ہو جائیں۔ اور ان معبودوں کی حفاظت بھی وہ ان کے لئے نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے کرتا ہے کہ ان کی حفاظت میں خود اس کی حفاظت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر مندر میں بت باقی نہ رہے۔ تو برہمن کو کوئی نہ پوچھے گا۔

کس قدر تلخ ہیں یہ حقیقتیں لیکن انھیں بالآخر کب تک چھپایا جا سکیگا؟

(س) میسرہ

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ گھوڑ دوڑ Races میں جو لوگ بازی لگاتے ہیں اس کی بابت کیا حکم ہے؟ ایک دوسرے صاحب پوچھتے ہیں کہ آجکل یہ جو عام رواج ہوتا جا رہا ہے کہ انعامی طریق کے ٹکٹ پر لاٹری ڈالتے ہیں۔ اور پھر کسی بڑے معزز لیڈر سے لاٹری نکلوا کر اشیائے متعلقہ تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے؟

جواب۔

بازی لگانا۔ خواہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں ہو۔ خواہ کھانے کی میز پر برج BRidge کے نام سے قماربازی میں داخل ہیں۔ جسے قرآن میسرہ کہتا ہے۔ اور رجس من عمل الشیطان قرار دے کر اس سے اجتناب کا حکم دیتا ہے (۵/۹) باقی رہا قرعہ اندازی کے ذریعہ لاٹری نکالنا۔ سو یہ بعینہ وہ شکل ہے۔ جسے ایام جاہلیت میں میسر کہتے تھے۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے گوشت کے حصے کر لیتے۔ پھر دس تیر لیکر انھیں اسی طرح مخلوط کر دیتے۔ جس طرح لاٹری کے ٹکڑوں کو

Marfat.com

باہم گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ پھر ایک حکم کے ذریعہ تیروں سے نمبر نکالتے۔ اور اس کے مطابق گوشت کی تقسیم کرتے۔ جس کا نمبر خالی نکلتا اسے تمام گوشت کی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ سو یہ چیز نہ صرف اپنی اصل کے اعتبار سے بلکہ ٹکنیک کی رو سے بھی بالکل وہی ہے جسے آجکل قرعہ اندازی یا سے لاٹری نکالنا کہتے ہیں۔ اسی قسم کے اور تیر یا پانسے ہوتے تھے جنہیں ازلام کہا جاتا تھا۔ ان سے بھی چیزوں کی تقسیم کیا کرتے یا فال لیا کرتے تھے (دیکھئے $\frac{5}{3}$ اور $\frac{5}{90}$) لیکن آجکل ہماری حالت یہ ہے کہ پانسوں سے پیسوں کا جوا کھیلنے والے سوسائٹی میں جواری کہلاتے ہیں، اور آئے دن پولیس ان کے جوئے خانوں پر چھاپے مارتی رہتی ہے۔ لیکن گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں یا برج کی میز پر ہزاروں روپے سے وہی کچھ کرنے والے سوسائٹی میں سب سے معتبر شمار کئے جاتے ہیں، اور قرعہ اندازی سے لاٹریاں نکالنا تو ایسا مقدس طریق قرار پا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا "اسلامی" اجتماع ہوتا ہوگا جس میں لاٹری کے ذریعہ جاذبیت نہ پیدا کی جائے، اور یہ متبرک رسم مبارک ہاتھوں سے سرانجام نہ دلائی جائے۔ قمار بازی کے یہ تمام انداز ہماری مہذب سوسائٹی کے فیشن میں داخل ہیں، اور ان کے خلاف لب کشائی کرنے والا "دقیانوسی"! لیکن ان مہذب جواریوں کو یہ کون بتائے کہ نام بدل دینے سے اشیاء کی حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔ شراب، شراب ہی رہتی ہے خواہ اسے Drinks کہہ کر ہی کیوں نہ پکارا جائے۔ اور جوا، جوا ہی ہوتا ہے۔ خواہ اسے برج یا لاٹری کے نام کیوں نہ دے دیئے جائیں۔

Marfat.com

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ جس طرح قرآن نے شراب کے لئے خمر کا لفظ استعمال کر کے ہر اس چیز سے اجتناب کا حکم دیدیا جس سے عقل پر پردہ پڑ جائے (خمر کے معنی ڈھانپنے کا کپڑا یا اوڑھنی ہے) اسی طرح اس نے میسرہ کے لفظ سے ایک بہت بڑے اصول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میسرہ کا مادہ یُسر ہے۔ اور یسر کے معنی آسانی ہیں۔ لہذا میسرہ ہر وہ مال ہے۔ جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ قماربازی تو اس کی ایک شکل ہے۔ باقی تفصیل آپ خود سمجھ لیجئے۔

Marfat.com

شب برات

"شب برات کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے؟ یہ کیا تقریب ہے؟ اسے لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

جواب۔

یہ تقریب کسی واقعہ کی یاد میں نہیں منائی جاتی۔ بعض روایات میں اس رات کی فضیلتوں کا ذکر ہے بس یہی اس کی سند[1] ہے۔ لیکن مولوی صاحبان سے پوچھئے تو وہ اسے لیلۃ القدر بیان کرتے ہیں۔ چند سال ادھر کا ذکر ہے۔ دہلی ریڈیو سے ایک بہت بڑے مولانا اپنی تقریر میں شب برات کے متعلق قرآنی سند بیان فرما رہے تھے۔ اور وہ سند تھی۔ سورۂ دخان کی یہ آیت کہ فیہا یفرق کل امر حکیم ۴۴/۴ اس رات ہر ایک حکمت والا معاملہ فیصل کر دیا گیا۔ اس "قرآنی سند" کے بعد انھوں نے تفصیلاً بتایا کہ اس رات کس طرح آنے والے سال کے لئے لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سورۂ دخان میں یہ آیات یوں ہیں۔

---

[1] یہ روایتیں وضعی اور ناقابل اعتماد ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "مقام حدیث" شائع کردہ۔ طلوع اسلام

انا انزلنه فی لیلة مبارکة انا کنا منذرین ہ

فیھا یفرق کل امر حکیم (۴۴ ۔ ۳ ۔ ۴)

ہم نے قرآن کو ایک بابرکت رات میں اتارا ہے۔ ہم ہمیشہ (وحی کے ذریعہ قوموں کو) ڈراتے رہے ہیں (وہ بابرکت رات) جس میں ہر ایک حکمت والا معاملہ فیصل کر دیا گیا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ اس رات کا ذکر ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ لیلۃ القدر کہا گیا ہے انا انزلنہ فی لیلة القدر اور قرآن کے نزول کی ابتداء رمضان میں ہوئی تھی۔ شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن لہذا اس سے واضح ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے مہینے میں آئے گی اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی تھی۔ لیکن ہم ہیں کہ پہلے شعبان کے مہینے میں لیلۃ القدر (شب برات) مناتے ہیں۔ اور پھر رمضان کے آخری عشرہ میں بھی اس کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ غور کیجئے ایک رسم کی گرفت کس قدر سخت ہوتی ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے اس رسم کے ضمن میں صرف ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ بالآخر یہ کچھ کیوں کیا جاتا ہے۔ اتنا سوچنا تو ایک طرف یہاں تو یہ حالت ہے کہ جنگ کے زمانہ میں جب خوراک کی کمی کی وجہ سے میدہ اور سوجی کمیاب ہو گئی تھی۔ تو مسلمانوں نے حکومت کو خاص طور پر متنبہ کیا تھا کہ اگر شب برات پر میدہ اور سوجی مہیا کرنے کا انتظام نہ کیا گیا۔ تو اسے "مداخلت فی الدین" سمجھا جائے گا۔ چنانچہ کراچی

میں اس مرتبہ خاص طور پر میدہ اور سوجی اور زائد چینی بہم پہونچانے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ "اسلامی حکومت" کی برکات کا احساس ہو جائے۔

کیا سچ کہا ہے حکیم الامت نے کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی!
یہ امت روایات میں کھو گئی!

(س) **شب برات** ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ شب برات کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے؟ اس کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟

جواب۔

شب برات کے متعلق اس سے پہلے بھی طلوع اسلام میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ تہوار نہ تو کسی واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی مذہبی حیثیت ہے۔ بس ایک بھیڑ چال ہے جو صدیوں سے چلی آرہی ہے اور کسی کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ ذرا کھڑا ہو کر سوچے کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، اور کیوں ہو رہا ہے۔ البتہ اس سے اس حقیقت کی کھلی ہوئی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے خلاف عجمی سازشیں کس قدر کامیاب ہیں اور پروپیگنڈہ اگر منظم طریق پر کیا جائے تو وہ کیا سے کیا کچھ بنا دیتا ہے۔

---

(۱) نوشتہ جولائی ۱۹۴۹ء

Marfat.com

عجمی سازش۔ اساورہ

جب ایرانیوں کو مسلمانوں سے شکست ہوئی۔ تو وہ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ مسلمانوں سے میدان جنگ میں شکست تو کھا گئے لیکن انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس شکست کا انتقام اس طریق سے لیا جائے گا کہ اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے۔ ایرانی فوجوں میں شاہی جیش کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ اس جیش کا نام اساورہ تھا۔ اپنی شکست کے بعد اس جیش نے حضرت سعدؓ سے درخواست کی کہ اگر انھیں وہی مراعات دی جائیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں تو وہ مسلمان ہو کر اسلامی آبادیوں میں بس جانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ شرط منظور کر لی گئی اور وہ اس طرح بصرہ اور کوفہ وغیرہ بلاد اسلامیہ میں آبسے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے اس انتقام کی سازش شروع کی جس کی آگ ان کے دلوں میں سلگ رہی تھی۔ اس وقت اسلام اپنی اصلی شکل میں سیدھے سادھے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے موجود تھا۔ مسلمان اس ضابطۂ حیات پر ایمان رکھتے تھے اور اسے دنیا میں عملاً نافذ کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ کام کرنے والی قومیں باتیں کرنا نہیں جانتیں۔ اس لئے اس وقت تک مسلمان "باتوں" میں الجھے نہیں تھے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ان اساورہ نے یہی سوچا کہ اس "زندہ" قوم سے عمل چھڑانے کا طریقہ یہ ہے کہ انھیں باتوں میں الجھا دو۔ خیر و شر کا مسئلہ مجوسیت (ایران کے مذہب) کا بنیادی مسئلہ تھا

اسی مسئلہ پر تقدیر کے نظریہ کی عمارت متفرع ہوتی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اسی سوال کو چھیڑا۔ وہ جن مسلمانوں سے اسلام سیکھتے تھے۔ ان سے پوچھتے تھے کہ "اگر کائنات کا کوئی ذرہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا۔ تو انسان کے تمام اعمال بھی خدا کے حکم کے تحت ہی سرزد ہوں گے۔ اور اگر یہ سب کچھ خدا کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ تو پھر جزا اور سزا کا کیا سوال؟" مسلمانوں کی عملی قوم نے اس قسم کے سوالات کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا۔ اور یہ مجوسی معترضین اس فن میں طاق تھے۔ انھیں مجبوراً

تقدیر کا مسئلہ

ان باتوں کے متعلق سوچنا پڑا۔ اور ان کے اعتراضات کے منطقی جوابات تلاش کرنے پڑے۔ ان سوالات اور جوابات نے عقائد کی صورت اختیار کر لی، اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے قدری فرقہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس فرقہ کے بانی، معبد بن خالد جہنی کا اپنا اعتراف ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو اساورہ کے ایک شخص ابو یونس سے اخذ کیا تھا۔ قدریہ کا ردِ عمل جبریہ کی صورت میں رونما ہوا۔ اس طرح جب ایک مرتبہ فرقہ بندی کی ابتداء ہو گئی، تو اس کے بعد پھر چل سو چل۔ مجوسی اساورہ نے یہ سب کچھ اس خاموشی سے کیا کہ کوئی بھانپ ہی نہ سکا کہ اسلام کی گاڑی کس طرح دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ انھوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ اسے مسلمانوں میں جزوِ ایمان بنا دیا۔ چنانچہ ہمارے ایمان میں والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ کا جزو انہی کا داخل کیا ہوا ہے۔ اسی عقیدہ کو زیادہ گرہ گیر بنانے کے لئے انھوں نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ سال میں ایک رات ایسی آتی ہے۔ جس میں

آنے والے تمام سال کے معاملات طے کرکے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ فلاں شخص مرے گا اور فلاں کے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ فلاں کا رزق کھلے گا۔ فلاں کا بند ہوگا۔ یعنی محکمہ قضا و قدر ہر ایک کے حصے مقرر کرنے گا۔ اس رات کا نام "شب برات" رکھا گیا۔ برات کے معنی حصہ کے ہیں۔ یعنی حصے بٹنے کی رات" اب رہا اس کی سند کا سوال۔ سو اس کے لئے انھوں نے الگ انتظام کر رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے ہاں قرآن ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں ردوبدل اور حک و اضافہ ناممکن ہے۔ اس لئے انھوں نے پہلے یہ عقیدہ پھیلایا کہ دین سب کا سب قرآن ہی میں نہیں۔ قرآن کے ساتھ (مثلاً معہ) ایک اور چیز بھی ہے۔ اور وہ ہیں احادیث۔ احادیث کا کوئی مجموعہ رسول اللہ نے مرتب کرکے دیا نہ تھا کہ اس میں ردوبدل یا اضافہ کی گنجائش نہ ہوتی۔ سنی سنائی باتوں کو (رسول اللہ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال کے بعد) جمع کرنا شروع کیا اور ان کا نام رکھ دیا "سنت رسول اللہ" اب اس طرح کی پھیلی ہوئی باتوں میں نئی نئی باتیں شامل کردینا کون سا مشکل کام تھا۔ عربی کے چند فقرے وضع کئے۔ دو چار راویوں کا نام ان سے پہلے چپکایا۔ آخر میں لکھ دیا قال رسول اللہ بس حدیث تیار ہے۔ شب برات کی فضیلت میں بھی اسی قسم کی حدیثیں وضع کردی گئی ہیں۔ اس کے بعد اس عقیدہ کے عین دین بن جانے میں کون سی کسر رہ سکتی تھی؟ چنانچہ تذکرہ الموضوعات (شیخ محمد طاہر) میں ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں مثلاً ابوطالب مکی کی قوت القلوب یا ثعلبی وغیرہ کی تفسیروں سے جنہوں نے غلط فہمی سے نصف

مجوسیوں کی تقلید

شعبان کی رات کو شب قدر کر دیا۔ لوگوں نے صلوٰۃ الفیہ جاری کی۔ اور دس دس ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اور عید سے بھی زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے میلہ کی شکل اختیار کر لی۔ جس میں اس قدر فسق و فجور ہونے لگا کہ اولیاء اللہ بیابانوں میں نکل جاتے تھے اس خوف سے کہ کہیں اللہ کا قہر نازل ہو جائے۔ سب سے پہلے اس کا رواج بیت المقدس میں (۴۴۸ھ میں) ہوا پھر سارے شام و مصر میں پھیل گیا۔ آخر میں علما مصلحین نے توجہ کی۔ جن کی کوششوں سے یہ بدعت مٹ گئی۔ تاہم اس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آٹھویں صدی ہجری تک رہا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتداء برامکہ سے ہوتی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے۔ انھوں نے دین اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم تازہ کی۔ اس نے رفتہ رفتہ آتشبازی کی شکل اختیار کر لی جو مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔ یوں شب برات وجود میں آگئی۔ اب مسلمان ہزار برس سے مجوسیوں کے "نوروز" کے اس مثنیٰ کو عین اسلام سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اور اس کے نیچے آتشبازی سے ان کی آتش پرستی کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اتنا کہدے کہ خدا کے لئے ذرا سیلاب کی اس رو سے ہٹ کر سوچو تو سہی کہ بالآخر اس کی دینی حیثیت ہے کیا؟ تو اس کے خلاف کفر کے فتاویٰ شائع کر کے اس مجوسی سازش کی تقویت کا سامان بہم پہنچا دیا جاتا ہے۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا ۔ کہ افتاد است از بام بلندے

عید میلاد کی محفلیں

محترم عرشی صاحب کا خط! پولیس کے ایک جلسۂ میلاد میں مجھے بلایا گیا۔ میرے ساتھ دیوبند کے تعلیمیافتہ ایک نوجوان تھے۔

ہم جلسہ گاہ میں پہونچے تو دیکھا کہ پولیس کے چھوٹے۔ بڑے افسر اور ملازمین جمع ہیں نعت خوانی شروع ہے۔ ایک پنجابی نعت خواں کی نعت کا ایک شعر آپ بھی سنیئے۔ مسدس حالی کی بحر میں۔

خدا جس نوں پکڑے چھڑائے محمدؐ
محمدؐ دے پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکدا

یعنی خدا کی گرفت سے تو محمدؐ چھڑا سکتے ہیں۔ لیکن محمدؐ کی گرفت سے چھڑانے کی طاقت کسی میں نہیں۔

میرے سامنے قرآن مجید کی آیہ ذیل آ آکر ڈرا رہی تھی۔

اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِی النَّارِ

(اے پیغمبر) جو شخص آگ میں ہے کیا تو اسے چھڑا لیگا؟

اگر خدائے نباشد ز بندہ خوشنود!
شفاعت ہمہ پیغمبراں ندارد سود!

ایک مسلمان کلام اللہ کی توہین کر رہا ہے، اور سامنے بیٹھے ہوئے مسلمان

مرحبا جزاک اللہ کے نعرے لگائے ہیں۔

اس کے بعد ایک افسر صاحب تقریر کے لئے آگے بڑھے۔ انھوں نے چند منٹ انکسار میں صرف کئے۔ پھر منفردانہ انداز میں اصل موضوع شروع کیا۔ دوران تقریر میں ہر دو چار منٹ کے بعد فرماتے "درود پڑھو" حاضرین آہستہ پڑھتے۔ تو آپ فرماتے "بلند آواز میں پڑھو"

آپ کی پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کے تمام نکات میرے لئے بالکل نئے حقائق تھے۔ اس لئے میں نے ان نوادرات کو قلمبند کر لینا مناسب سمجھا۔ تاکہ مجھ جیسے ناواقفان اسرار مستفید ہو سکیں۔

میلادالنبی کی تقریر

محترم مقرر نے فرمایا۔

آج معشوق قدرت کی ظاہری دنیا میں تشریف آوری کا دن ہے ویسے تو آپ اس وقت بھی موجود تھے جب آدم کا پتلا پانی اور مٹی سے جدا نہیں ہوا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بادشاہ کی آمد سے پہلے سپاہی محل ورود کا معائنہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ پھر بڑے افسر۔ آخر میں پائیلٹ آتا ہے یہ سب تیاریاں اور احتیاطیں بادشاہ کی عظمت وشان کے مطابق سرانجام دی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضور معشوق قدرت کی آمد سے پہلے آدم علیہ السلام کی بعثت سپاہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا کہ جاؤ اور دیکھ کر آؤ کہ دنیا ہمارے معشوق کے استقبال

کے لئے آراستہ ہے یا نہیں؟ آدم کے دو بیٹوں میں کشت و خون کا واقعہ ہوا۔ زمین خون کے دھبوں سے داغدار ہو گئی۔ معشوق قدرت کی آمد رک گئی۔ آخر نوح علیہ السلام تشریف لائے۔ اور کئی ہزار[1] سال اسی کوشش میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ ساری زمین کو طوفان نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طرح ہابیل کے خون کے دھبے صفحۂ ارض سے دور ہو گئے۔ لیکن اب زمین ویران اور بے رونق تھی۔ اس وجہ سے معشوق قدرت کی تشریف آوری مناسب نہ سمجھی گئی۔ اس بے رونقی کو دور کرنے کے لئے سواران کشتی کی نسل کو ترقی دی گئی۔ اس دوران میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ انھوں نے آگ کو گلزار بنایا تاکہ معشوق قدرت تشریف لائے تو اس گل و گلزار سے لطف اندوز ہو۔ "درود پڑھو"[2]

سب کے بعد عیسیٰ علیہ السلام "پائیلٹ" کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اب زمین عروس نو کی طرح معشوق قدرت کے لئے آراستہ ہو چکی تھی۔ اور سراپا انتظار ہو رہی تھی۔ اس اضطراب دید کی حد یہ ہے کہ عیسیٰ کی ولادت کے لئے نہ باپ کی راہ دیکھی گئی۔ اور نہ ان کی وفات

---

[1] نقل مطابق اصل ہے۔ [2] اوپر کی عبارت میں کئی جگہ "درود پڑھو" آنا چاہیئے تھا۔ جو مجھے فراموش ہو گیا۔

کے لئے ملک الموت کا انتظار کیا گیا۔ ان لگے بندھے قاعدوں کو توڑ پھوڑ کر معجزانہ طور پر دنیا میں تشریف لے آئے۔ اور خارقانہ انداز میں ایک ہی جست لگا کر چرخ چہارم پر جا بیٹھے۔ اور اپنے بھیجنے والے کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔" درود پڑھو"

اس تمام بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بازار کائنات صرف معشوق قدرت کے لئے سجایا گیا ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

محمدؐ کی گر رونمائی نہ ہوتی ۔۔۔ قسم ہے خدا کی خدائی نہ ہوتی

سبحان اللہ، جزاک اللہ مرحبا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میری آنکھیں تو نہیں دل رو رہا تھا۔ میں حیران تھا۔ ہماری پولیس کو یہ اسلام سکھایا جا رہا ہے ابھی شام کو ایک عزیز جو ملٹری کے ڈاکٹر ہیں تشریف لائے اور انھوں نے اپنے جلسہ کی ایسی ہی کیفیت بیان کی۔ فرق یہ ہے کہ یہاں تقریر کرنے والے ایک افسر تھے، اور وہاں ایک مولوی صاحب۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہماری فوج کو بھی اسی قسم کا اسلام سکھایا جاتا ہے۔ میرے ساتھ جو دیوبندی نوجوان تھے۔ انھوں نے میرے تعجب کو بھی بھانپ لیا اور بتایا کہ یہ تقریر جو آپ نے آج سنی ہے۔ کوئی نئی چیز نہیں۔ بریلوی مولوی صاحب ہمیشہ اسی قسم کی تقریریں فرمایا کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ اور اس ملک کے کروڑوں مسلمان اس قسم کے مواعظ کو سننا ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔

مذکورہ تقریر کے بعد مجھے موقع دیا گیا۔ میں نے عرض کیا۔" اس وقت ہم بہت

Marfat.com

سے محسوس مسائل سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ان مسائل کا حل ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں تلاش کرنا ہے۔ آپ کی ذات مبارک بہت سی صفات کی جامع ہے۔ اور ہر ایک صفت ایک الگ نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپ بادشاہ

ہونا کیا چاہیئے؟

بھی ہیں۔ درویش بھی ہیں۔ سوداگر بھی ہیں۔ معلم و مبلغ بھی ہیں زاہد و عابد بھی ہیں اور سپہ سالار بھی ہیں۔ بے یار و مددگار بھی ہیں اور فاتح و ظفرمند بھی ہیں۔ باہمہ بھی ہیں اور بے ہمہ بھی۔ الغرض کسی قسم کا آدمی ہو وہ آپ کی سیرت پاک میں اپنے لئے نمونہ تلاش کر سکتا ہے۔ جو خوبیاں سابقہ انبیاء میں جزئی طور پر ملتی ہیں۔ وہ سب آپ میں ایک ہی جگہ جمع ہو گئیں ہیں۔ کہنے والے نے ٹھیک کہا ہے

حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، ید بیضا داری !
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری !

مسیحؑ کی زندگی میں بادشاہی کا نمونہ نہیں۔ سلیمان کے حالات میں درویشی نہیں۔ موسیٰ میں فتحمندی نہیں۔ وغیرہ ذالک۔ جس طرح قرآن میں تمام آسمانی کتابوں کا عطر آ گیا ہے۔ اور اس پر مزید بھی بہت کچھ ہے۔ اسی طرح آپ کی ذات میں تمام نبوتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ اب کسی گزشتہ و آئندہ نبی کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کے بعد آج تک جو متنبی قسم کے لوگ ہوئے ہیں۔ ان کو تو غلامی کی ذلت سے نکلنا بھی نصیب نہیں ہوا بلکہ بعض تو غلامی اور محکومی ہی کے مبلغ[۱] تھے۔

---

[۱]۔ یہ آخری فقرے وقت تحریر اضافہ کر رہا ہوں۔

ہمارا اجلاس ایک خاص طبقے کے لوگوں کا اجتماع ہے۔ اس طبقہ کے لئے آپ کی سیرت پاک سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس وقت دنیا میں بے شمار مذاہب ہیں۔ لیکن کثرت تین مذاہب کے پیرووں کی ہے۔ بدھ عیسائی اور مسلمان۔ ان میں ہر ایک گروہ کروڑوں کی تعداد میں پھیلا ہوا ہے۔ مقدم الذکر دونوں مذہبوں کے بانی تارک، راہب اور درویش قسم کے بزرگ تھے، ان کے مشاغل واعمال میں کوئی تنوع اور بوقلمونیاں نہیں۔ ہم کو ان سے ملائم اخلاق کا درس ملتا ہے۔ اور بس۔ پیغمبر اسلام کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک سپاہی کی حیثیت میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان کو آسمانی وحی سے حکم پہنچتا ہے کہ "جنگ کر، اس معاملہ میں تو اپنی ذات کا ذمہ دار ہے" جب آپ وردی پہنکر مسلح ہو جاتے ہیں تو آواز آتی ہے۔ کہ "اپنے ایمان لانے والوں کو بھی جنگ کی ترغیب دے" (۴/۸۵) یعنی محمدؐ اور اصحابِ محمدؐ سب مسلح ہو جائیں۔ سب سپاہی ہو جائیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ ہمارا دین ایک مقدس سپاہی سے شروع ہوا کہ اور ہمارے سلف صالحین سپاہی ہی تھے۔ خدا کے سپاہی۔ دین کے راستہ کی روکاوٹوں کو دور کرنے والے سپاہی۔ اگر وہ سپاہی نہ ہوتے۔ تو یہ دین مکہ کی گلیوں سے باہر نہ نکل سکتا۔ ہم جو یہاں بیٹھے ہیں کوئی کیشورام ہوتا کوئی کیکر سنگھ۔ یہ تلوار اور قرآن کی برکت ہے کہ ہم عبداللہ اور عبدالرحمٰن بنے بیٹھے ہیں۔ تلوار اور قرآن

این دو قوت حافظ یکدیگر اند کائنات زندگی را محور اند!

(اقبال)

سپاہیوں کو فخر کرنا چاہیئے کہ ان کا پیغمبر اسلام پہلا سپاہی تھا۔ اگر وہ تلوار اور قرآن کو ساتھ ساتھ رکھیں۔ تو وہی اپنے پیغمبر کے سچے پیرو ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ملکی دفاع کا ہے۔ ہماری دفاعی مساعی نہ حکومت پر احسان ہے نہ کسی اور پر۔ اسی سے ہمارے دین کی حفاظت ہوسکتی ہے۔ اسی سے ہم اپنی آئندہ نسلوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اسی سے ہماری بہو بیٹیوں اور بہوؤں کی آبرو بچ سکتی ہے۔ خدانخواستہ اگر ہم موجودہ آزادی کو منضبط نہ کر سکے اور اپنی بداطواریوں سے نااہل ثابت ہوئے۔ تو ہماری آئندہ نسلیں (اگر ہوئیں تو) ہم پر لعنت کریں گی کہ

ہمارے بڑوں کو ایک خطہ زمین مل گیا تھا۔ جس میں رہ کر وہ ہر طرح کی ترقی کر سکتے تھے۔ لیکن وہ نالائقیوں کی وجہ سے اسکو سنبھال نہ سکے

خدا وہ دن نہ لائے کہ یہ منحوس الفاظ پورے ہو جائیں۔ میں آپ کے سامنے دست بستہ اسی قرآن کا واسطہ دیکر عرض کرتا ہوں جو میرے ہاتھ میں ہے کہ اپنے آپ کو قرآن کے سانچے میں ڈھالیں۔ وہ ناہنجارانہ طور طریقے جو زمانۂ غلامی سے ہمیں ورثہ میں ملے ہیں انھیں ترک کردیں۔ نیک عملی اور راست روی اختیار کریں۔ اسی میں ملک کا بچاؤ ہے اور اسی میں ہماری فلاح و نجات ہے۔"

میں یہ تقریر کر کے رخصت ہوا۔ میرے بعد پھر وہی نعت خوانی شروع ہو گئی

"حسینوں کی بانکی ادا ہیں محمدؐ گنہگار کے بخشوا ہیں محمدؐ"

یہ نقل بھی مطابق اصل ہے۔ میں اسی وقت سے اس کرب میں مبتلا ہوں۔ کہ میری قوم کا انجام کیا ہوگا؟ یہ زہر قاتل جو دین کے نام پر ہمیں پلایا جا رہا ہے ہم اس سے اپنے آپ کو کس طرح بچا سکتے ہیں؟ اور جو شخص یہ زہر کا پیالہ پینے والوں کے لب سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کو کافر۔ بے دین۔ ملحد وغیرہ کے القاب وخطابات سے نوازا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں عوام تو خیر عوام ہیں ملٹری اور پولیس تو ملک وحکومت کی بنیادیں ہیں۔ انھیں تو اس مہلک وعظ وتبلیغ سے بچایا جائے۔ اور کوئی بھلے آدمی منتخب کر کے ان کی تعلیم دین کے لئے مقرر کئے جائیں۔ اور اس قسم کے خرافاتی واعظوں کی زبانوں پر کم از کم سرکاری محکموں میں تالا لگایا جائے۔

میرے خیال میں اس زہرناکی کا پہلا ذمہ دار وہ شخص ہے جس نے غیر قرآنی روایات کو دین میں داخل کیا۔

دل نے کانوں سے سنی۔ دل سے زباں تک پہنچی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہونچے

عرشی لاہور

جواب۔

محترم عرشی صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں صرف ایک مجلس عید میلاد کی روئیداد تحریر فرمائی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عید میلاد کی قریب قریب ہر مجلس میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ جو انھوں نے بیان فرمایا ہے۔ اس میں نہ ادفیسرز کی تخصیص ہے نہ

مولوی صاحبان کی۔ نہ بریلوی کی نہ دیوبندی کی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ عید میلاد النبی کی (سالانہ) تقریب پر پورے پاکستان میں جس قدر اہم مجالس ہوتی ہیں۔ اگر ان کی روئیداد یک جا شائع کر دی جائے۔ تو غیر مسلموں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے یہی ایک مجموعہ کافی ہو سکتا ہے! یہ اس ذات گرامی کی بعثتِ مقدسہ کی تقریب کے متعلق ہو رہا ہے۔ جو تمام نوع انسان کو خوشگواریوں اور کامرانیوں کی راہ دکھانے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

سرکاری میلہ

اس باب میں۔ اس سال ایک اور اہم چیز کا بھی اضافہ ہوا ہے اس سے پہلے مسلمان اس تقریب عالیہ میں جو کچھ کرتے تھے اس کے متعلق پھر بھی کہا جا سکتا تھا کہ یہ غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں ہیں مسلمانوں کا سمجھدار طبقہ ان لغویات کو صحیح نہیں مانتا۔ لیکن اس سال بحمد اللہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی طرف سے یہ تقریب مقدس سرکاری طور پر منائی گئی ہے۔ اگر آپ ان محافل کی روئیداد پڑھیں جنھیں اب "سرکاری" ہونے کا بھی شرف حاصل ہو چکا ہے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا انداز بھی ان مجالس سے کچھ مختلف نہ تھا جنھیں عامیانہ مجالس کہا جاتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ غیر مسلم اقوام ان چیزوں کو دیکھ کر ہمارے متعلق کیا رائے قائم کرتی ہوں گی۔ ہمارے متعلق وہ کیا رائے قائم کرتی ہیں۔ اس کا بھی زیادہ افسوس نہیں۔ سب سے بڑا رنج تو یہ ہے کہ اقوام عالم اس ذات اقدس و اعظم کے متعلق کیا رائے

Marfat.com

قائم کرتی ہوں گی جس کی بعثت کی تقریب اس طرح منائی جاتی ہے۔ اس سال عین اس تقریب سے متصل اقوام متحدہ کی طرف سے منعقد کردہ "حقوق انسانیت کا دن Human Rights' Day منایا گیا۔ ہمیں اقوام عالم کو بتانا یہ چاہیئے تھا کہ "حقوق انسانیت" کا دن منانا چاہتے ہو تو اس ذات گرامی کی بعثت کا دن مناؤ جس نے انسانوں کو سب سے پہلے یہ تصور دیا کہ انسان کے بہ حیثیت انسان کیا حقوق ہوتے ہیں؟ لیکن دوسروں پر کیا گلہ جب ہماری اپنی حالت یہ ہے کہ ہم نوع انسان کے اس محسن اعظمؐ کے ظہور کی تقریب" درود پڑھ پڑھ کے" (بلکہ گا گا کر) مناتے رہتے ہیں اور "حقوق انسانیت" کے سلسلہ میں اقوام متحدہ کا متعین کردہ دن مناتے ہیں۔ اے کاش مسلمان کو کوئی بتادے کہ

تو قدر خویش ندانی! بہا ز تو گیرد
دگرنہ لعل درخشندہ پارہ سنگ است

(س) **رحمۃ للعالمین** "طلوع اسلام" شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء میں آپ کا نشریہ بعنوان "رحمۃ للعالمین" شائع ہوا[1]۔ اس میں آپ نے رسول مقبولؐ کو نوع انسان کے لئے تو کما حقہٗ رحمت للعالمین ثابت کیا۔ لیکن "رحمت للعالمین" میں "عالمین" کا لفظ صرف نوع انسانی تک ہی محدود

---

[1] ان مضامین کا مجموعہ الگ شائع ہو رہا ہے۔

ہے یا اس کا اطلاق تمام کائنات پر ہوا ہے؟ اگر اس میں انسان کے علاوہ دیگر جملہ موجودات ومخلوقات بھی شامل ہیں۔ تو پھر براہ کرم مضمون کی افادیت کے پیش نظر اس نقطۂ نگاہ سے بھی اس پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں!

جواب۔

رسولوں کی بعثت ہمیشہ انسانوں کی طرف ہوتی ہے۔ قرآن میں اس کی صراحت (متعدد مقامات پر) موجود ہے۔ خود نبی اکرمؐ کو بھی تمام نوع انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اندریں حالات رسالتِ محمدؐ کی رحمت بھی انسانی دنیا کے لئے ہے۔ اس لئے عالمین میں انسانوں کے باہر کی دنیا شامل نہیں ہو سکتی۔

(س) کیا حضور کا سایہ نہ تھا؟ روایت ہے کہ حضورؐ کا سایہ نہ تھا۔ لیکن اس گنہگار کو اس میں تامل ہے۔ یعنی بشریت کے ساتھ سایہ نہ ہونا کیونکر ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عہدِ نبویؐ میں منکرین رسالت کے لئے ایک حجت ہوتا۔ یا پھر اس کی کوئی تاویل ہو گی کہ یہ صحابہ کرامؓ سے غائب ہو گا اور غیر صحابہ کے سامنے موجود۔ بہر حال آپ کے نزدیک یہ روایت کہاں تک معتبر ہے؟

جواب۔

ہمارے نزدیک تو معتبر خدا کی کتاب ہے جس میں ایک بار نہیں متعدد بار یہ صراحت موجود ہے کہ رسول اللہ کو قرآن کے سوا کوئی اور معجزہ نہیں دیا گیا لیکن

Marfat.com

مسلمانوں کے ذوق اعجوبہ پسندی نے اس قسم کے ہزاروں معجزات حضور کی طرف منسوب کر رکھے ہیں اور کتب روایات ان سے بھری پڑی ہوئی ہیں۔ قرآن کی صراحت کے بعد کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی (اس اجمال کی تفصیل کے لئے محترم پرویز صاحب کی کتاب معارف القرآن کی چوتھی جلد ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں معجزات پر عجیب و غریب بحث کی گئی ہے۔)

(س) رسول کریم صلعم کی شانِ اطہر میں سوءِ ادبی

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ آئے دن اخبارات میں کوئی نہ کوئی خبر اس قسم کی شائع ہوتی رہتی ہے۔ کہ فلاں عیسائی یا فلاں ہندو نے رسول کریم صلی اللہ وسلم کی شان میں گستاخی کے کلمات لکھے ہیں۔ ایسی خبر کے بعد چند روز کے لئے ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کا بدلہ خود لے لیا جاتا ہے۔ اور کبھی قانون کے ذریعے ایسی کتابوں یا رسالوں کو ضبط کرا دیا جاتا ہے پھر یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور مسلمان کسی ایسی خبر پر دوبارہ جاگ اٹھتا ہے۔ کیا کوئی ایسی تدبیر نہیں کی جا سکتی کہ اس قسم کی باتیں لکھی ہی نہ جائیں۔ تاکہ آئے دن ہمارے جذبات مجروح نہ ہوں۔

جواب۔

حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے خلاف دریدہ دہنی

ایک ایسی ننگ انسانیت گستاخی بلکہ شرف واحترام آدمیت کے خلاف جرم ہے جسے ہم عالم تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن ان باتوں کا سدباب ہمارے اور آپ کے جذبات سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ علامات مرض کی بجائے علت مرض کی تشخیص کی جائے۔ اور اس کے بعد اس کا علاج۔

سوال یہ ہے کہ نبی اکرم صلعم کی ذات گرامی کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یعنی کیا یہ لوگ اس قسم کے قصے یونہی از خود وضع کر کے شائع کر دیتے ہیں یا انہیں کہیں سے لیا جاتا ہے۔ یورپ کے مستشرقین کی کتابیں اس قسم کی لغویات سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ان لغویات کو از خود وضع کیا ہے۔ یا کہیں سے نقل کیا ہے آپ کے لئے شاید یہ چیز موجب استعجاب ہو کہ مستثنیات کے سوا اس قسم کی تمام لغویات وخرافات کا ماخذ خود ہمارے اپنے ہاں کی کتابیں ہیں۔ اور وہ کتابیں بھی بازاری قصے کہانیوں کی نہیں بلکہ وہ کتابیں جنہیں ہم ہزار برس سے سر پر اٹھائے سینوں سے لگائے پھر رہے ہیں۔ یعنی ہمارے ہاں کی احادیث اور تفاسیر کی کتابیں۔ تفاسیر کے متعلق تو پھر بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی عام انسان کے خیالات ہیں۔ لیکن احادیث کے متعلق تو ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ وہ خود رسالت مآب صلعم کے اقوال وافعال کا مجموعہ ہے۔ اگر آپ ان احادیث کے مجموعوں کو اٹھا کر دیکھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ ان میں وہ سب کچھ موجود ہے جنہیں ہم عیسائیوں اور ہندوؤں کی کتابوں اور رسالوں میں نقل شدہ دیکھ کر اس طرح

Marfat.com

آتش در پیراہن ہو جاتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر ہمارا خون کھولنا بجا ہے لیکن ہماری بدبختی یہی ہے کہ ہم ان کتابوں کو جن سے یہ خرافات لی جاتی ہیں اپنے ہاں کے مقدس ترین صحائف بلکہ من جانب اللہ وحی قرار دیتے ہیں۔ اور جب کوئی انہیں چیزوں کو اپنے ہاں نقل کر دیتا ہے تو اسے گردن زنی قرار دیتے ہیں۔ ہم اسے اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اسے آپ کبھی صحیح باور نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ آپ اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے ہاں کی ایسی برگزیدہ کتابوں میں اس قسم کی باتیں بھی لکھی ہوئی ہوں گی۔ اس کے سمجھانے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں کہ یا تو ہم اپنے ہاں ان چیزوں کو نقل کر کے دکھا دیں۔ لیکن اول تو ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ ان چیزوں کو جو حضور سرورِ کائنات صلعم کی ذاتِ اقدس کے خلاف ایسا کچھ کہہ رہی ہوں طلوعِ اسلام میں شائع کر دیں۔ اور اگر محض اس مقصد کی خاطر ان چیزوں کو پیش بھی کر دیا تو ہمیں خود اندیشہ ہے کہ اس سے عوام کے جذبات نہایت شدت سے مشتعل کر دیئے جائیں گے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو آپ از خود پڑھیں ہم آپ سے یہ التماس کرتے ہیں کہ آپ صرف ایک "بخاری شریف" ہی کو لیں۔ جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر دیکھیں کہ اس میں رسول اللہ صلعم کی شان کے خلاف کیا کیا کچھ لکھا ہے۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرمالیں کہ دیگر کتب احادیث اور تفاسیر میں کیا کیا کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس مرض کا علاج چور کی بجائے چور کی ماں کو مارنا ہے۔ جب تک آپ اپنے ہاں ان کتابوں کو علیٰ حالہ رائج رکھیں

صلہ۔ ان امور کی تفاصیل کے لئے دیکھئے "مقام حدیث" شائع کردہ طلوع اسلام

Marfat.com

گے اور انھیں مستند، معتبر، صحیح اور مقدس بیان کرتے رہیں گے۔ غیر مسلم اپنے ہاں ان چیزوں کو ... درج کر کے اسلام اور حضور رسالت مآب صلعم کے خلاف نفرت پھیلاتے رہیں گے۔ آپ اپنے گھر کو اس لغویت سے پاک کیجئے اور اس کے بعد ہر ایسے مصنف سے جو اس قسم کی لغویات اپنے ہاں لکھے پوچھئے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ کیا ہے۔ جب آپ کے ہاں کا مذہبی لٹریچر پاک اور صاف ہو جائے گا۔ تو پھر ایک دو نسل کے بعد اس قسم کے دریدہ دہن پیدا ہونے خود بخود بند ہو جائیں گے۔ مچھروں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ اپنے ماحول کی صفائی ہوتا ہے۔ خالی فلٹ چھڑکنا نہیں یہ کام درحقیقت اسلامی حکومت کی کرنے کا ہے کہ وہ ہمارے ہاں کی ان کتابوں کو ان خرافات سے پاک کر دیں جو دور اول کے یہود اور نصاریٰ اور مجوسیوں کی منظم سازش کے ذریعے ہمارے ہاں بار پا چکی ہیں۔ اس کام کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ جرأت وہی کر سکتا ہے جس کے اندر اتنی قوت ہو کہ وہ مذہبی پیشواؤں کے سہارے کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکے۔ اس باب میں ہم سر دست اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دیکھیں:

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر!

(س) **رسول اللہ صلعم اور غیب کا علم** ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ آپ

Marfat.com

نے طلوع اسلام میں احادیث کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس سے آپ نے یہ نہیں سوچا کہ رسول اللہ صلعم کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو جاتا ہے کہ آپ کو غیب کا علم نہیں تھا مثلاً آپ نے ایک جگہ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب رسول اللہ صلعم کے پاس کوئی مقدمہ آتا اور فریق متعلقہ اس میں غلط بیانی سے کام لیتا۔ تو حضور اس بیان کو پیش نظر رکھ کر ہی فیصلہ فرما دیتے۔ گویا آپ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ! اس سے رسول اللہ کی شان بہت گر جاتی ہے۔ یہ احادیث کو نہ ماننے کا نتیجہ ہے۔

جواب۔

ہمارے یہ بھائی اپنے غصے میں یہ بھی بھول گئے کہ وہ جس بات پر اعتراض کر رہے ہیں۔ وہ خود حدیث ہی میں ہے اور ہم نے اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ یعنی یہ حدیث میں موجود ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جب تم میرے پاس مقدمات لاتے ہو تو میں تمہارے بیانات کے مطابق ہی فیصلہ دیتا ہوں۔ اگر کوئی شخص جھوٹ بول کر مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیتا ہے تو وہ جہنم کی آگ ہے۔ یہ حدیث ہمارے نزدیک اس لئے صحیح ماننے کے قابل ہے کہ اس کا مضمون قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن میں بار بار رسول اللہ صلعم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ مجھے غیب کا علم نہیں بجز ان باتوں کے کہ جو قرآن کے اندر درج ہیں۔

باقی رہا یہ کہ رسول اللہ صلعم کی شان مبارک احادیث کو حضورؐ کے ارشادات مان کر بڑھتی ہے۔ یا گر جاتی ہے۔ اس کا اندازہ دی کر سکتے ہیں۔ حنفول نے احادیث

Marfat.com

مطالعہ کیا ہے۔ اگر آپ سنن کی تاب دیکھیں تو ہم اسی باب میں (یعنی رسول اللہ کے فیصلوں کے باب میں) صرف ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔ اس سے آپ خود جس نتیجہ پر پہنچیں ہمارے لئے وہی کافی ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم باب برأت حرم النبی صلعم میں موجود ہے اور اس کا متن یہ ہے۔

مقطوع الذکر والی روایت

ان رجلا کان یتھم بام ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلی اذھب فاضرب عنقہ۔ فاتاہ علی فاذا ھو فی رکی یتبرد فیھا فقال لہ علی اخرج فناولہ یدہ فاخرجہ فاذا ھو مجبوبٌ لیس لہ ذکرٌ فکف علیؓ عنہ ثم اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ انہ لمجبوبٌ مالہٗ ذکرٌ (عن انس)

ترجمہ اس کا یہ ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص پر رسول اللہ صلعم کی ام ولد سے زنا کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جاؤ اور اس شخص کو قتل کر دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس پہونچے۔ تو وہ کنوئیں میں نہا رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ باہر نکلو اس نے اپنا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیدیا۔ حضرت علیؓ نے اس کو نکال کر دیکھا۔ تو وہ ہیجڑہ تھا

Marfat.com

اور اس کا عضو مخصوص ہی نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے اس کے قتل سے ہاتھ روک لیا۔ اور رسول اللہ صلعم سے آکر کہا کہ وہ تو ہیجڑہ ہے۔ اور اس کا عضو مخصوص ہی نہیں۔

ہم نے سینے پر پتھر رکھ کر مسلم شریف کی اس حدیث مقدس کو نقل کیا ہے۔ اور اگر اس کے بعد بھی ہمارا بھائی یہ سمجھتا رہے کہ احادیث کو دین ماننے سے رسول اللہ صلعم کی شان بڑھتی ہے۔ تو ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔ یہودیوں اور مجوسیوں کی یہ سازش بڑی گہری تھی۔ اور آج ہمارا مولوی صاحبان کا طبقہ اس سازش کو زندہ، پائندہ اور تابندہ رکھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کے پاس اسلاف کے نام کی نسبتیں بھی ہیں۔ وضع قطع کا تقدس بھی ہے۔ عوام کی نجات کے لئے سرٹیفکٹ بھی ہیں۔ اور اس لئے ان کے جذبات کے سیلاب کی قوت بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ارباب دولت و ثروت کی حمایت بھی جو سمجھتے ہیں کہ علماء کی خدمت کرنے سے نجات مل جاتی ہے۔ ان کے خلاف طلوع اسلام کے پاس ان حربوں میں سے کوئی حربہ بھی نہیں

گھر میں اب گھر کے سوا کچھ اور نہیں

Marfat.com

حفاظت قرآن

ایک صاحب لکھتے ہیں۔

روایات واحادیث کے متعلق جو مسلک آپ نے اختیار فرمایا ہے۔ اسے دیکھ کر چند سوالات دل میں پیدا ہو رہے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔ امید ہے طلوع اسلام کے صفحات میں مدلل جوابات سے ممنون و مطمئن فرمائیں گے

احادیث و روایات کو ظنی تسلیم کر لینے کے بعد کون سے قطعی ذرائع ہیں۔ جن کی بنا پر ہم موجودہ قرآن کی قطعیت تسلیم کریں جبکہ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ

(۱) علماء حنفیہ و شافعیہ آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ بسم اللہ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں حالانکہ یہ اختلاف انکار قرآن پر منتج ہوتا ہے۔

(۲) موجودہ مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مرتب کردہ ہے۔ اور اعراب حجاج جیسے خونخوار نے لگائے ہیں۔

(۳) ابن مسعودؓ سے سورۃ واللیل کے الفاظ وما خلق الذکر والانثیٰ کی جگہ دوسری طرح منقول ہیں۔

(۴) تلاوت کے سات مختلف طریقے مروج ہیں۔ جن میں بسا اوقات مفہوم د

Marfat.com

معانی میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔

(۵) آیات منسوخ التلاوۃ کو آج تک علمائے اسلام مانتے چلے آرہے ہیں۔

ان وجوہات کے پیش نظر ہم کن وجوہ پر مصحف عثمانی کو قطعی اور کلام الٰہی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اشکال جس طرح قائلین احادیث پر وارد ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ بھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔ محض عقلی دلائل کافی نہیں ہیں۔ ورنہ کل کوئی دوسرا محقق آپ کے نظریات کو عقلی دلائل سے باطل ٹھہرائے گا۔ اور اسی طرح یہ ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہوگا۔ امید ہے کہ آپ مجھے کافی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

جواب۔

مستفسر صاحب کے اس خط میں چند ایک باتیں وضاحت طلب تھیں۔ اور ہم چاہتے تھے کہ اس کا جواب لکھنے سے پہلے ان باتوں کی وضاحت ان سے کرا لی جائے لیکن انہوں نے اپنے خط میں اپنا پتہ نہیں لکھا۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ ان کے استفسارات سے جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں۔ اسی کے مطابق اس کا جواب لکھ دیا جائے۔

تاریخ کی اہمیت

اصل مقصود پر آنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی صحیح پوزیشن کے متعلق مختصراً کچھ عرض کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ تاریخ کسی خاص زمانہ کے احوال و واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ تاریخ کو قرآن نے بڑی اہمیت دی ہے۔ اس لئے کہ اس سے نوع انسانی کے فکری اور تمدنی ارتقاء کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جب کسی قوم نے

Marfat.com

فلاں نہج کی زندگی اختیار کی۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور اگر آج ہم بھی اسی نہج کی زندگی اختیار کریں گے۔ تو اسی قسم کا نتیجہ ہمارے سامنے آئے گا۔ لیکن تاریخ کی تدوین مختلف حالات اور اثرات کے ماتحت ہوتی چلی آئی ہے۔ اور یہ حقیقت تاریخ کے طالبعلموں سے پوشیدہ نہیں کہ تاریخ صحیح اور غلط دونوں قسم کے واقعات اور تاثرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ارباب تاریخ نے انسان کی تاریخی یادداشتوں کو پرکھنے کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ اور ان کی تحقیقی کاوشوں میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ تاریخی یادداشتیں یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ارباب تحقیق جو کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ یہی ہے کہ کسی زمانہ کے متعلق جو دلائل و شواہد (Circumstancial Evidence) میسر آسکیں ان کی روشنی میں تاریخی یادداشتوں کو پرکھ کر اتنا کہہ سکیں کہ فلاں بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ ان دلائل و شواہد میں بعض باتیں دوسروں کی نسبت زیادہ قابل اعتماد سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً مصریات میں جب کسی بادشاہ کی ممی مل جاتی ہے اور اس کے ساتھ کچھ تختیاں بھی ہوتی ہیں۔ جن پر اس بادشاہ اور اس کے عہد کے متعلق یادداشتیں منقوش ہوتی ہیں۔ تو ارباب تاریخ اس عہد کی تاریخی یادداشتوں کو ان تختیوں کے نوشتوں کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور ان تختیوں کو زیادہ قابل اعتماد سمجھ کر انہی کو معیار تصدیق و تکذیب قرار دیتے ہیں۔

اس باب میں مسلمانوں کی کیفیت کچھ مختلف ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسی

Marfat.com

تختی (لوحِ محفوظ) موجود ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور اپنی محفوظ شکل میں جس میں کسی ایک لفظ کا بھی ردوبدل نہیں ہوا ہے ہمارے پاس موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہمارے پاس اس قسم کا یقینی ذریعۂ علم موجود ہے۔ تو تاریخ کا جس قدر حصہ اس یقینی معیار کے مطابق پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے اسے یقینی معیار قرار دینا ہمارے ایمان کا تقاضہ ہے۔ ہم جب کہتے ہیں کہ روایات کو (جو ہمارے ایک دور کی تاریخی یادداشتیں ہیں،) قرآن کے یقینی معیار پر پرکھنا ضروری ہے۔ تو اس سے مفہوم یہی ہوتا ہے۔

تاریخ اور دین

دین کا معاملہ عام تاریخ سے بالکل مختلف ہے۔ عام تاریخ میں جس چیز کو آج صحیح مانا جاتا ہے۔ وہ کل کو غلط ثابت ہو سکتی ہے لیکن دین کے لئے ہر وقت یقینی ہونا نہایت ضروری ہے۔ دین کی مشینری اسی صورت میں اپنے صحیح نتائج مرتب کر سکتی ہے۔ جبکہ اس کا ایک ایک پرزہ اصلی (Original) اور یقینی Genuine ہو اگر اس میں کوئی ایک پرزہ بھی ایسا ہے جس کے متعلق ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ اصلی اور حقیقی ہے یا نہیں۔ تو ہم اس مشینری کے صحیح نتائج پر کبھی پورا اعتماد نہیں کر سکتے دین کی مشینری کے نتائج تو وہ ہیں۔ جو پوری کی پوری جماعت بلکہ تمام نوع انسانی کی موجودہ اور آنے والی زندگی، دونوں کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہیں۔ یہی وہ وجہ جس کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ دین میں حجت (یعنی دلیل واقعی) وہی چیز ہو سکتی

Marfat.com

ہے جو قطعی اور یقینی ہو۔ جو چیز قطعی اور یقینی نہ ہو۔ اسے ظنی کہا جاتا ہے۔ اور کوئی ظنی شے دین میں حجت قرار نہیں پا سکتی۔

قرآن کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ یہ قطعی اور یقینی چیز ہے۔ ہمارے اس دعوے کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اور

حفاظت قرآن

اس ایمان کی بنیاد یہ ہے کہ خود قرآن کریم میں یہ موجود ہے کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ اور صاف لفظوں میں فرمایا ہے انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (۱۵/۹) ہم نے قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور اسی کی تفسیر میں دوسری جگہ ہے۔ لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ (۴۱/۴۲) "باطل نہ اس کے آگے سے اس کے پاس پھٹکتا ہے۔ نہ پیچھے سے۔" لہٰذا ایک مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ قرآن اپنی محفوظ شکل میں چلا آرہا ہے۔ اور اسی طرح سے محفوظ شکل میں آگے چلا جائیگا۔ اگر کوئی تاریخی یادداشت اس دعوے کے خلاف جاتی ہو یا اس میں شک و شبہ پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ تو ایک مسلمان بلا ادنیٰ تامل اسے رد کر دے گا۔ کیونکہ قرآن کی محفوظیت خود اللہ نے اپنے ذمے رکھی ہے۔ اور اللہ کی اس ذمہ داری پر ہمارا ایمان ہے۔

لیکن ایک غیر مسلم ہمارے اس دعوے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے اطمینان کے لئے اور قسم کے دلائل چاہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم

Marfat.com

اپنے اس دعوے کے اثبات میں اس قسم کے دلائل بھی پیش کریں۔ جنھیں ارباب تاریخ اپنے ہاں معیار قرار دیتے ہیں۔ اس باب میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ یہ کوئی نیا سوال نہیں ہے۔ جو آج ہی سامنے آیا ہو۔ مغرب کے مورخین از خود صدیوں سے اس کی تحقیق کر رہے ہیں کہ جو قرآن اس وقت مسلمانوں کے پاس ہے۔ اس میں اور اس قرآن میں جو رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو دیا تھا کوئی اختلاف ہے یا نہیں۔ اور وہ اپنی پوری تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ" اگرچہ تمام مذہبی صحائف خدا کی طرف سے نازل ہوئے۔ تاہم صرف قرآن کریم ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے۔ جس میں ذرا بھی رد و بدل نہیں ہوا۔ اور وہ اپنی اصلی شکل

غیر مسلم مؤرخین کا اعتراف

میں محفوظ ہے۔" Baroness Margarett Stein

چنانچہ مسلمان مورخین کے علاوہ غیر مسلم مورخین نے بھی اس کی تحقیق کی کہ قرآن کے وہ اصلی نسخے جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں بھیجے گئے تھے۔ کب تک اور کہاں کہاں موجود تھے۔ اور اب تک موجود ہیں۔ دمشق کے نسخے کے متعلق یہ تحقیق ہے کہ وہ سلطان عبدالحمید کے زمانے تک جامع دمشق میں موجود تھا۔ لیکن جب وہ مسجد جل گئی۔ تو اس میں یہ مصحف بھی جل گیا۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں اس مصحف کے نسخے آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھے۔ بصرہ یا کوفہ کا نسخہ مختلف مقامات میں پھرتا پھراتا ۱۹۲۳ء میں روس کے قدیم پایہ تخت ماسکو میں پہنچا۔ کہتے ہیں کہ یہ نسخہ امیر تیمور کے زمانے میں ابوبکر

Marfat.com

الشاشی کی طرف سے حضرت شیخ عبداللہ کے مرقد پر رکھ دیا گیا۔ جہاں سے وہ بالشویکوں کے ہاتھ میں آیا۔ خلافت کے ترکی میں منتقل ہوتے وقت سلطان سلیم اول کے حوالے جو تبرکات کئے گئے تھے۔ ان میں قرآن کا ایک نسخہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں کا۔ ایک حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا۔ اور ایک حضرت زین العابدینؒ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا بھی تھا۔ جو اب تک وہاں موجود ہے۔ حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا ایک نسخہ جس پر ان کے دستخط بھی ثبت ہیں مشہد میں موجود ہے۔ ایران کے عجائب خانہ آثار قدیمہ میں ایک نسخہ حضرت زید بن ثابتؓ، ایک نسخہ حضرت عثمانؓ ایک نسخہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا موجود ہے۔ نیز ایک نسخہ حضرت امام حسنؓ اور ایک نسخہ حضرت سجادؒ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا بھی۔

کتابی شکل میں قرآن کے علاوہ قرآن ہی سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ قرآن کو لفظاً لفظاً یاد کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ قرآن میں ہے بل ھو اٰیٰت بینٰت فی صدور الذین اوتوا العلم (۲۹/۴۸) بلکہ یہ کھلی کھلی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔ اور تاریخ سے ہمیں اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہؐ حفاظ سے بار بار قرآن کو سنا کرتے تھے۔ اور خود بھی ان کو سناتے تھے اس مقصد کے لئے مکہ میں حضرت ارقم مخزومی کا مکان اس مقصد کے لئے متعین تھا اور مدینہ میں مسجد نبوی کا صفہ عام طور پر حفاظ کا مرکز تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے وقت سینکڑوں حفاظ موجود تھے۔ اور ان میں سے متعدد ایسے تھے۔ جن کے حفظ کی سند خود رسول اللہؐ نے عطا فرمائی تھی۔

Marfat.com

یہ خیال جو عام طور پر مروج ہے کہ موجودہ مصحف حضرت عثمانؓ کا مرتب فرمودہ ہے اور آپ ہی جامع القرآن ہیں صحیح نہیں ہے۔ قرآن اپنی کتابی شکل میں خود رسول اللہؐ کے زمانے میں موجود تھا۔ قرآن اپنے آپ کو بار بار کتاب کہتا ہے۔ حتیٰ کہ سورۂ بقر کی پہلی آیت ہی ذالک الکتاب لاریب فیہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور عرب اس لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے تھے جو مدون شکل میں سلی ہوئی صورت میں موجود ہوتی تھی (اس دعوے کے تاریخی شواہد کہ قرآن موجودہ کتابی شکل میں خود رسول اللہؐ کے سامنے موجود تھا۔ تفصیل چاہتے ہیں۔ اور انھیں تفصیلی طور پر کسی دوسرے وقت پیش کیا جائے گا) حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے متعدد نسخے لکھوائے۔ اور انھیں مملکت کے مختلف صوبوں میں بھیجدیا تاکہ اس بارے میں مملکت کے دور دراز گوشوں میں کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔ اور اختلاف کی صورت میں ان مستند نسخوں کی طرف رجوع کر لیا جائے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ قرآن کے ناشر تھے۔ نہ کہ جامع القرآن۔

اس تمہیدی پس منظر کی روشنی میں مستفسر کے استفسارات پر غور کیجئے۔ ان کا حل خود بخود مل جائے گا۔ ہم مختصراً ان کا جواب ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" خود قرآن کے اندر موجود ہے (دیکھئے سورہ نمل آیت ۳۰)

اب یہ بحث کہ یہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے۔ یا نہیں ایک فنی بحث Technical

---

صا اس کے بعد ستمبر ۱۹۵۰ء کے طلوع اسلام میں جمع قرآن سے متعلق نہایت تفصیلی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

Discussion رہ جاتی ہے۔

(۲) ہم یہ بتا چکے ہیں کہ موجودہ مصحف حضرت عثمانؓ کا مرتب کردہ نہیں ہے۔ باقی رہا اعراب کا سوال۔ سو عربوں کے لئے اعراب کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بلا اعراب قرآن کو اس طرح پڑھتے تھے جیسے غیر عرب اعراب کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ اعراب غیر عربوں کی سہولت کے لئے لگا دیئے گئے۔ قرآن کی یہ خدمت اگر حجاج کے حق میں جاتی ہے تو اس کی "خونخواری" اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

(۳) قرآن کی حفاظت پر ایمان رکھنے کے بعد اس قسم کی روایتیں جن میں یہ پایا جاتا ہے کہ فلاں صحابی کی روایت کے مطابق فلاں سورت میں مختلف الفاظ منقول ہیں۔ اس سازش کی کھلی ہوئی غمازی کرتی ہیں۔ جو دین میں فتنہ برپا کرنے کے لئے عمل میں آئی تھی۔ اور جس کے پاس موثر حربہ روایات سازی تھا۔[۱]

(۴) "تلاوت" سے غالباً آپ کی مراد قرات ہے۔ قرات کے اختلاف کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ عربوں کے مختلف قبیلے بعض حروف کو مختلف طریق سے ادا کیا کرتے تھے۔ مثلاً بعض قبیلے ک کو گ بولتے تھے۔ اسی طرح جس طرح آج لاہور کے اصلی باشندے ڑ کو ر کہتے ہیں (یعنی چھڑی کو چھری) اور ہوشیار پور کے رہنے والے واہیات کو باہیات کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ حیدرآبادی قرآن کو خران بولتے ہیں۔ اس

---

[۱] اس موضوع پر طلوع اسلام میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے کہ یہ سب روایات وضعی ہیں۔

Marfat.com

اختلاف کے متعلق ابن خلدون نے لکھا ہے۔

قرات کے اختلافات قرآن کے تواتر میں مطلق خلل انداز نہیں ہو سکے
کیونکہ ان اختلافات کا مرجع کیفیت ادائے حروف تھا۔

تجوید قرآن کے ان اختلافات کو بھی بعد میں روک دیا گیا۔ اور قاریوں کو اسی قرات کا پابند کر دیا گیا جو رسول اللہ کی قرات کے مطابق تھی۔ اس کے علاوہ روایات میں جو کچھ ملتا ہے وہ وضعی ہے اور اگر "تلاوت" سے مستفسر کی مراد فن تجوید ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو کس لے پر پڑھا جائے۔ اللہ نے قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ تجوید کی فنی موشگافیاں زمانہ بعد کی ایجادات ہیں۔ مثلاً ترعید (آواز میں لرزہ پیدا کر کے پڑھنا) ترقیص (جھٹکا دے کر پڑھنا) تحزین (اس طرح پڑھنا کہ معلوم ہو کہ پڑھنے والا اب روتا ہے) یہ قرآن پڑھنے کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن ان میں بعض اوقات الفاظ کی صحت کو فن کی پابندیوں پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ قرآن کی تجوید نہیں تحریف ہے۔

(۵) آیات منسوخ التلاوۃ کا عقیدہ (یعنی یہ عقیدہ کہ قرآن میں آیت تو موجود نہیں لیکن اس کا حکم موجود ہے) اسی سازش کا نتیجہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب نازل کرے۔ جس کی کچھ آیتیں اس سے گر کر الگ ہو گئی ہوں۔ اور وہ خدا ان آیتوں کو اس کتاب میں تو داخل نہ کرے۔ لیکن ان کا حکم بحال رکھے۔ علمائے اسلام اگر اس قسم کی باتوں کو تسلیم کرنے

چلے آ رہے ہیں۔ تو اس کی ذمہ داری قرآن پر عاید نہیں ہوتی۔

قرآن کریم کی حفاظت

طلوع اسلام کی ستمبر کی اشاعت میں ہم نے ایک صاحب کے استفسار کے جواب میں تفصیلاً لکھا تھا کہ جو قرآن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا تھا۔ وہی قرآن ہمارے پاس حرفاً حرفاً بغیر کسی تغیر و تبدل کے موجود ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم نے قرآن کریم کی وہ داخلی شہادت پیش کی تھی۔ جس کی رو سے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ پر لی ہے۔ اور خارجی شہادت کے طور پر ہم نے یہ لکھا تھا کہ غیر مسلم مورخین کی تحقیقات اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت بھی دنیا میں قرآن کے ایسے نسخے موجود ہیں۔ جو عہد صحابہ کرام میں مرتب ہوئے تھے۔ اس کے جواب میں انہی صاحب نے مردان سے حسب ذیل خط ارسال فرمایا ہے۔

"آپ کے مؤقر مجلہ طلوع اسلام کے ماہ ستمبر کے پرچہ میں حفاظت قرآن کے سلسلہ میں اپنے سوالات کے جوابات نظر سے گذرے۔ آپ کی اس ذرہ نوازی کا ممنون ہوں۔ لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ جوابات میرے سوالات سے متعلق ہونے کے باوجود غیر متعلق ہیں شاید آپ نے میری معروضات کو غور سے نہیں دیکھا۔ یا میری تحریر اظہار مدعا کے لئے ناکافی تھی۔ بہر حال جوابات کے متعلق میری معروضات یہ

ہیں۔ آپ نے تمہیدی سطور میں تاریخ کے متعلق جو رائے زنی فرمائی ہے۔ اس سے مجھے کلی طور پر اتفاق ہے۔ لیکن حفاظت قرآن کے متعلق جن دو پہلو سے آپ نے بحث کی ہے وہ محل نظر ہے۔

میرا مطالبہ قرآن کی قطعیت ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی اور قطعی دلیل کا تھا۔ لیکن آپ نے انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون ٥ اور لا یاتیه الباطل من بین یدیه الخ سے استشہاد فرمایا ہے۔ جس چیز کی قطعیت اور ثبوت کے متعلق میں نے آپ سے دریافت کیا ہے۔ اس کو دلیل بنا کر پیش کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ آگے چل کر تاریخ کی روشنی میں آپ نے قرآن کی قطعیت ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ حالانکہ انہی سطور میں تاریخ کے متعلق آپ کا فتویٰ یہ ہے کہ — "لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ تاریخی یادداشتیں یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتیں" اب آپ ہی فرمائیں کہ جو چیز خود غیر قطعی ہو وہ دوسری چیز کی قطعیت کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے؟

جواب۔

ہم اس بحث کو دوبارہ چھیڑنا ضروری نہیں سمجھتے تھے کیونکہ قرآن کے محفوظ ہونے میں کسی کو کلام نہیں مسلم اور غیر مسلم دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں

Marfat.com

لیکن محترم مستفسر نے اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس کا جواب ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے قرآنی دعوے کا ثبوت تاریخ سے دیا ہے۔ اور چونکہ تاریخ ایک ظنی چیز ہے۔ اس لئے اس کی رو سے قرآنی دعوے کو یقینی طور پر ثابت شدہ کیسے مان لیا جائے۔

دعوی زیر نظر کا ثبوت طلب کرنے والے یا مسلمان ہو سکتے ہیں یا غیر مسلم۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ قرآن اور تاریخ کے باہمی تعلق کی پوزیشن یہ ہے۔ کہ

(۱) قرآن کا ہر دعویٰ یقینی ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔

(۲) اس ایمان کی بنا پر تاریخ کی وہ شہادتیں جو قرآن کے دعوؤں کی تائید کرتی ہیں۔ قابل قبول ہو سکتی ہیں۔

(۳) جو تاریخی شہادتیں قرآن کے خلاف جائیں گی وہ مسترد کر دی جائینگی۔

مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ وہ فرعون جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں غرق ہوا تھا اس کی لاش محفوظ کر لی گئی تھی۔ ایک عرصہ تک تاریخ نہ صرف فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کے ہی خلاف تھی بلکہ اکثر مؤرخین ساری کی ساری داستان بنی اسرائیل ہی سے انکار کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اسے ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ حضرت یوسفؑ کبھی مصر گئے یا مصر میں قحط پڑا اور اس کا انسداد حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ ہم تاریخ کی ان تمام شہادتوں کو ناقابل قبول قرار دیتے تھے۔ اس لئے کہ یہ قرآن کے خلاف تھیں ہم کہتے تھے کہ ہنوز تاریخی انکشافات نامکمل ہیں۔ یقینی

Marfat.com

انکشافات قرآن کے دعووں کی تصدیق کریں گے۔ بعد میں مصر کی اثری تحقیقات کا زمانہ آیا اور زمین نے اپنے سینہ میں دبی ہوئی یادگاروں کو اس انداز سے اگلا کہ قرآن کے ایک ایک دعوے کی تصدیق مجسم پیکروں کی شکل میں سامنے آگئی۔ یہی حال ہماری اپنے ہاں کی تاریخ کا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خدا کے سچے نبی تھے۔ اور کوئی نبی جھوٹا نہیں ہوتا۔ بخاری میں اس قسم کی حدیثیں ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا اور جھوٹ بھی ایسا کہ جس کے احساس سے وہ خدا کے سامنے جانے سے شرمائیں گے۔ ہم بحیثیت مسلمان ایک ثانیہ کے لئے بھی اسے باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا۔ یا یہ کہ رسول اللہ صلعم نے ایسا فرمایا تھا۔ ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ تاریخی شہادت غیر یقینی ہے۔ اور لہٰذا ناقابل قبول۔ اس کے برعکس جن احادیث میں حضرات انبیائے کرامؑ کی صداقت اور نبی اکرم صلعم کے خلق عظیم کے واقعات مندرج ہیں وہ سب قابل قبول ہیں اور ہم انھیں سر آنکھوں پر رکھتے ہیں! اسی طرح چونکہ قرآن کریم میں یہ دعوےٰ ہے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی لہٰذا ہر وہ تاریخی شہادت جو حفاظت قرآن کی تائید میں ہوگی۔ ہمارے نزدیک قابل قبول ہوگی۔ اور ہر وہ شہادت جو اس کے خلاف جائے گی۔ رد کردی جائے گی۔ خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف ہی کیوں نہ کردی جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ حقیقت ثابتہ ہے۔ اور تاریخ ظنی۔ محترم مستفسر کے دل میں جو کھٹکا پیدا ہوا ہے کہ چونکہ تاریخ ظنی ہے

Marfat.com

اس لئے اس کی تائید سے قرآن کے دعووں کی صداقت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ تو یہ کھٹکا ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ قرآن کے دعووں کی صحت وسقم کا مدار تاریخی شہادت پر ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ قرآن کا ہر دعویٰ اپنی جگہ سچا ہے اور اپنی سچائی کے لئے کسی تاریخی شہادت کا محتاج نہیں۔ اگر تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ تو اس سے وہ اپنی سچائی کی دلیل لاسکتی ہے۔ اور اگر اس کے خلاف جاتی ہے تو قرآن کا دعویٰ اپنی جگہ پر سچا رہیگا۔ تاریخی شہادت سے کہا جائے گا کہ اپنے آپ پر نظر ثانی کرے۔

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مسلک تو سائنٹفک اصول کے خلاف ہے کہ جو چیز قرآنی دعوے کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھ لیا جائے۔ اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دیا جائے۔ لیکن جو چیزیں ایمانیات میں داخل ہیں ان کے لئے یہی اصول سچا اور سائنٹفک ہے۔ اس ایمان کی رو سے تاریخی شہادتوں کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآنی دعوے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کا ایمان نہیں رکھتے وہ غیر مسلم ہیں۔ اور ان کا معاملہ ہم سے الگ ہے۔ ان کے پاس چونکہ حق اور باطل کا کوئی بھی مستقل۔ محکم۔ غیر متبدل اور خارجی Objective معیار نہیں۔ اس لئے وہ تاریخ کی شہادتوں کو اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطابق ہی پرکھ سکتے ہیں۔ اگر ان کے اصولوں کے مطابق کوئی تاریخی شہادت معتبر سمجھی جاتی ہے اور وہ قرآن سے ٹکراتی ہے۔ تو انھیں حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تاریخی شہادت کو معتبر سمجھیں۔ البتہ جب

Marfat.com

ہم ان سے گفتگو کریں گے تو ہم یا تو یہ ثابت کریں گے کہ ان کے اصولوں میں سقم ہے یا ان کی تحقیقات میں نقص۔

لیکن حفاظت قرآن کے معاملہ میں تو یہ صورت پیش نہیں آرہی۔ اس کی تائید تو ان کے اصولوں کے مطابق مرتب کردہ تاریخی شہادات بھی کر رہی ہیں۔

Marfat.com

اسلامی تاریخ

ایک صاحب لکھتے ہیں۔ "آپ کہتے ہیں کہ تاریخ ظنی چیز ہے۔ اس لئے وہ یقینی طور پر قابل اعتماد نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسلامی تاریخ تو بڑی قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے اس کے ذریعہ ہم دنیا کے سامنے اپنے ماضی کو پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے مورخین عام ہسٹورینز Historians کی طرح نہیں تھے۔ وہ تو بڑے بڑے ائمہ تھے۔ وہ رسول اللہ کے زمانے سے قریب تر تھے۔ اس لئے اس تاریخ کو دوسری تاریخ کے برابر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ تاریخ نہ ہو تو ہم صحابہ کرامؓ کی سیرت اور کردار کا مطالعہ کہاں سے کریں؟

جواب۔

تاریخ۔ تاریخ ہی ہے۔ خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی تاریخ کے ساتھ آپ کی عقیدت وابستہ ہوتی ہے۔ اور دوسروں کی تاریخ کو آپ صرف تاریخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ورنہ یقینیات کا رتبہ نہ اسے حاصل ہو سکتا ہے نہ اُسے۔ ہمارے مورخین بھی مورخین ہی تھے۔ امام کا لفظ ہمارے ہاں کی ایک عامی اصطلاح

تھی۔ اس سے معصومیت اور تقدس مستلزم نہیں آتی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تاریخ کا مطالعہ خود نہیں کیا۔ ورنہ آپ تفصیلات دریافت کئے بغیر ہم سے متفق ہوتے آپ نے چونکہ سیرت صحابہ کبارؓ کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے ہم تاریخ ہی سے صحابہ کبارؓ ہی کے متعلق ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے دیکھئے۔ اور پھر خود ہی فیصلہ فرمالیجئے کہ تاریخ ظنی شے ہے یا یقینی۔

خلیفۂ اول کا انتخاب

امام محمد بن جریر الطبری ہمارے ہاں تفسیر اور تاریخ دونوں کے امام کہلاتے ہیں۔ ان کی تفسیر ام التفاسیر ہے۔ اسی طرح ان کی تاریخ بھی ام التواریخ ہے یعنی تفاسیر میں ان کی تفسیر سب سے پہلی اور اسلامی تاریخ میں ان کی تاریخ اولیت کا سہرا لئے ہوئے ہے[1]۔ یوں کہئے کہ ہمارے ہاں صحابہؓ سے قریب ترین زمانہ کی مفصل تاریخ یہی ہے۔ اس کے بعد کی تاریخیں بیشتر اسی تاریخ پر مبنی ہیں۔ جیسے بعد کی تفسیریں بالعموم تفسیر طبری ہی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ یہ ہے تاریخ طبری کی حیثیت۔ اس میں سے بھی صرف وہ واقعہ لیجئے جو رسول اللہ کی وفات کے بعد سب سے پہلے پیش آیا۔ یعنی حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب خلافت کا واقعہ۔ مختصراً بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ اور اپنے میں سے حضرت سعدؓ کو خلیفہ منتخب کرنا چاہا

---

[1] تفسیر اور تاریخ میں طبری سے پہلے بھی کچھ متفرق چیزیں ملتی ہیں۔ لیکن قرآن کی مکمل تفسیر اور مفصل تاریخ سب سے پہلی طبری ہی کی ہے۔

اس کے بعد وہاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تشریف لے گئے۔ مسئلہ پیش نظر کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں ہوئیں۔ اور بالآخر حضرت ابوبکرؓ متفقہ طور پر خلیفہ منتخب ہو گئے۔ بات اتنی جلدی ختم ہو جانے کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ کسی طرف سے یہ تجویز بھی آئی کہ ایک خلیفہ انصار میں سے ہو جائے اور ایک مہاجرین میں سے۔ چونکہ یہ چیز اتحاد ملت اور وحدت مرکز کے اصول کے خلاف تھی۔ جو درحقیقت اسلام کا بنیادی نقطہ تھا۔ اس لئے اس امر کا احساس پیدا ہو گیا کہ مبادا مسئلہ انتخاب ہی ملت میں تفرقے کا موجب نہ بن جائے۔ اس پر سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اب اس "معرکہ انتخاب" کی تفصیل امام طبری کے الفاظ میں سنیئے۔ ان کی تاریخ کی جلد اول کے حصہ چہارم کا آغاز اسی واقعہ سے ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

طبری کا بیان

اب ہر طرف سے آ آ کر لوگ ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعد کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ۔ سعدؓ کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سرہانے آکر کھڑے ہو گئے اور کہا میں چاہتا ہوں کہ تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا چھوڑ دو اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہیں رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو۔ اس موقع

Marfat.com

پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کے گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے۔ اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہ مانتے بلکہ میں ان کی اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا لے چلو..... چند روز ان سے تعرض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا گیا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے۔ تم بھی آکر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش نہ خالی کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے نہ رنگ لوں۔ اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں۔ اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں ہر گز بیعت نہ کروں گا۔ اس کے بعد سے سعدؓ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز نہ پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک کو ان کے ساتھ ادا نہ کرتے ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

یہ ہے تصویر امام طبری کے الفاظ میں ان صحابہ کبارؓ کی۔ جن کے متعلق قرآن کی شہادت ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحما

بلینہم یعنی کفار کے مقابلہ میں نہایت سخت لیکن آپس میں محبت اور ہمدردی کے پیکر۔ یہ ہیں وہ صحابہؓ جن کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ایک کی ڈاڑھی دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ اس کے دانت توڑنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ایک امیدوار خلیفہ بن گئے ہیں اور دوسرے امیدوار کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان کے خلاف اپنے ترکش کا ہر تیر چلانے کی فکر میں اور اپنی تلوار کو ان کے خون سے رنگین کرنے کی سوچ میں ہیں۔

فرمایئے کہ اس تاریخ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اسے اس لئے صحیح مان لیا جائے کہ اس کے لکھنے والے امام ابن الجریر طبری ہیں۔ اور وہ رسول اللہ سے قریب ترین زمانے میں ہوئے ہیں[1]؟ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو پھر جو کچھ ان بزرگان کرام کے خلاف یورپ کے پادری اور ہندوؤں کے مہاشے لکھتے چلے آرہے ہیں آپ اس پر چیں بجبیں اور خنجر بدست کیوں ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عہد محمد رسول اللہؐ والذین معہ کی تاریخ کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار بھی قرآن کریم ہی ہے۔ اس لئے کہ اس عہد سعادت آگیں کے جو واقعات عبرت و بصیرت کا سامان اپنے اندر رکھتے تھے۔ قرآن نے انھیں اپنے دامن حفاظت میں لے لیا ہے یہی اس دور کی سچی تاریخ ہے۔ یا باقی تاریخ کا وہ حصہ جو اس (قرآنی) تاریخ سے مطابقت رکھے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم تاریخ کو ظنی قرار دیتے ہیں۔ اور صرف قرآن کو

---

[1] حالانکہ یہ بھی رسول اللہ سے قریب زمانہ کے نہیں ہیں۔ ان کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی تھی

یقینی۔ اسی نہج سے کتب روایات بھی درحقیقت کتب تاریخ ہی ہیں۔ اور یہ اس سازش کی پیدا کردہ یا اس سے متاثر ہیں جو مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے یا ان کے رسولؐ اور دست پروردگان حضور رسالت مآب کو ان کے مقام سے گرانے کے لئے عمل میں لائی گئی تھی۔ مثال کے طور پر اسی واقعہ کے ضمن میں دیکھئے کہ تاریخ کے ساتھ روایات میں کیا ہو رہا تھا۔ طبری کی تاریخ میں صحابہ کبارؓ کی سیرت کا وہ نقشہ ہے جسے آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ انہی صحابہؓ کے متعلق امام بخاریؒ کے مجموعہ روایات میں حسب ذیل "سرٹیفکٹ" موجود ہے

بخاری کتاب انبیاء میں ہے کہ

صحابہؓ کے متعلق بخاری کی روایت

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے صحابہ میں سے کچھ لوگوں کو بائیں جانب (جہنم کی طرف) لے جانے کا حکم ہوگا تو میں عرض کروں گا کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب دیا جائے گا کہ جب آپ ان سے رخصت ہوئے ہیں تو یہ لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے تھے۔ تو میں وہی کہوں گا جو ایک نیک بندے عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ "میں ان پر اس وقت تک نگراں تھا۔ جب تک میں ان میں موجود تھا..... الخ"

یہ ہے صحابہ رسول اللہ کے متعلق بخاری شریف کی شہادت! اب

Marfat.com

فرمایئے کہ مسلمانوں کی سب سے پہلی تاریخ اور (قرآن کے بعد) سب سے صحیح کتاب کی ان شہادات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر آپ انھیں صحیح تسلیم ہیں تو آپ جانیں۔ اور آپ کا دل! لیکن ہم سے اس کی توقع نہ رکھئے کہ ہم صحابہؓ کبار کے متعلق اس قسم کا خیال تک بھی دل میں لا سکیں۔ خواہ طبرستان اور بخارا کے ہزاروں امام اس کی شہادت کیوں نہ دیں۔ ان عجمیوں نے جو کچھ اسلام کے ساتھ کیا ہے۔ وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

Marfat.com

ناسخ و منسوخ

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

آیۂ رجم سے متعلق ایک صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی سینکڑوں آیتیں ایسی ہیں جو منسوخ ہیں۔ یعنی وہ قرآن میں موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لئے اگر ایک آیت ایسی بھی ہے جس کا حکم موجود ہے۔ لیکن آیت کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے۔ تو اس میں کیا قیامت ہے!! ان سے کہا کہ میں نے تو قرآن میں کہیں نہیں پڑھا کہ فلاں آیت فلاں آیت سے منسوخ کر دی گئی ہے۔ اور فلاں آیت فلاں آیت سے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ نہیں قرآن میں اس طرح نہیں لکھا۔ لیکن ہمارے علماء صاحبان جانتے ہیں کہ کون سی آیت کس آیت سے منسوخ ہو چکی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ قرآن کس قسم کا ہے جس میں اس طرح ناسخ و منسوخ احکام ہیں۔ حالانکہ اس طرح تو کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون میں بھی نہیں ہوتا۔ تو انھوں نے فرمایا کہ جب خود قرآن میں یہ موجود ہے ماننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا۔ (سورۂ بقرہ)

Marfat.com

جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے ہیں۔ یا بھلا دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر یا اس جیسی (آیت) اور لے آتے ہیں۔" تو پھر آپ اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہیں۔

کیا آپ تفصیلاً تحریر فرمائیں گے کہ یہ کیا معمہ ہے؟

جواب۔

ہمارے موجودہ "مذہب" کی کونسی بات معمہ نہیں جو آپ کو اس معمہ پر اس قدر اچنبھا ہوا۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ ان صاحب کا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس وقت سے چلا آرہا ہے۔ جب سے روایات وجود میں آئیں۔ اور اس وقت تک چلایا جائے گا تب تک مسلمانوں کی یہ حالت رہے گی کہ واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا (۲/۱۷۰) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس مسلک کی اتباع کریں گے۔ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔" اندھی تقلید اور قرآنی بصیرت دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ اسی مسلک تقلید کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے بیشتر حصہ کو منسوخ قرار دے رکھا ہے۔ اور یہ نسخ صرف قرآن کی دوسری آیات ہی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ قرآن کی آیتیں احادیث سے بھی منسوخ سمجھی جاتی ہیں۔

نسخ کے ثبوت میں قرآن کی وہی آیت پیش کی جاتی ہے۔ جو اوپر درج کی جا چکی ہے۔ اگر آپ اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے لائیں تو اس کے بعد آپ نی الواقع

Marfat.com

حیران ہوں کہ یہ آیت اس قسم کے عقیدہ کی دلیل کس طرح بن سکتی ہے؟ لیکن قرآن کے ساتھ تو مسلمانوں نے یہ کیا کہ پہلے غیر قرآنی عقائد وضع کئے اور پھر ان کی [redacted] کے لئے قرآن کی کھینچا تانی کی گئی۔

بات بالکل واضح تھی۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ نبی اکرمؐ سے پہلے تمام انبیاء کرام خدا کا پیغام لاتے رہے۔ مخالفین کا اعتراض تھا کہ اگر قرآن کی تعلیم بھی وہی ہے جو پہلے انبیاء کرامؑ کی تھی تو پھر قرآن میں ان کتابوں سے مختلف احکام کیوں ہیں جنھیں وہ اپنی آسمانی کتابیں کہتے تھے قرآن نے کہا کہ سابقہ ادوار میں وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جو احکام وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے انھیں بعد میں آنیوالے رسول کی وحی منسوخ کر دیتی تھی۔ اور ان کی جگہ ان سے بہتر احکام (یعنی ایسے احکام جو زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں) دیئے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سابقہ انبیاء کرام کی وحی اپنی اصلی شکل میں موجود نہ رہتی تھی۔ ان میں تحریف و الحاق بھی ہوتا تھا۔ اور ان کا اکثر حصہ حوادث ارضی و سماوی کی وجہ سے یا خود انسانی وسیسہ کاریوں کے باعث ذہنوں سے فراموش ہو جاتا تھا۔ بعد میں آنے والا رسول اس فراموش شدہ حصہ کو من جانب اللہ حاصل کر کے پھر لوگوں کو دے جاتا تھا۔ قرآن چونکہ سب سے آخر میں آنے والی کتاب تھی اس لئے اس نے ان تمام سابقہ احکام کو جو وقتی طور پر نافذ العمل ہونے کے لئے دیئے گئے تھے منسوخ کر دیا۔ اور ان کی جگہ ایسے اصولی احکام دیدیئے۔ جو ہمیشہ کے لئے رہنے والے تھے۔ سابقہ انبیاء کرام کی تعلیم کا

وہ حصہ جو فراموش کر دیا گیا تھا۔ لیکن جس کا باقی رکھا جانا مقصود تھا اسے قرآن نے دوبارہ لے آیا۔ اب اہل کتاب کی یہ حالت تھی کہ وہ قرآن میں بعض باتیں ایسی پاتے تھے جو ان کے احکام کے خلاف جاتی تھیں (یعنی جنھیں قرآن نے منسوخ کر دیا تھا۔ اور ان کی جگہ دوسرے احکام نے لے لی تھی) یا ایسی باتیں جس کا ان کتابوں میں کہیں ذکر نہ تھا۔ جو ان کے پاس اس وقت موجود تھیں (یعنی وہ حصہ جو ان کے ہاں فراموش ہو چکا تھا۔ اور جسے قرآن دوبارہ لایا) چنانچہ وہ اس کیفیت حال کو بطور اعتراض پیش کرتے تھے کہ اگر قرآن اسی خدا کی طرف سے ہے۔ جس خدا نے سابقہ کتابیں نازل کی تھیں۔ تو پھر قرآن بعینہٖ ان کتابوں جیسا کیوں نہیں۔ اس کے جواب میں قرآن نے یہ بتایا کہ وحی کا اسلوب یہ ہے ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا کہ ہم جن سابقہ احکام کو منسوخ کر دیتے ہیں اُنکی جگہ جدید نبی کی وساطت سے ان سے بہتر احکام بھجدیتے ہیں۔ اور سابقہ تعلیم میں سے جو حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے اس کی جگہ اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یہی اسلوب قرآن میں کارفرما ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل میں منکرین قرآن کا یہ اعتراض ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

واذا بدلنا اٰیۃ والله اعلم بما ینزل۔ قالوا انما انت مفتر۔ بل اکثرھم لا یعلمون (۱۶/۱۰۱)

جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ (اے رسول) تو یہ کچھ اپنی طرف سے

Marfat.com

کہتا ہے (کیونکہ یہ ان کتابوں سے الگ ہے جو ہمارے پاس ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ (وحی کا اسلوب کیا ہے)

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔ اسی "تنسیخ آیات" یا تبدیلی احکام سابقہ کے متعلق سورۂ رعد میں ہے۔

وما کان لرسول ان یاتی بایتہ الا باذن اللہ لکل اجل کتاب۔ یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب (۱۳/۳۸-۳۹)

کسی رسول کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی پیغام لے آتا (خدا کا قانون اس باب میں یہ ہے کہ) ہر میعاد کے لئے ایک حکم معین ہے سو (اس قانون کے مطابق) اللہ جس (پیغام) کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس اصل کتاب کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو تغیرات سے ماوراء ہے۔

یہ تو ہوا پیغامات سابقہ کی جگہ دوسرے پیغامات لانے کی بابت۔ یعنی تنسیخ احکامات سابقہ۔ اب لیجئے آیت زیر نظر کا دوسرا حصہ۔ یعنی او ننسھا (یعنی جو پیغامات فراموش کر دیئے جاتے ہیں) اس کے متعلق خود قرآن شاہد ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں کا کتنا بڑا حصہ فراموش کر رکھا تھا[1]۔ سورۃ المائدہ میں پہلے یہود کے متعلق

---

[1] اس کی تاریخی تفصیل معراج انسانیت کے سب سے پہلے باب "ظہر الفساد" میں دیکھئے۔ جہاں سے معلوم ہوگا کہ جن کتابوں کو آسمانی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان کی حقیقت کیا ہے؟

ہے کہ یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظا مما ذکروا بہ (۵/۱۳)

یعنی وہ الفاظ کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں (تحریف) اور جو کچھ انھیں ذکر کے لئے دیا گیا تھا اس کا ایک بڑا حصہ انھوں نے فراموش کر دیا ہے۔ یہی الفاظ اس سے اگلی آیت میں نصاریٰ سے متعلق کہے گئے ہیں۔ یہ لوگ پیغاماتِ خداوندی میں اس طرح تحریف و الحاق کرتے لیکن اللہ تعالیٰ پھر ایک رسول بھیجکر ان کی تحریف و الحاق کو چھانٹ پھٹک کر الگ کر دیتا۔ اور اپنے اصل پیغام کو پھر اس کی جگہ رکھدیتا ہے۔ سورۃ حج میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی

القی الشیطن فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن

ثم یحکم اللہ ایتہ۔ واللہ علیم حکیم[1] (۲۲/۵۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی اور رسول نہیں بھیجا۔ جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو کہ اس کے تلاوت کردہ (پیغام خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ نہ ملا دیا ہو (شیاطین یہ کرتے تھے لیکن) اللہ شیطان کی اس آمیزش کو (دوسرے رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا۔ اور اپنے پیغام کو

---

[1] ہمارے مفسرین نے اس آیۂ جلیلہ کی تفسیر میں اس قسم کی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ اور حضور نبی اکرمؐ کی طرف اس قسم کی نحو باتیں منسوب کی ہیں کہ جن کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے۔ اور ان سب خرافات کا منبع روایات ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ اللہ ہم سب پر رحم کرے۔

Marfat.com

پھر محکم بنا دیتا تھا۔ اللہ علم والا، محکم پیغامات رکھنے والا ہے۔"

امید ہے کہ ان اشارات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ "ما ننسخ من ایۃ الخ" کی آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کی کوئی اصل ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم کی اپنی آیات دوسری آیات سے منسوخ ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ بھی کہ قرآن کی آیات روایات سے منسوخ ہیں۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ تو اس سے قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مُلّا بے چارے کو اس سے کیا واسطہ کہ خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا ہے۔ اسے تو صرف اس سے غرض ہے۔ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس میں کہیں فرق نہ آجائے۔ خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں یا نصاریٰ کی مفتریات۔ مجوس کی مخترعات ہوں یا صناوید عجم کی خرافات۔ مُلّا کے نزدیک جو کچھ کتاب میں چھپا ہوا ہے سند ہے۔ باقی رہا قرآن تو وہ مُردوں کو ثواب پہنچانے کیلئے ہے یا اس لئے کہ از یٰسین او آساں بمیری۔ خدا نہ کرے کہ پاکستان کے مسلمانوں کے آئین و دستور کا کام ان کے ہاتھوں میں پہونچ جائے۔

ویلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا

Marfat.com

ایک ہندو کا خط

آپ نے جو قرآن شریف کا ترجمہ مطالعہ کے لئے دیا۔ میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے وید، اپنشد، ستیہ رتھ پرکاش، گرنتھ وغیرہ دھارک پستکوں کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ مجھے مذہبی تعصب کی ہوا تک نہیں لگی۔ ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ میرے مخلصانہ تعلقات قائم رہے ہیں۔ یوں تو پہلے بھی میرے اندر اسلام کے خلاف کوئی جذبہ کبھی نہیں رہا۔ شاید یہ آپ لوگوں کی محبت بھری صحبتوں کی وجہ سے ہے۔ لیکن قرآن شریف کے حالیہ مطالعہ نے تو میری ذہنی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اب اسلام مجھے دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف کھینچ بھی رہا ہے۔ اور جب ذرا میں کھنچ آتا ہوں۔ تو انہی ہاتھوں سے دھکیل کر مجھے پیچھے بھی ہٹا دیتا ہے۔ عجیب کشمکش کی حالت میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں کیسی متضاد باتیں کہہ رہا ہوں۔ ذرا شرح سن لیجئے۔

جہاں تک متن قرآن کا تعلق ہے۔ اس کے سیاسی اور قانونی احکام کو چھوڑ کر (جن کو سمجھنے کے لئے مجھ سے بہتر اور مختلف دماغ کی ضرورت ہے) باقی بہت زیادہ

Marfat.com

آیتیں ایسی ہیں۔ جن میں ایک صاف انسان کے لئے جاذبیت سے زیادہ بھی کوئی اور چیز محسوس ہوتی ہے۔ جو انسانی روح کو اس ظلم وگناہ کی دنیا سے نکال کر کسی اور عالم میں لے جاتی ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو مجھے خدا یا پرماتما کی اتنی زیادہ "مقدار" کسی اور کتاب میں نظر نہیں آتی۔ جتنی قرآن میں (کاش آپ میرا مطلب سمجھنے میں غلطی نہ کریں) دوران مطالعہ میں (آپ شاید تلاوت کہتے ہیں) مجھے تو ایسا معلوم ہوتا رہتا ہے کہ میرے اردگرد، آگے پیچھے اندر باہر خدا ہی خدا ہے۔ میں جانوں یا نہ جانوں محسوس کروں یا نہ کروں۔ وہ ہے اور یقیناً ہے۔ آتما

قرآن کی جاذبیت

(روح) کے لئے یہ خنک احساس. شانتی کی دھارا ہونے کے علاوہ ایک مضبوط آسرا بھی ہے۔ اور پھر اس میں جس قسم کے لوگوں کو مسلمان مومن، صالح اور متقی کہا گیا ہے۔ اور ان کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں جی چاہتا ہے کہ اگر جان کی قیمت پر بھی ایسے لوگوں کی صحبت میسر آجائے۔ تو مرجانا ہی اچھا ہے یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔ معاف فرمایئے! آپ کی اپنی سوسائٹی بھی اب ایسے لوگوں سے خالی ہے۔ جن کا ذکر آپ کی کتاب کر رہی ہے۔ چونکہ تاریخی لحاظ سے بھی قرآن کا پایہ اپنوں بیگانوں کے نزدیک کافی معتبر ہے اس لئے یقین کرنا پڑتا ہے کہ ایسے معیاری انسان ضرور ہو چکے ہوں گے۔ نیکیوں کے جن اعلیٰ نتائج کی قرآن نے خوشخبری دی ہے۔ اور جس خدا سے ملنے کی امید دلائی ہے۔ اس کی بے نظیر محبوبیت بہت زیادہ دلکش پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ اور ہر بات

Marfat.com

حتمی اور قطعی ہونے کی مہر بھی ساتھ ہی ساتھ لگتی گئی ہے۔

خیر اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو اسلام کی طرف کھینچتی ہیں۔ لیکن اس سے بہت زیادہ مقدار ان باتوں کی ہے جو سوچ کے گہرے سمندر میں ڈال دیتی ہیں۔ میں نے اپنی معاملاتی زندگی میں مسلمانوں کے ہر طبقے کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے ان کے آپس کے جھگڑوں سے بھی ایک حد تک واقف ہوں مجھے بحث و مناظرہ سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ اور جن جن باتوں پر یہ ایک دوسرے کو کافر بے دین وغیرہ کا خطاب دیتے رہے ہیں، وہ بھی کچھ نہ کچھ مجھے معلوم ہی ہے۔ اور پھر مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے پر فتح پانے کے لئے بہت سی بڑی بڑی کتابوں کے حوالے دیتے ... ہیں۔ اگرچہ قرآن میں ان کتابوں کا کہیں نام یا اشارہ بھی نہیں آیا۔ لیکن صدیوں سے مسلمان ان کو قرآن کے ساتھ ساتھ اپنے دھرم کی بنیاد کے طور پر مانتے چلے آئے ہیں۔ پھر انہی میں سے ہر فرقہ اپنے عقیدہ و عمل کی حمایت اور دوسروں کی مخالفت کے لئے دلیلیں نکال لیتا ہے۔ اور پھر یہ ذخیرہ ایسا ہے کہ ہر صاحب قلم مولوی اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو آپ کا دین پھیل کر وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ہر ہونہار مولوی کی امت ایک نئے فرقے کے روپ میں نمودار ہوتی ہے۔ ہمارے ہمسایہ ضلع گورداسپور کے دیہاتی مولوی مرزا غلام احمد صاحب نے کتنی ہی چھوٹی بڑی کتابیں بنائیں اور کتنے نئے مسئلے ایجاد کئے اور اس طرح ایک نئی امت تیار کر دی۔ اب سنا ہے ان کے مریدوں

لے الگ الگ کتابیں بنا کر اس امت میں بھی کئی امتیں بنالی ہیں۔ اسی پر قیاس کرلو کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں کتنے بڑے بڑے مُلا ہوئے ہوں گے۔ اور انھوں نے بڑی بڑی پستکیں لکھی ہوں گی۔ اب اگر وہ ساری پستکیں آپ کا "دین" ہیں۔ تو میں ہزاروں سال کی عمر اور ہزار آدمیوں کا دماغ کہاں سے لاؤں کہ سب کو مہیا کروں۔ پھر سب کو پڑھوں اور سمجھوں اور ان کے متضاد حکموں پر عمل کرنے کے لئے مدتوں سوچتا رہوں کہ کس کو مانوں اور کس کو چھوڑوں۔ میں نے آپ کی زبان سے کئی دفعہ سنا ہے کہ آپ کے ہاں علم تفسیر کی کئی شاخیں ہیں۔ علم حدیث کی تحقیق کے لئے کئی علم ایجاد ہوئے ہیں۔ فقہ کے کئی اسکول ہیں۔ تصوف کے کئی خاندان ہیں۔ پھر ہر ہر شاخ اور ہر ہر شعبے میں لاکھوں کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں۔ اور اس سارے کو آپ "دین" یا "مذہب" کہتے ہیں۔ یہ چیز مجھے پیچھے کی طرف دھکیلتی ہے۔ اور حیران کر دیتی ہے۔ وہ آپ کے الٰہ آباد والے اکبر صاحب جن کے شعر سنا سنا کر آپ مجھے ہنسایا کرتے ہیں۔ کیسے مزے کی بات کہہ گئے ہیں

یہ صندوقِ کتب

یہ صندوقِ کتب اب مجھ سے یارب اٹھ نہیں سکتا
یہ مذہب ہے تو مجھ سے بارِ مذہب اٹھ نہیں سکتا

معاف فرمایئے! جس "بارِ مذہب" کو آپ کا اکبر حسین اکبر اٹھانے سے انکار کر رہا ہے۔ اسے مہاشہ ہری چند گھڑی ساز کس طرح اٹھا سکے گا۔ کیا یہی وہ اسلام ہے جسے آپ ساری دنیا کے سامنے پیش کر کے امید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی مختصر

Marfat.com

پسند اور وضاحت طلب دنیا اس پر ایمان لے آئے گی؟ معاف فرمایئے جتنا قرآن شریف غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ آپ کی درمیانی تاریخ اور موجودہ طرز زندگی اسلام سے دور باش کا نعرہ لگا رہی ہے۔ خدارا پہلے آپ سب مل کر اپنا کوئی اسلام متعین کریں اور پھر کسی اور کو اس کی طرف بلائیں چونکہ آپ سے بے تکلفی ہے اس لئے صاف صاف عرض کر رہا ہوں اور آپ کی فراخدلی سے امید بھی ہے کہ آپ برا نہیں منائیں گے۔

معاف فرمائیں خط طویل ہو گیا لیکن اس طوالت کے ذمہ دار آپ ہی ہیں پہلے آپ نے بات چھیڑی اور قرآن پر میری رائے دریافت کی۔ لیکن اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کو دوست بھی کہوں اور اس کے ساتھ بات بھی بیجا کر دوں۔

(مہاشہ) ہری چند گھڑی ساز مغل گیٹ امرتسر

عرشی صاحب کا جواب

مہاشہ جی! اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔ آپ نے اپنے علم و خبر کے مطابق جو صحیح سمجھا لکھ دیا۔ اب میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کو مثال کے ذریعہ ایک بات سمجھاؤں۔

آپ کو یاد ہو گا جب ہم پہلی مرتبہ کشمیر گئے ہیں۔ تو ہمارا قافلہ پیر پنجال کی بلند چوٹی کو پار اتر کر دامن کوہ میں چشمہ ویری ناگ کے مقام پر ٹھہرا۔ ہم نے وہاں آٹھ دن قیام کیا ––– آہ! وہ بھی کیا دن تھے۔

جوانی کی راتیں۔ امنگوں کے دن

چشمے کا شش پہلو یا شاید ہشت پہلو حوض جو شاہجہاں کے زمانے میں بنایا گیا تھا جب ہم اس کے کنارے پر بیٹھتے تھے تو اس کے بے حد شفاف پانی میں تہہ کی سنہری مچھلیاں کس طرح کلولیں کرتی اور پھدکتی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں۔ پھر ایک چھوٹی سی پختہ نہر کے ذریعہ وہ پانی اپنے منبع سے نکل کر گرم سفر ہو جاتا ہے۔ اسی نہر سے چھوٹی چھوٹی نالیاں نکل کر بستی میں پھیل گئی ہیں۔ جو چشمے کی ہمنام ہے۔ یعنی ویری ناگ کہلاتی ہے۔ پانی اتنا یخ کہ ہم نہانے بیٹھے تو تین گڈویوں سے زیادہ سر پر نہ ڈال سکتے تھے۔ اور پینا چاہتے تو چائے کی طرح ایک ایک گھونٹ ٹھہر ٹھہر کر پیتے۔ اتنا صاف، شفاف اور سرد پانی آپ نے سمجھا کس وجہ سے ہے؟ منبع کے قریب ہونے کی وجہ سے۔ یہ منبع ہے دریائے جہلم کا یہاں سے روانہ ہو کر کئی منزلیں طے کر کے راستے کے کئی دیہات کی غلاظت اور ادھر ادھر کے بھلے برے پانیوں کو ساتھ لیتا ہوا جب یہ سرینگر میں پہنچتا ہے تو اس میں نہ وہ شفافی اور نہ ٹھنڈک۔ نہ یہ نہانے کے کام کا، نہ یہ پینے کے لائق۔ اس کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ وہ حور یہ چڑیل۔ وہ فرشتہ یہ دیو۔ کشمیر کی ناتربیت یافتہ آبادی نے اس کے کناروں کو نجاست سے لت پت کر رکھا ہے۔

بس ہر دین یا دھرم کو اسی پر قیاس کر لیجئے۔ اس کا آغاز خالص ربانی تعلیم ہوتا ہے۔ پھر وقت گذرنے پر آہستہ آہستہ اس میں انسانی آمیزشیں شامل ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ اپنے اصل سرچشمہ سے دوری کے سبب[1]

---

[1] صرف دوری کے سبب نہیں بلکہ ان کثافتوں کے سبب جو اس میں مل جاتی ہیں۔
(طلوع اسلام)

Marfat.com

اپنی تمام تاثیر و لطافت کھو بیٹھتا ہے۔ پھر اس کے اولیں مخاطب اگر دنیا میں دوبارہ زندہ ہو کر اس کی آخری مسخ شدہ شکل کو دیکھیں تو بالکل نہ پہچان سکیں کہ یہ وہی پاک تعلیم ہے۔ جس نے ناپاکوں کو پاک اور محکوموں کو حاکم بنا دیا تھا۔

ہاں ہماشہ صاحب! یہاں ایک خاص بات کہنے کی یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام دینی تعلیمات اپنی اصل کو کھو بیٹھی ہیں۔ یعنی ان کا منبع ہی موجود نہیں رہا۔ لیکن اسلام کا سرچشمہ قرآن کی شکل میں بالکل محفوظ ہے۔ یہ کوئی اتفاقی خوش بختی نہیں۔ خود قرآن کے اندر ایسی کئی آیات موجود ہیں۔ جن میں یہ پیشگوئی صاف طور پر ملتی ہے کہ قرآن کو ہمیشہ کے لئے خدائی حفاظت کا شرف حاصل رہے گا۔ اور اس میں باطل کسی راہ سے نہیں گھس سکیگا۔ چنانچہ کتابی صورت کے علاوہ بے شمار انسانی سینوں میں بھی اس کی حفاظت ہو رہی ہے۔ اور مخاطبین اول کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کے نسخے اب تک موجود ہیں پھر اس کی آیات، الفاظ، حروف نقطے اور زیر زبر تک گنی ہوئی ہیں یا بالکل معلوم ہے کہ اس میں الف کتنی مرتبہ آیا اور ب کتنی مرتبہ۔ اسی طرح تمام حروف کی گنتی محفوظ ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کے متعلق آپ کو علم ہے کہ ان کی اصلی بولی بھی نہیں ملتی۔ ترجمہ در ترجمہ کی شکل میں انسانی آمیزشوں کے ساتھ بعض صحیفے موجود ہیں اور وید کی زبان بھی کہیں مروج نہیں۔ ان کو پوری طرح جاننے والا کوئی وِدوان (علا) موجود نہیں۔

الحاصل یہ شرف صرف قرآن شریف کو حاصل ہے کہ اس کی بولی دنیا

Marfat.com

کے کثیر حصے میں بولی جاتی ہے۔ اور اس میں اخبارات بھی نکل رہے ہیں۔ تصانیف بھی شائع ہو رہی ہیں۔ اور اعلیٰ اعلیٰ ڈکشنریاں بھی ملتی ہیں۔

اب میں نہایت ہی صاف الفاظ میں آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جن کتابوں کو ہمارے وددالوں (علاموں) نے دین بنا کر پیش کیا ہے۔ اور اس کی بے شمار مختلف و متضاد شکلیں ہمارے بے شمار فرقوں کے اندر چلی آرہی ہیں۔ وہ دین ہے ہی نہیں۔ دین سارے کا سارا قرآن کے اندر موجود ہے۔ یہ میں مدعی سست اور گواہ چست کے طور پر نہیں کہتا۔ خود قرآن بڑی ہی بلند آواز سے پکار رہا ہے۔ پانچویں سورت کی چوتھی آیت میں لکھا ہے۔

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا

اور

اپنی نعمت تم پر پوری کر دی

اور

دین اسلام کو میں نے تمہارے لئے پسند کیا

مہاشہ صاحب اس سے زیادہ واضح اور کیا ہوگا کہ وہ دین جو الٰہی نعمت ہے۔ اور وہ نعمت جو دین کی شکل میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی تکمیل نزول قرآن پر ہو چکی اور وہ دین کونسا دین ہے؟ خالص اسلام۔ بس اس کے بعد جو فرقے۔ جو مذاہب اور جو کتابیں ہیں۔ وہ اس دین اور اس نعمت سے خارج ہیں جس کی تکمیل قرآن کے اندر ہو چکی ہے۔

پھر چھٹی سورت کی ۱۱۶ ادیں آیت میں ہے۔ "تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف میں کمال کو پہونچ گئی اسکی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔"

سچ اور انصاف ترازو کے پورے تول کو کہتے ہیں۔ جس میں ذرا بھی کمی یا بیشی ہو جائے تو وہ جھوٹ اور ظلم بن جاتا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔

اگر تو زمین کے اکثر باشندوں کی بات ماننے لگے۔ تو وہ تجھ کو راہ سے بے راہ کر دیں گے (کیونکہ یقین تو ان کے پلے میں ہے نہیں) وہ صرف ظن و تخمین کے پیچھے لگے رہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی تصانیف اپنے زمان و ماحول کے بے شمار اختلافات کی وجہ سے کوئی یقینی اور ابدی تعلیم پیش نہیں کر سکتیں۔ ہما شما جی اس وقت مسلم ہوں یا غیر مسلم سب ہی انسانی رہنمائی پر انحصار کر چکے ہیں۔ اور یہ رہنمائی قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور بدلتی جا رہی ہے۔ اور اگر کوئی قوم اسے نہ بدلنے پر مصر ہو۔ تو وہ جمود کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکتی۔

دوگونہ رنج و عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلا و فرقتِ لیلا!

یعنی چلیں تو ٹھوکر اور کھڑے ہوں تو جمود۔ یقین کیجئے کہ جب تک عقل کی لگام وحی کے ہاتھ میں نہ دی جائے گی انسانیت کو چین نہیں ملے گا۔ اور خالص وحی اس وقت قرآن

Marfat.com

کے سوا زمین کے تختے پر موجود نہیں۔

فقہ، حدیث اور تفسیر

اور یہ جو آپ نے ہمارے فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کو دین کی راہ میں ایک مشکلات کا پہاڑ سمجھا ہے۔ محترم اصل بات یہ نہیں۔ یہ اپنے اپنے زمانے کی دین فہمی کی کوششیں ہیں جن میں خلوص بھی ہے اور عدم خلوص بھی۔ خطا بھی ہے اور صواب بھی۔ ان میں سے کسی کو ہدایت کا درجہ حاصل نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان کی صورت پرستی بتوں کو بھی ابدی خدا کی گدی پر بٹھاتی رہی ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے پتھر کی ماہیت تو تبدیل نہیں ہو جاتی۔ درحقیقت دھرم یا دین کوئی ایسی گپت ودیا نہیں جس کو بمشکل تمام کاشی کا ایک آدھ پنڈت یا یروشلم کا کوئی پادری یا ازہر و دیوبند کا کوئی فقیہہ ہی سمجھ سکے۔ اور باقی تمام دنیا کے لوگ اس ماؤنٹ ایورسٹ تک پہونچ ہی نہ سکیں۔ کیا آپ قدرت کا عام رویہ نہیں دیکھتے۔ جتنی کسی چیز کی زیادہ ضرورت ہے اتنی ہی اس کی پیداوار میں بھی فراوانی ہے

سرمایۂ حیات بود آب و بے بہاست
مستلزم ممات بود زہر و قیمتی است

اگر دین تمام انسانوں کے لئے ہے۔ تو وہ ایسا ہونا چاہیئے کہ تمام انسانوں کیلیے سہل الحصول اور سہل الفہم ہو۔ جب ہم اس نظر سے دین کو تلاش کرنے لگتے ہیں تو بے شک بڑی بڑی پستکیں اور عظیم مجلدات ہمارے سامنے سد سکندری بن کر

کھڑی ہوجاتی ہیں۔ سچ مچ کون ہے جو اس دیوار بلند و سنگین کو توڑنے پھاندے اور دین تک پہنچ سکے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآن کا دین تو قطعاً ایسا پر پیچ اور پھیلا ہوا نہیں کہ سمجھا اور سمیٹا نہ جا سکے۔ دوسری ہی سورت کی ۲۸۷ ویں آیت میں ہے۔

"اللہ کسی بھی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔"

اور سنیئے ۲۲ ویں سورت کی ۷۸ ویں آیت میں ہے۔

"دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔"

ماشاء جی اس سے زیادہ تنگی اور کیا ہوسکتی ہے کہ انسان مصر و شام اور عراق و عرب سے "دین کی کتابیں" تلاش کرتا پھرے۔ اور اس میں عمریں صرف ہو جائیں اور پھر بھی بات پلے نہ پڑے۔

آخر یہ ایک خط ہی تو ہے جس کو میں طول دیتا جا رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں قرآن کے جن گوشوں کی طرف آپ کی نظریں نہیں گئیں۔ بلکہ بے شمار مسلمانوں سے بھی وہ اوجھل ہی رہے۔ ان کو سامنے نہ لاؤں تو

قرآن آسان ہے

کس طرح حقیقت کھلے۔ قرآن کی بے شمار خوبیوں میں سے یہ بھی ایک خاص خوبی ہے کہ وہ اپنی ہر بات اس طرح بہ تکرار بیان کرتا ہے کہ بات تشنہ نہ رہ جائے۔ اور سارے گوشے سامنے آجائیں۔ اور کسی خارجی مفسر کی محتاجی نہ رہے چنانچہ اس مضمون کی صرف ایک آیت اور سن لیجئے۔ جو دوسری سورت کے ۱۸۵

نمبر برائی ہے۔

"اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا۔"

دیکھا آپ نے ہوا اور پانی کی حیات بخشیوں کی طرح دین کتنا سہل اور رواں دواں ہے۔ جس کی راہ میں کوئی مشکل ہے ہی نہیں قرآن کی ایک خصوصیت اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جو تعلیم وہ پوری کی پوری کتاب میں دیتا ہے۔ اسی کو اصولی طور پر مختصر سے مختصر انداز میں چند جملوں میں بھی دہرا دیتا ہے۔ تاکہ پھیلی ہوئی بات سمٹ کر بھی سامنے آتی ہے۔ اور اس طرح جزء میں کل کا تماشہ دکھائی دیتا ہے مثال کے طور پر ایک بہت ہی چھوٹی سی سورت سن لو۔ جس کے صرف ایک چھوٹے سے فقرے میں سارا دین آگیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

زمانہ گواہی دے رہا ہے کہ انسان نقصان میں ہے (ہاں اس لازمی نقصان سے کون لوگ بچ سکتے ہیں) صرف وہی جو ایماندار اور نیکوکار ہیں اور راست بازی کی تعلیم کو عام کرتے ہیں اور (اس راہ میں جو مشکلات آئیں ان پر) مل جل کر صبر کرتے اور ثابت قدم رہتے ہیں۔

بس یہ چار باتیں ہیں جن میں میری آپ کی اور تمام دنیا کی مشکلات کا حل ہے۔ اگر ہم اس قسم کی سوسائٹی بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ تو یہ دنیا جنت بن سکتی ہے۔ مہاشہ جی! یہ صرف زبانی بات نہیں۔ تاریخ کے ایک روشن دور میں کچھ لوگوں نے

Marfat.com

اس تعلیم کو اپنایا۔ اور تجربی حقیقت کو ثابت کر دکھایا۔

عربی میں اس سورت کی تین آیتیں ہیں۔ پہلی ایک لفظ کی، دوسری دو لفظوں کی اور تیسری سات لفظوں کی۔ بس ان سات لفظوں میں سب کچھ آگیا۔ ہمارے مشہور عالم مولانا عثمانیؒ نے اس سورت کے حاشیے پر لکھا ہے۔

فی الحقیقت یہ چھوٹی سی سورت سارے دین و حکمت کا خلاصہ ہے امام شافعیؒ نے سچ فرمایا کہ اگر قرآن میں صرف یہی ایک سورت نازل کر دی جاتی تو (سمجھ دار بندوں کی) ہدایت کے لئے کافی تھی۔ بزرگان سلف میں جب دو مسلمان آپس میں ملتے تھے۔ جدا ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو یہ سورت سنایا کرتے تھے۔

یہ صرف ایک نمونہ ہے۔ اس قسم کی بیسیوں آیتیں ہیں۔ کہیں دو کہیں تین۔ کہیں چار اور کہیں صرف ایک ہی آیت میں دین کی حقیقت بیان کر دی ہے۔

دیباچۂ قرآن جس کو سورۂ فاتحہ، متن قرآن اور ام الکتاب وغیرہ کئی ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی کل سات آیتیں ہیں۔ علمار کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سارے قرآن کا اصل و مغز ہے۔ اور قرآن اس کی تفصیل و تفسیر ہے۔

۵۴ ویں سورت میں ایک ہی بات کو بار بار چار دفعہ دہرایا ہے کہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے۔ تو کیا ہے کوئی نصیحت لینے والا؟

Marfat.com

یعنی جہاں تک نصیحت کا تعلق ہے۔ قرآن آسان ہے۔ اور اس میں کوئی ایچ پیچ نہیں۔ ۳۹ ویں سورت کی آیت ۲۷، ۲۸ میں ہے۔

ہم نے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کردیں۔ تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ قرآن عربی جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں۔ تاکہ لوگ تقویٰ شعار بن جائیں۔

جہاشہ جی۔ میں نے بھی قریب قریب تمام ممکن الحصول سمادی کتابیں دیکھی ہیں۔ اتنی صفائی سے اپنا تعارف خود کرانے والی کوئی کتاب نظر نہیں آئی جتنا قرآن یہ بھی جمال قرآنی کے ایک گوشے کی یونہی ذرا سی شعاع ہے۔ تفصیلات میں جانے کی نہ مجھ میں تاب نہ آپ میں گنجائش۔ بات بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن خاتمے سے پہلے ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن صرف یہی نہیں ہو کہ

خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر!
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند!

(سعدیؒ)

پند حافظ بشنو اے دوست بروبنیکی کن
کہ من ایں پند بہ از دُرِ دگہر می بینم

(حافظؒ)

یعنی خالی وعظ و نصیحت یا اپدیش نہیں بلکہ یہ ایک عملی پروگرام دیتا ہے

جن سے وہ تمام روکاٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان وعظ اور نصیحت پر عمل نہیں کر سکتا۔ ان روکاوٹوں کو قرآن کی زبان میں ابلیس و شیطان کہا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہر شخص کی روکاوٹیں جدا ہوں گی۔ اور اسی طرح ہر قوم اور ہر زمانے کی جدا۔ یعنی قرآن کی اصطلاح میں ہر شخص کا شیطان دوسرے شخص سے مختلف ہے۔ اور ہر زمانے اور ہر قوم کا شیطان الگ الگ اسلحے سے مسلح ہوتا ہے۔ ان تمام باریکیوں پر نگاہ رکھنا کسی ایک زمانے اور ایک ماحول کے پلے ہوئے انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام بھی قرآن ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے کیا۔ اور خوب کیا اور اس قسم کے علوم و شواہد بھی اپنے اندر جمع کر دیئے ہیں۔ جو ایک طرف ایک عامی کے لئے اطمینان کا باعث بن جائیں۔ اور دوسری طرف ایک بڑے سے بڑے صاحب فکر کے لئے قلب اور دماغ کی الجھنوں کو بھی صاف کرتے جائیں۔ جو ہزار سال پہلے کی دنیا کے مسائل اور مشکلات کا حل بھی پیش کر دیں۔ اور جو آج کی پیچ در پیچ دنیا کے دکھوں کا علاج بھی بتا دیں۔ یہ ہے قرآن کا کام جسے کوئی انسانی عقل سرانجام نہیں دے سکتی۔ اور جب کیفیت یہ ہے تو پھر انسانی دماغوں کی بنائی ہوئی کوششیں (خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔) کس طرح سے قرآن کی جگہ دین بن سکتی ہیں۔؟ لہٰذا میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ دین اسلام کو سمجھنے کے لئے قرآن پر قناعت کریں۔ اور قرآن ہی پر اپنی تمام تحقیق و تلاش کا انحصار رکھیں۔ اور جو وہ کہتا ہے۔ اس پر عمل کریں۔ پھر دیکھیں وہ آپ کو کہاں

Marfat.com

سے کہاں لے جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ میری قوم کی اکثریت ابھی اس لطف سے محروم ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے ساتھ غیر قرآنی آمیزشوں سے مری نگر کا دریائے جہلم بن رہی ہے جس سے ہر ذوق سلیم رکھنے والا دور رہنے کی کوشش کرے۔

Marfat.com

قرآن فہمی کا طریق

محترم عرشی صاحب کا مکتوب گرامی (پرویز صاحب کے نام)

"سلیم کے نام" خط (جون ۱۹۵۱ء) میں نے آج دوبارہ پڑھا۔ دراصل ان خطوط[1] میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے نئے راستے کھل رہے ہیں۔ جو بظاہر نئے ہیں اور حقیقتاً پرانے۔ یعنی ایں واں سے صرف نظر کر کے صرف قرآن کو سامنے رکھنا۔ جیسا کہ قرن اول میں تھا۔ اس تازہ خط میں کئی باتیں ہیں۔ جن پر مفصل اظہار رائے کی ضرورت ہے سردست صرف دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

(۱) آپ کے قلم سے شاید روح القدس نے یہ فقرے لکھوا دیئے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کے اس اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کر لیں جو خاص خاص ادوار کا پیدا کردہ ہے قرآن کے الفاظ کے وہ معانی متعین کریں۔ جو زمانہ نزول

---

[1] ان خطوط کا مجموعہ الگ شائع ہو رہا ہے (طلوع اسلام)

Marfat.com

قرآن میں رائج تھے۔ اور ان معانی کی روشنی میں اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق قرآن کا مفہوم ازسرِ نو متعین کریں۔

آپ نے بڑی بات کہہ دی ہے۔ فقہا و محدثین کی بے شمار اصطلاحات نے ہم کو اس قرآن سے بہت دور پھینک دیا ہے جو قدیم مخاطبین قرآن نے سمجھا اور سمجھتے ہی پیتل سے سونا اور کانچ سے الماس بن گئے یعنی ابھی ابھی وہ لٹیرے، وحشی، لڑاکے۔ فاسق و فاجر۔ جواری۔ شرابی اور نہ جانے کیا کیا تھے کہ اچانک پردہ گرتا ہے۔ اور اس کے دوبارہ اٹھتے ہی وہی خونخوار چہرے مقدس و نورانی بن جاتے ہیں۔ ان کی ہر ادا میں دل نوازی اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے ان کے سامنے سو پچاس بڑے بڑے فقیہہ و محدث اور قرآن کی بجائے صحاح ستہ و شرح وقایہ وغیرہ پیش کی جاتیں۔ تو یقیناً یہ نتیجہ نہ نکلتا جو تاریخ کے آسمان پر ستاروں سے زیادہ روشن نظر آ رہا ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر ضرورت ہے کہ قرآن کو انہی معنوں میں سمجھا جاتے۔ جن میں صحابہؓ نے سمجھا تھا۔ اور یہ نکتہ بھی آپ نے خوب کہا کہ

"اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق"

[illegible] اور ہمارے موجودہ مریضانہ حالات میں نہایت

Marfat.com

مشکل بھی۔ وہ ذہن جو صدیوں سے اصطلاحی مفہوموں سے متاثر بلکہ اذن ہو چکے ہیں۔ اس وقت منڈی میں انہی کی درآمد و برآمد ہو رہی ہے۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ " اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کریں" قطعاً ناممکن ہے سوائے کے ایک طلوع اسلام ہے اور اس کے دو ایک لکھنے والے جن کا بحالت موجودہ اس امر عظیم سے عہدہ برا ہونا سخت دشوار نظر آتا ہے (لیکن اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی بعید نہیں)

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ " فطرت " کے مروجہ معانی کی تردید میں آپ نے معقول قدم اٹھایا ہے۔ اور جو معنی اپنی طرف سے پیش کئے ہیں وہ قرآن مجید کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طریق پر سارے قرآن کے نہ سہی خاص خاص الفاظ کے معانی تلاش کر لئے جائیں تو آئندہ کے لئے راستہ تیار ہو جاتا ہے۔ اور یہ کام کسی تنہا دماغ کے بس کی بات نہیں۔ مفکرین کی ایک جماعت ہو جو قرآن کے اندر غوطے لگا کر ان موتیوں کو برآمد کرے۔

جواب۔

میں نے محترم عرشی صاحب کا یہ خط اس لئے شائع کیا ہے کہ اس میں انہوں نے جس ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ فی الواقعہ بڑی اہم ہے۔ اور اس قابل کہ ملک کا سوچنے والا طبقہ اس پر غور و فکر کرے۔

Marfat.com

میں عمر بھر ان اسباب و علل پر غور کرتا رہا جن کی وجہ سے مسلمان اس سرچشمہ حیات (یعنی قرآن کریم) سے دور ہوتے چلے گئے جس نے انہیں ایک زمانہ میں زندگی اور اس کی تمام سعادتوں سے نوازا تھا۔ مجھے منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی نظر آیا (اور یہ سبب بڑا بنیادی تھا) کہ ہمارے ہاں قرآن کے الفاظ کا جو مفہوم مروج ہے وہ بیشتر غیر قرآنی ہے۔ اس کے لئے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم چونکہ قرآن کو ترجموں کے ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس کی اصل سے ناواقف رہ جاتے ہیں لہذا قرآن سمجھنے کے لئے عربی جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن عربی زبان میں ہے۔ اور جب تک ہم عربی نہ جانیں قرآن کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ لیکن اس سے اس مشکل کا حل نہیں ہوتا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ جن حضرات نے قرآن کے ترجمے کئے ہیں وہ تو عربی جانتے تھے۔ اگر عربی جاننے سے صحیح قرآن سمجھ میں آجاتا تو ان کے ترجموں سے بھی قرآن سمجھ میں آجانا چاہیئے تھا۔ تمام تر نہیں تو کم از کم قریب قریب۔ دوسری چیز یہ (اور یہ پہلی سے بھی زیادہ اہم ہے) کہ آج مسلمانان عالم کا بیشتر حصہ ایسا ہے۔ جس کی مادری زبان عربی ہے ان کیلئے صحیح قرآن سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی قریب قریب اسی قسم کا قرآن سمجھتے ہیں۔ جس قسم کا قرآن ہمارے ہاں ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ آپ عربی ممالک (یعنی عربی بولنے والے مصنفین) کی مذہبی کتابیں اٹھا کر دیکھئے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے۔ ان میں اور اپنے ہاں کی مذہبی کتابوں

Marfat.com

میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ مجھے ایک عرب ادیب کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ادب کا امام زبان پر اس قدر عبور کہ ایک ایک لفظ کی بیسیوں سندات مستحضر، ایسا نظر آتا تھا کہ اسے بڑے بڑے عربی لغت، شعراء کے دوادین اور کتب محاضرات حفظ یاد ہیں۔ مرادفات کے معانی میں ایسا لطیف فرق بتاتا تھا کہ سنکر لطف آجاتا تھا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہتی جب میں دیکھتا کہ جونہی قرآن کی کوئی آیت سامنے آتی وہ وہی مفہوم بیان کرتا جو ہمارے مکتبوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اور جس میں قرآن کہیں نام کو نہیں ہوتا۔

قرآن کا مروجہ مفہوم

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں بھی قرآن کو انہی تفاسیر کے ذریعے سمجھا جاتا ہے جو عجم زدہ ذہنیتوں کی پیداوار ہیں اور اس ماحول کی تخلیق جس میں مسلمان قرآن سے دور ہو چکا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں قرآن کا ایک خاص مفہوم متعین ہو چکا ہے اور عرب ہوں یا غیر عرب ہر جگہ وہی متعین مفہوم رائج ہے۔ لہٰذا قرآن سے بُعد کا اصلی سبب عربی نہ جاننا نہیں۔ اس کا سبب وہ مصطلحہ مفہوم ہے۔ جو ہمارے ہاں ایک مدت سے رائج چلا آرہا ہے اور یہ مفہوم عجمی ہے۔ قرآنی نہیں۔ ہم قرآنی الفاظ کے معانی انہی اصطلاحات کی رو سے سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ہماری عربی وہ عربی ہی نہیں رہی جو زمانۂ نزول قرآن میں تھی۔ اس کے الفاظ تو بیشک وہی ہیں۔ لیکن ان الفاظ کا مفہوم عجمی تصورات کا پیدا کردہ ہے۔ اور یہی مفہوم عرب و عجم ہر جگہ رائج ہے۔ اس

Marfat.com

لئے قرآن کا صحیح مفہوم نہ عربی جاننے والے سمجھتے ہیں۔ نہ وہ جو عربی نہیں جانتے اور قرآن کو ترجموں سے سمجھتے ہیں۔

جب قرآن نازل ہوا تو ان اصطلاحات میں سے کسی کا بھی وجود نہ تھا جو بعد میں فقہ، روایات، تصوف کلام وغیرہ کی رو سے پیدا ہوئیں۔ اور آہستہ آہستہ دین کا جزو بنتی گئیں۔ اگر ان اصطلاحات سے مقصود وقتی مسائل کا حل ہوتا (اور ان کا دائرہ عمل وہیں تک محدود رہتا) تو اس میں کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن مصیبت یہ ہوگئی کہ ان چیزوں کو دین کا مستقل اور غیر متبدل جزو سمجھ لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود قرآن بھی انہی کی روشنی میں سمجھا جانے لگا۔ اور رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ بجائے اس کے کہ قرآن متن اور اصل رہتا اور یہ چیزیں اس کی شرح اور جزئیات سمجھی جاتیں۔ یہ چیزیں اصل اور متن بن گئیں اور قرآن ان کا شارح ہو کر رہ گیا۔ اب قرآن کا سارا مفہوم انہی (بعد کے پیدا شدہ) تصورات کی تشریح ہے۔ اور قرآن کا یہی مفہوم ہر جگہ پڑھایا اور سمجھایا جاتا ہے۔ خواہ عرب ہو یا عجم۔

×

عربی مبین

قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ "عربی مبین" میں نازل ہوا ہے۔ یعنی اسی واضح اور سادہ زبان میں جو اس وقت عام طور پر بولی جاتی تھی۔ اس زمانہ کے عربوں کی معاشرت بالکل سادہ تھی۔ وہ عجم کے تکلفات اور حضارت کے اثرات سے غیر متاثر تھے۔ صحرا کی کھلی فضا۔ کھجوروں کے خوشے متاع حیات

Marfat.com

پالتو مویشی۔ ایک آدھ خیمہ، دن میں کوئی نخلستان منزل گاہ۔ راتوں کو ستارے دلیل راہ۔ یہی چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھیں اور انہی کے گرد ان کی زبان کے مشتقات و مصادر گھومتے تھے۔ آپ ان مشتقات کو دیکھئے۔ ان کا بیشتر حصہ اونٹ گھوڑے بکریاں۔ خیمے۔ نخلستان کھجوریں۔ تلوار، صحرا، چاند، سورج ستاروں کے محسوس مشاہدات پر مبنی ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس زبان میں وسعت بھی ایسی تھی کہ انہی مشتقات سے نکلے ہوئے الفاظ ایک دنیا کو محیط ہو جاتے تھے۔ اس زبان کی امکانی وسعتوں کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ مشہور معتزلی امام واصل بن عطاء حرف را (ر) کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ خطابت اس زمانے میں سب سے بڑا ہتھیار تھا اور اس کی سحرکاریاں فصاحت اور بلاغت کی رہین کرم تھیں۔ ایک نئے فرقے کے امام کی حیثیت سے واصل کو عمر بھر تقریریں کرنی پڑیں مناظروں اور مباحثوں میں سرگرم تکلم رہنا پڑا لیکن اس نے کہیں کسی جگہ کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس میں (ر) آتا ہو۔ اندازہ لگائیے کہ اس کے پاس کس قدر مرادفات کا ذخیرہ تھا۔ اور پھر غور فرمایئے کہ وہ زبان جس کے الفاظ کے سرمایہ کا یہ عالم تھا کس قدر وسعت بداماں تھی۔

بہرحال جب قرآن نازل ہوا۔ تو اس کے اولین مخاطبین نے اسے بغیر کسی دقت کے سمجھ لیا۔ اس کے لئے نہ انہیں کسی تفسیر کی ضرورت تھی۔ نہ ان اٹھارہ علوم کی جنہیں اب قرآن سمجھنے کے لئے لازمی شرط قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ

الفاظ جن میں قرآن نازل ہوا تھا ان کی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہوتے تھے۔ لہٰذا وہ جانتے تھے کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ تغیر احوال و کوائف سے زبان پر کیا کیا اثرات پڑتے ہیں اس سے علم اللسان کا ہر طالب علم واقف ہے۔ عربی زبان ان تغیرات سے خاص طور پر متاثر ہوئی

بعد کے تغیرات

اس لئے کہ ہمارا علمی دور بالخصوص عباسیوں کا زمانہ تھا جب عربی ذہنیت سمٹ کر پیچھے ہٹ چکی تھی۔ اور عجمی اثرات پورے کے پورے اسلامی معاشرے پر چھا چکے تھے۔ ان عجمیوں نے زبان تو عربی اختیار کی لیکن تصورات اپنے ہی رکھے۔ اس طرح عربی زبان عجمی تصورات کے اظہار کا ذریعہ Vehicle بن گئی یہی وہ دور ہے جس میں ہماری تصنیفات کا آغاز ہوا۔ لہٰذا ہماری ان کتابوں کی زبان تو عربی تھی۔ لیکن ان عربی الفاظ کا مفہوم وہ نہ تھا جو زمانہ نزول قرآن میں عربوں کے ذہنوں میں ہوا کرتا تھا۔ یہ تو پھر بھی بعد کی بات ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب غیر عربوں سے خلا ملا کی ابتدا ہوئی تو آپؓ مدینے کے رہنے والوں سے کہا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدوؤں میں جا کر چند دن گذارا کرو کیونکہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے وہ زبان ان کے ہاں غیر متاثر شکل میں باقی ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ جس عربی زبان میں ہمارے عجمی ائمہ مذہب نے کتب تفاسیر وغیرہ لکھی ہیں وہ زبان معنوی اعتبار سے قرآن کی زبان سے کس قدر قریب ہو سکتی ہے! یہی وہ زبان ہے جس میں ہمیں قرآن

Marfat.com

سمجھا یا جاتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ سمجھا یا جاتا ہے وہ درحقیقت قرآن نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ غیر قرآنی مفہوم ہوتا ہے جسے قرآنی الفاظ میں سمو دیا گیا۔

اندریں حالات قرآن سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس کے بعد کے مفہوم سے صرف نظر کر کے دیکھا یہ جائے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اس وقت ان الفاظ کے معانی کیا تھے۔ جو قرآن میں آئے ہیں۔ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے ہاں اتنا ذخیرہ موجود ہے جس سے ان الفاظ کے وہ معانی متعین کئے جا سکتے ہیں جو اس زمانے کے سیدھے سادے عربوں کے ہاں رائج تھے۔ یہ ذخیرہ مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے لیکن اسے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ فلہٰذا سب سے پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ ایک ایسا لغت مرتب کر دیا جائے جس میں یہ بتایا جائے کہ قرآن کے الفاظ کے اصلی مادے کیا ہیں اور زمانہ نزول قرآن میں یہ الفاظ کن معانی میں استعمال

قرآن کا لغت

ہوتے تھے (اگر ہو سکے تو یہ بھی بتایا جائے کہ بعد میں ان الفاظ کے معانی میں کیا کیا تغیرات واقع ہوئے۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی کیا جا سکے تو چنداں مضائقہ نہیں) میری نگاہ سے قرآن کا کوئی لغت ایسا نہیں گذرا جس میں خصوصیت سے اس انداز سے قرآنی مفردات کے معانی متعین کئے گئے ہوں۔ متاخرین میں علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اس ضمن میں کوشش شروع کی تھی۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یوں سمجھئے کہ وہ اس عظیم کام کو چھو کر چلے گئے۔ انھیں عہد جاہلیہ کی زبان پر اتنا عبور اور قرآن

Marfat.com

کے ساتھ ایسا شغف تھا کہ وہ اگر کچھ مدت اور زندہ رہتے تو اس باب میں مفید کام کر جاتے۔

اس لغت کے مرتب کر لینے کے بعد دوسرا مرحلہ قرآنی الفاظ کے مفہوم کو ہمارے دور کی علمی سطح کے مطابق سمجھانا ہو گا۔ اس کے لئے کرنا یہ ہو گا کہ ہر لفظ کی اس روح کو سامنے رکھا جائے۔ جو اس کی اصل کی رو سے بے نقاب ہوئی ہے۔ اور پھر دیکھا جائے کہ اس روح کو موجودہ زمانے کے کن الفاظ میں ٹھیک ٹھیک ادا کیا جا سکتا ہے۔ خواہ ایک لفظ میں، خواہ ایک فقرہ میں۔ اور خواہ ایک مضمون میں۔ اس کے بعد دیکھ لیا جائے کہ قرآن میں وہ لفظ کس کس جگہ استعمال ہوا ہے کیونکہ قرآن تصریف آیات سے اپنے معانی آپ سمجھاتا ہے۔ اس طرح قرآن کا صحیح صحیح مفہوم ہمارے سامنے آ جائے گا۔ میں نے اس طریق پر خود عمل کیا ہے۔ اور اس کے ایسے درخشندہ نتائج سامنے آئے ہیں جن سے روح وجد کرنے لگ جاتی ہے۔ اور میں حیران رہ جاتا ہوں کہ اگر قرآنی الفاظ کی اصل کو سامنے رکھ لیا جائے تو پھر قرآن کس طرح اپنے مشکل سے مشکل مقامات کو بھی نہایت آسانی سے سمجھاتا چلا جاتا ہے

یہ لغت اگر ایک مرتبہ صحیح طور پر مرتب ہو گیا تو ہمیشہ کے لئے کام آئے گا۔ لیکن قرآن کا جو مفہوم اس لغت کی روشنی میں متعین کیا جائے گا۔ وہ ہر آنے والے زمانے کی علمی سطح کے ساتھ ساتھ improve ہوتا جائے گا۔

Marfat.com

میں محترم عرشی صاحب سے حرف بحرف متفق ہوں کہ یہ کام کسی فرد کا نہیں جماعت کے کرنے کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت ہے کہاں جو اس کام کو ہاتھ میں لے، ہمارے ہاں مذہب کے نام پر لاکھوں روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ قرآن کا مصرف صرف اس کے الفاظ کی تلاوت ہے جس سے "ثواب" ہوتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ قرآن سے باہر ہے۔ لہٰذا مذہب کے نام پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ ان چیزوں کے لئے وقف ہوتا ہے۔ جو خارج از قرآن ہیں۔ اگر کہیں سے رجعت الی القرآن کی آواز اٹھتی ہے تو مسلمانوں کو اس آواز سے اس طرح ڈرا دیا جاتا ہے گویا اس آواز کے کان میں پڑجانے سے ان کی عاقبت خراب ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اگر مسلمان قرآن کی طرف آجائیں تو ان کی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اندریں حالات وہ وسائل کہاں سے میسر آئیں جو اس قسم کا قرآنی لٹریچر مرتب کرنے کے لئے ضروری ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کام کے اہل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جب اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر دیں گے تو ان کی ضروریات زندگی کا سامان کہاں سے آئے گا! یہ انگلستان نہیں کہ ایک لارڈ نارتھمبرلینڈ عربی کا لغت مرتب کرانے کے لئے اپنی ریاست وقف کر دے گا۔ ان حالات کے پیش نظر یہاں قرآن کے متعلق کسی کام کا ارادہ کرنے والوں

لے اس لارڈ نے تنہا اپنے خرچ سے Lane's Lexicon مرتب کرایا تھا جس کی تکمیل میں بیس برس صرف ہوئے تھے)

کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ انھیں جو کچھ کرنا ہوگا۔ تنہا اپنے بھروسے پر کرنا ہوگا۔ جس نہج

معارف القرآن

پر معارف القرآن لکھی گئی ہے اس کا خاکہ علامہ اقبالؒ کے ذہن کا رہین منت ہے۔ میں نے اس خاکہ کو ایک مفصل خط کی صورت میں ملک کے ارباب علم وقلم کو بھیجا۔ اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اس قسم کی کتاب کی افادیت سے متفق ہیں تو وہ ایسی کتاب تصنیف کریں۔ ان تمام حضرات نے کتاب کے خاکے کی بہت تعریف کی۔ لیکن ہر ایک نے یہ لکھ کر معذرت چاہی کہ ایسا کام افراد کا نہیں۔ جماعتوں کے کرنے کا ہے۔ میں نے حضرت علامہؒ کو اس سے مطلع کیا اور لکھا کہ اس کام کے لئے کوئی آدمی تیار نہیں ہوتا۔ انھوں نے اسی خط کے حاشیے پر لکھ کر خط واپس کر دیا کہ اگر کچھ وقت کے لئے تمہیں آدمی بن جاؤ تو اس میں کیا ہرج ہے؟ یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ اس قسم کا قرآنی انسائیکلوپیڈیا لکھنے کے لئے وہ میری طرف اشارہ کریں گے۔ میں نے جب اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی۔ تو انھوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات لکھی جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ تم مسافت کی لمبائی اور راستہ کی تاریکی سے ڈرتے ہوئے قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس جو چھوٹا سا مٹی کا دیا ہے وہ صرف دو چار قدم تک راستہ روشن کر سکتا ہے۔ تمہارا یہ خوف اسی وقت تک ہے جب تک تم اس دیئے کو لے کر ایک جگہ کھڑے ہو۔ تم اسے لے کر چل پڑو۔ اور پھر دیکھو کہ یہی چھوٹا سا دیا کس طرح سینکڑوں میل کا راستہ روشن کئے

Marfat.com

چلا جاتا ہے۔ نقص دیئے کا نہیں تمہارا اپنا ہے۔ تمہارے چلنے کی دیر ہے۔ یہ روشنی تم سے چار قدم آگے آگے ہو گی۔ اور جہاں تک چلتے جاؤ گے آگے ہی رہے گی۔

میں نے بلا مزید استفسار و تامل اس ننھے سے دیئے کو ہاتھوں میں لے کر چلنا شروع کر دیا۔ اور تجربے نے بتا دیا کہ یہ دیا فی الواقعہ میرے راستہ کو مسلسل روشن کرتا چلا گیا۔ معارف القرآن کی چار جلدیں (بتوفیق خداوندی) شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں زیر ترتیب ہے۔ میں جب اپنی قطع کردہ راہ پر نگہ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ ساری مسافت میں نے ہی طے کی ہے؟ اگر اللہ نے مجھے اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے مہلت دی اور توفیق عطا کر دی تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی رائیگاں نہیں گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری گوناگوں مصروفیات اور خرابیٔ صحت کے پیش نظر میرے لئے معارف القرآن کی تکمیل کا کام ہی کچھ کم نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ قرآن کا ایک ایسا لغت مرتب کرنا جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے مطابق قرآنی مفہوم کا متعین کرنا از بس ضروری ہے۔ اگر یہ ہو گیا تو جو موانع اس وقت قرآن سمجھنے کی راہ میں سنگ گراں بنکر حائل ہیں وہ دور ہو جائیں گے۔ اور اس طرح مسلمان ایک مرتبہ پھر اپنے سرچشمۂ حیات (قرآن) کے نزدیک آ جائے گا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے میں جانتا ہوں کہ یہ کام ایک جماعت ہی کے کرنے کا ہے۔ لیکن میں جماعتوں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میں نے توفیق ایزدی کے بھروسے پر اس کام کو بھی از خود ہی شروع کر دیا ہے۔ اور یہ سلسلہ بھی معارف القرآن

کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس باب میں میں کس حد تک کامیاب ہو سکوں گا نہ ہی میں اس چیز کو میں آغاز سفر کے وقت دل میں آنے دیا کرتا ہوں۔ جب تک مجھ میں ہمت رہے گی اور زندگی وفا کرے گی۔ میں ان کاموں کو کرتا جاؤں گا۔ جس مقام پر ہمت یا زندگی ختم ہو جائے گی۔ وہیں یہ بھی رک جائیں گے۔ اگر اس دوران میں اللہ کے بندوں کو خیال آگیا اور اس طرح رفقائے کار کی کوئی جماعت پیدا ہو گئی۔ تو میں یہ سب کچھ ان کے سپرد کر کے بطور ایک رفیق کار ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میری یہی متاعِ حیات شاید کسی بعد میں آنے والے کے کام آجائے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں غلطیوں کا بھی امکان ہے۔ اور خامیوں کا بھی۔ لیکن میں نے کام کی ابتدا کر دی ہے۔ میرے دوسرے رفقائے کار (اگر مجھے میسر آگئے تو) یا بعد میں آنے والے راہرو میری غلطیوں کو درست کر دیں گے اور خامیوں کو پورا۔ اگر یہ سب کچھ اور کسی کام بھی نہ آیا تو کم از کم میرے بعد انہی راستوں پر چلنے والے راہروؤں کو میرے نقوشِ قدم سے اتنی تسلی تو ہو جائے گی کہ اس راستے سے پہلے بھی کوئی مسافر گزرا ہے۔ اس لئے یہ راہ غیر مانوس Unfrequented نہیں۔ اتنی سی تسلی بظاہر کچھ قابل قدر دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن میں اس کی قیمت پہچانتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے یہ بھی میسر نہیں آسکی۔

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں رفقائے کار کی تلاش یا فراہمی سے بے فکر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ [illegible] مجھے [illegible]

Marfat.com

تو مل رہے ہیں۔ وسائل سفر نہیں مل رہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ جب وہ لوگ جن کے دل شوق شہادت سے لبریز ہیں۔ لیکن ان کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لئے نہ سواری ہے نہ روپیہ کہ جس سے سواری کا جانور خرید سکیں۔ تمہارے پاس (اے رسول) بایں مقصد آتے ہیں کہ ان کے لئے سواری کا بندوبست کر دیا جائے۔ اور سواری کا انتظام تمہارے پاس بھی نہیں ہوتا تو ان لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تولوا و اعینھم تفیض من الدمع حزنا الا یجدوا ما ینفقون (۹۲) وہ اس طرح واپس جاتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور اس حسرت سے غم آلود کہ ان کے پاس اتنا بھی نہیں جس سے جہاد کا سامان بھی بہم پہونچالیا جائے۔

لیکن ہمیں ان مساعد حالات سے گھبرانا نہیں چاہیئے کہ ہر تاریک رات ایک نورانی صبح کی تمہید ہوتی ہے۔ واللہ المستعان علیہ توکلت و الیہ انیب۔

پرویز

کراچی ریڈیو اور درس قرآن

ایک صاحب کراچی سے تحریر فرماتے ہیں دسمبر ۱۹۵۰ء کے طلوع اسلام میں آپ نے ضمناً اس درس قرآن کی ایک مثال لکھی ہے جو ایک عرصے سے کراچی ریڈیو اسٹیشن سے صبح کے وقت نشر ہوتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کو اس باب میں صرف ایک

مثال ہی کیوں ملی۔ وہ درس تو شروع سے آخیر تک اسی قسم کے قصوں، کہانیوں اور داستانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں کہانیوں سے آگے بڑھ کر "حقائق" بیان ہوتے ہیں تو اس قسم کے کہ اللہ تعالیٰ نے حروف مقطعات یعنی الف، لام، میم وغیرہ رسول اللہ کو اس طرح پڑھائے جس طرح ایک مدرس بچے کو الف، بے۔ تے پڑھاتا ہے اس درس میں بالخصوص اللہ تعالیٰ کے متعلق جس قسم کا تصور پیش کیا جاتا ہے اسے سنکر نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں کہ غیر مسلم قرآن کے پیشکردہ خدا کے متعلق کیا کہتے ہوں گے۔ یہ تصور ایک مستبد، قاہر اور جابر مطلق العنان بادشاہ کا تصور ہوتا ہے جسے نہ کسی قاعدے اور قانون کی پروا ہے۔ نہ اصول اور آئین کا خیال، وہ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا ہے۔ اور انتہائی غیظ و غضب میں اس بندے کو عذاب دینے والے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے کہ اسے جہنم میں دھکیل دیں لیکن تھوڑی سی خوشامد اور تعریف سے خوش بھی ایسا ہو جاتا ہے کہ بڑے سے بڑا جرم معاف کر دیتا ہے۔ اور انسان کو سیدھا جنت میں بھیج دیتا ہے۔ انسان اس دنیا میں ایک مجبور مشین ہے کہ جسے کسی بات پر کوئی اختیار نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسے ہر عمل کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ وہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ اور جب وہ کوئی حرکت کرتا ہے۔ تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی۔ پھر اس درس کی رو سے اس دنیا کو ذلیل اور قابل نفرت ٹھہرایا جاتا ہے۔ محتاجی اور افلاس کو خدا کے مقرب بندوں کی علامتیں قرار دیا جاتا ہے یہ اور اسی قسم کی اور تعلیم ہے

Marfat.com

جو اس درس کی رو سے روزانہ نشر کی جاتی ہے۔ اور اس کا نام رکھا جاتا ہے "درس قرآن"۔ خدا کے لئے کوشش کیجئے کہ یا تو ریڈیو سے قرآن کی صحیح تعلیم نشر ہو۔ اور اگر اس میں کوئی ایسی ہی دشواریاں ہیں تو کم از کم یہ سلسلہ تو بند کر دیا جائے تاکہ دنیا ہم پر ہنسے تو نہیں۔ اور ہمارے بچے اس قسم کے غلط تصورات کو اپنے ذہن میں رکھ کر نہ بڑے ہوں

جواب۔

ہم نے یہ خط ان استفسارات کے نمونے کے طور پر شائع کیا ہے جو ریڈیو پاکستان کے درس قرآن کے سلسلہ میں ہمارے پاس اکثر موصول ہوتے رہتے ہیں۔ استفسارات کا یہ سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے۔ لیکن ہم نے اس موضوع پر آج تک قلم نہیں اٹھایا کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے بوسیدہ پیراہن پیوند لگانے سے کبھی درست نہیں ہوا کرتے۔ یہ تمام چیزیں مرض کی علامات ہیں اس کی علت کچھ اور ہے۔ مثلاً اسی سوال کو لیجئے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ اول یہ کہ ریڈیو پاکستان اس قسم کی افسانوی تعلیم کو قرآن کے نام سے کیوں شائع کرتا ہے۔ اور دوسرا حصہ یہ کہ درس دینے والے مولوی صاحب اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ میں کون سی تعلیم قرآن کے نام سے پیش کر رہا ہوں۔ پہلے سوال کے متعلق اصولاً اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ارباب اقتدار کا مسلک دو قسم کا ہو سکتا ہے ایک تو یہ کہ حکومت کی طرف سے وہ کچھ کیا جائے جس سے مملکت کے عوام مطمئن رہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمیشہ عوام کے جذبات کا خیال رکھا جائے اور کوئی بات ایسی نہ کہی جائے جو عوام کے عقائد یا خیالات کے خلاف ہو۔ خواہ وہ عقائد

Marfat.com

یا خیالات کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ دوسرا مسلک یہ ہوتا ہے کہ عوام کے غلط خیالات اور اعتقادات کی اصلاح کی جائے۔ ان کے سامنے صرف وہ بات پیش کی جائے۔ جو حق ہو اور انھیں ہر اس بات سے روکا جائے۔ جو باطل ہو۔ اور اس باب میں ان کے جذبات کا قطعاً کوئی خیال نہ کیا جائے جس طرح ایک شفیق ڈاکٹر اپریشن کے وقت مریض کے چیخنے چلانے کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ اس کی نگاہ مریض کے اصلاح حال پر ہوتی ہے اور وہ بلا تامل اپنی نوک نشتر کو زخم کی گہرائیوں تک لے جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اصلاحی اور انقلابی مسلک کے لئے بڑے عزم و ثبات کی ضرورت ہے۔ اور بڑی جرأت اور بسالت کی احتیاج۔ اس قسم کا مسلک اختیار کرنے والے کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہی قوموں کی تقدیروں کا رخ بدل سکتے ہیں، مسلمانوں میں غلط تعلیم اور غیر قرآنی معتقدات خون کے ذرات تک میں سرایت کر چکے ہیں۔ اور ان کی اصلاح کے لئے بڑے تیز نشتر کی ضرورت ہے۔ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے عافیت اسی میں سمجھی جاتی ہے کہ لوگوں کے خیالات اور معتقدات کے مطابق مسلک اختیار کیا جائے تاکہ وہ مطمئن رہیں کہ ہماری اسلامی حکومت کی طرف سے اسلام کی بڑی خدمت ہو رہی ہے۔ ہم اس باب میں ارباب حل و عقد میں سے کسی کو بھی مورد الزام نہیں سمجھتے۔ قوم کے فکر و نظر میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ نہ ہی قوم میں کوئی ایسے افراد نظر آتے ہیں جن کے ہاتھوں اتنے بڑے انقلاب کا امکان ہو سکے۔ اس کے لئے ہماری سمجھ میں تو اس کے

Marfat.com

سوا کوئی دوسری بات نہیں آتی جسے ہم اس سے پیشتر کئی بار دہرا چکے ہیں۔ اور جس کے عوض اکثر گوشوں سے ہدف طعن و تشنیع بھی بن چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہمارے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے جس سے قوم کا پورے کا پورا طبقہ اس انقلاب کا سودا سر میں لے کر اٹھے جس سے یہ زمین بدل جائے۔ یہ آسمان بدل جائے۔ اور قوم کے خیالات پھر سے حقائق سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اس مقصد کو حکومت کی مدد کے بغیر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم بدل دیجئے

سرسید نے سمجھا کہ قوم کی فلاح تعلیم جدید میں ہے تو اس نے اتنی عظیم القدر درس گاہ کی بنیاد رکھ دی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سمجھا کہ مسلمانوں کی نجات مذہبی تعلیم کے حصول میں ہے تو انھوں نے حکومت کی مدد کے بغیر ایک اتنی بڑی مذہبی تعلیم گاہ کو قائم کر دکھایا۔ آپ کو ان حضرات کے نکات نگاہ سے اتفاق ہو یا اختلاف۔ ان کی کوششوں کے ثمرات کو آپ قوم کے حق میں تریاق سمجھیں یا زہر ہلاہل۔ لیکن اس سے تو آپ کسی صورت میں اختلاف نہیں کر سکتے کہ تعلیم کے معاملہ میں افراد کی کوششیں حکومت کی مالی امداد کے بغیر بھی وہ کچھ کر دکھاتی ہیں۔ جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت ضرورت ہے ایسی درسگاہوں کی۔ جن میں علوم حاضرہ اور قرآن خالص کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانے پر دی جائے، اور بچوں کے قلب و نگاہ کو قرآنی قالب میں ڈھالا جائے۔ یاد رکھئے قوم میں ایسے معلمین کی کمی نہیں۔ کمی ہے سرسید اور نانوتوی کی۔

اب لیجئے سوال کا دوسرا حصہ کہ جو مولوی صاحب درس قرآن پر مامور ہیں انھیں خود اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ان کا درس اس قدر مضحکہ انگیز ہے۔ اس میں بھی ہمارے نزدیک یہ صاحب قابل الزام نہیں۔ مولوی کسی فرد کا نام نہیں ہوتا۔

مولوی ذہنیت کا نام ہے

ایک ذہنیت کا نام ہوتا ہے۔ یہ ذہنیت ہر مولوی میں مشترک ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ نتیجہ ہوتی ہے اس غلط تعلیم کا جو ان بے چاروں کو ان کی درس گاہوں میں ملتی ہے وہ تعلیم عقل کو معطل کر دیتی ہے۔ اور کورانہ تقلید کو نہایت مزین بنا کر دکھاتی ہے۔ وہ یہ بتاتی ہے کہ جو کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہو حق ہوتا ہے۔ اور جس قدر وہ کتاب پرانی ہو اسی قدر اس کا حکم زیادہ محکم ہوتا ہے۔ اس لئے آپ درس قرآن کے لئے کسی مولوی صاحب کو مقرر کیجئے۔ نتیجہ ایک ہی نکلے گا۔ اس لئے کہ ان کے "علم" کا سرچشمہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر تو اقبال نے کہا تھا کہ

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب

قرآن کی بنیادی تعلیم خدا کا تصور ہے۔ اگر صرف اتنی سی چیز قرآن کے مطابق پیش کر دی جائے تو اس سے وہ بڑے بڑے اہم مسائل حل ہو سکتے ہیں جنھوں نے آج مفکرین عالم کو طلسم پیچ و تاب بنا رکھا ہے ——— خدا کا صحیح تصور، یعنی وہ تصور جو قرآن پیش کرتا ہے۔ حقیقت کلی کا تصور ہے اور دنیا کے مفکرین اسی حقیقت

Marfat.com

کی تلاش میں ملے مارے پھر رہے ہیں۔ اسی تصور سے انسان اور خدا اور انسان اور کائنات کے صحیح تعلق کی مثلث قائم ہوتی ہے۔ اور اسی تصور سے وہ تمام تضادات توافق میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جو انسان اور اس کے خارجی ماحول، انسان اور دوسرے انسان اور خود ایک انسان کے سینے کے اندر پیدا ہو کر وجہ کشمکش اور باعث رزم و پیکار بن جاتے ہیں۔ ان تمام تضادات میں توافق صرف خدا کے صحیح تصور سے پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا کا صحیح تصور انسان کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیتا ہے۔ یہ اسے اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر دیتا ہے۔ یہ اس کے سامنے اس کا نصب العین واضح طور پر متعین کر دیتا ہے۔ یہ اس کے لئے دلیل راہ بن جاتا ہے۔ یہ اسے اس کی منزل کا ٹھیک نشان بتا دیتا ہے۔ یوں کہنے کو تو ساری دنیا ایک ہی خدا کو مانتی ہے لیکن ساری دنیا کی تباہیوں کا باعث خدا کا غلط تصور ہے۔ قرآن اس بنیاد کو درست کرتا ہے اور پھر اس کے بعد انسانی زندگی کی جس قدر عمارت استوار ہوتی ہے وہ از خود درست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر ریڈیو پاکستان سے صرف اللہ کا صحیح تصور پیش کر دیا جائے تو فضائے عالم اسی کے نور سے جگمگا اٹھے۔

یہ آج نہیں تو کسی وقت ضرور ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ انسانیت کی نجات صرف اسی میں ہے۔ اور انسانیت کا مآل تخریب نہیں تعمیر ہے۔

Marfat.com

عجمی اسلام

آپ کے ہاں اسلام کے عجمی تصور سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن کاش کوئی مضمون یہ بھی ہوتا کہ یہ عجمی تصور ہے کیا؟

جواب۔

"عجمی تصور" کے متعلق اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے کہ

تفصیلِ معنیٔ غم الفت طویل ہے!

اور ویسے تو خفیف سا اک دل میں درد ہے

تفصیل داطناب کی طرف جایئے۔ تو مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا ہر گوشہ عجمی تصورات کی تصویر ہے۔ اس کی شرح کہاں تک کی جائے۔ اور اختصار کی طرف آیئے تو یہ سب کچھ اس ایک فقرہ میں سما جائے گا۔ کہ جو کچھ قرآن کے خلاف ہے سب عجمی تصورات کا نتیجہ ہے۔ خواہ اسے کیسا ہی مقدس نام کیوں نہ دیدیا جائے

اسلام نام ہے اس جماعتی نظام کا جو دنیا میں قرآنی آئین کو نافذ کرنے کا ضامن ہو۔ اس کے سوا جو کچھ ہے عجمی تصور ہے۔

(عجمی اسلام کے مزید تعارف کے لئے "اسباب زوال امت" ملاحظہ فرمایئے)

Marfat.com

اسلاف اور اقبالؒ

حضرت اقبالؒ خلافت الٰہیہ کے داعی ہیں۔ یہ دعوت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقا نے عملاً اٹھائی تھی۔ اور علمی حیثیت سے حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہم نے لیکن آپ اس باب میں حضرت اقبال کو پیش کرتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس مقصد عظیم میں تو سید احمد شہیدؒ کا مقام اور بھی بلند ہے!

جواب۔

حضرت سید شہیدؒ اور ان کے رفقا کی بلندیٔ مقام میں کیا کلام ہے جنوں نے خلافت الٰہیہ کے تمکن کے لئے عملاً قدم اٹھایا۔ اور اس راہ میں اپنی جانیں تک دیدیں۔ رضی اللہ عنہم اور رضوا عنہ۔ طلوع اسلام کے سابقہ اوراق اُلٹ کر دیکھئے ان حضرات علیہم الرحمۃ کا تذکرۂ جلیلہ متعدد مقامات پر باعث سعادت و برکات نظر آئے گا۔ لیکن ان کی زندگی عملی جہاد میں گزری۔ اس لئے انھوں نے اپنے پیچھے ایک لٹریچر نہیں چھوڑا جس کی روشنی میں اس مقصد عظیم کے مختلف گوشوں کی وضاحت کی جا سکے۔ علامہ اقبالؒ نے اس مقصد رفیع و منیع کو سامنے رکھ کر ہمارے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس کے مختلف

Marfat.com

پہلوؤں کو اس قدر واضح کیا ہے کہ اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ خلافت الٰہیہ سے مفہوم کیا ہے۔ اور دنیا کے دیگر نظامہائے زندگی کس طرح اس سے مختلف ہیں۔ فکر اقبال کی نشر و اشاعت، درحقیقت خلافت الٰہیہ کی تبیین و توضیح کا ذریعہ ہے اور طلوع اسلام اسی مقصد کے پیش نظر ان کے "نور بصیرت" کو عام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ باقی رہے شاہ ولی اللہ یا دیگر اسلاف کرام، سو یا تو ان کے یہاں یہ تصور واضح اور صاف طور پر ملتا نہیں۔ اور اگر کہیں ملتا ہے۔ تو اسے انھوں نے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا ہے۔ اس لئے وہ عصر رواں کے تقاضوں کے پیش نظر زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ طلوع اسلام نہ اشخاص پرست ہے نہ فرقہ پرست، اس کے نزدیک متقدمین ہوں یا متاخرین۔ ایک فرقہ کے ہوں یا دوسرے کے۔ جس جس نے جہاں جہاں قرآنی تصور حیات کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی چشم اعتراف اس کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ اور اس کی نشر و اشاعت اس کے لئے وجۂ مسرت و باعث سعادت ہے۔ یہی جذبہ پیغام اقبال کی نشر و اشاعت میں کارفرما ہے۔ اور یہ بھی اس کے نزدیک چراغ راہ ہے۔ منزل نہیں ہے!

Marfat.com

تصویر

شاید ہی کوئی ماہ ایسا گذرتا ہو جس میں یہ استفسار موصول نہ ہوتا ہو کہ شریعت کی رو سے تصویر کھنچوانا یا اس کا اپنے پاس رکھنا کیسا ہے۔ طلوع اسلام میں اس کے متعلق ایک دو مرتبہ لکھا جا چکا ہے، اب اسے پھر دہرایا جاتا ہے

قرآن میں تصویر کی ممانعت کہیں نہیں۔ بلکہ حضرت سلیمان کے تذکار جلیلہ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ان کے پاس دور دراز ملکوں کے اجنبی صناع جمع تھے یعملون لہٗ ما یشاء من محاریب وتماثیل (۳۴/۱۳) جو ان کی منشاء کے مطابق بڑی بڑی محراب دار عمارتیں اور تماثیل تیار کرتے تھے۔ "تماثیل" تمثال کی جمع ہے اور تمثال میں تصاویر اور مجسمے دونوں شامل ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب (i) خدا کا ایک اولوالعزم رسول تصاویر اور مجسمے تیار کراتا ہو اور (ii) قرآن اس کا ذکر کر رہا ہو اور (iii) اس کی ممانعت کہیں نہ آئی ہو۔ تو پھر از روئے قرآن تصویر کی ممانعت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ روایات میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ لیکن اول تو روایات کا ظنی ہونا انھیں دین میں سند کی حیثیت نہیں دے سکتا۔ اور اگر ان کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے۔ تو زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں

کہ ممکن ہے رسول اللہ نے کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ان کی ممانعت کردی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ازمنہ مظلمہ (زمانہ جہالت) میں انسان۔ مظاہر پرست اور انسان پرست واقع ہوا تھا۔ اس لئے وہ مجسمات اور تصاویر کی پرستش شروع کردیتا تھا۔ لیکن ہر مجسمہ اور ہر تصویر کی نہیں۔ بلکہ صرف انہی کے مجسموں اور تصویروں کی جن کی اسے پرستش مقصود تھی، لہذا وجۂ ممانعت، مظاہر فطرت یا انسانوں کی پرستش تھی نہ کہ نفس تماثیل۔ اگر اس دلیل کو محکم تسلیم کرلیا جائے کہ انسان (اللہ کے سوا) جن چیزوں کی پرستش کرتا ہے۔ انھیں باقی نہیں رہنے دینا چاہیئے تاکہ دنیا سے شرک مٹ جائے۔ تو غور فرمایئے کہ اس سلسلہ کائنات میں کس کس چیز کو مٹانا پڑے گا۔ انسان پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کرتا ہے۔ درختوں اور حیوانوں کی پرستش کرتا ہے۔ زمین کی اور اجرام سماوی (چاند سورج، ستاروں) کی پرستش کرتا ہے۔ وہ ان چیزوں کی تصاویر کی پرستش نہیں کرتا بلکہ خود ان چیزوں کی پرستش کرتا ہے۔ تو کیا اس شرک کو مٹانے کے لئے ان تمام چیزوں کو مٹا دیا جائے گا جن کی یہ پرستش کرتا ہے۔ کیا ان کا مٹانا ممکن بھی ہے۔ انسان پرستی میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے مٹا دینے سے ان کی پرستش نہیں ہوگی لیکن ذرا گہرائیوں میں جاکر دیکھئے کہ کیا ان کے مٹانے سے واقعی شرک مٹ جاتا ہے۔ اگر آپ ان تصاویر کو مٹا بھی دیں گے۔ تو ان تصاویر کو کیا کریں گے جو انسان نے اپنے قلب کے چوکھٹوں میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ اگر آپ "شیخ" کی تصویر سامنے نہیں رکھنے دیتے۔ تو وہ مراقبہ میں تصور شیخ سے اپنے سینے کو بتکدہ بنا لیتا ہے۔ سو اصل شے انسان کے دل اور

دماغ کے بت کدوں کو معبودان باطل سے پاک کرنا ہے۔ اگر ان کی تطہیر ہو جائے تو خارجی معبود (تصاویر اور مجسمے بلکہ زندہ انسان) از خود فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں یہ بت موجود ہوں تو محسوس و مشہود بتوں (تصویروں اور مجسموں) کے استیصال سے بھی کچھ نہیں بنتا کتنے مسلمان ہیں جو تصویر کشی، مجسمہ سازی۔ قبر پرستی کو حرام سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے سینوں کو ٹٹول کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان میں کتنے کتنے بڑے لات اور منات اور جبل اور عزیٰ چھپے بیٹھے ہیں۔

رہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخ حرم
ہر زماں در آستیں دار و خداوندے دگر !

لہٰذا اصل شے تو غیر اللہ کی عبودیت ہے۔ جس سے روکنا مقصود ہے نہ کہ نفس تصویر... "آغا خانیوں" میں چونکہ سر آغا خان کی پرستش کی جاتی ہے لہٰذا ان کی ہر تصویر معبود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس فرقہ کا جاہل اور سمجھدار ہر شخص اس تصویر کی پرستش کرتا ہے۔ اس کے برعکس قائد اعظم مرحوم کی تصویر مسلمانوں کے قریب قریب ہر گھر میں موجود ہے لیکن سمجھدار طبقہ تو ایک طرف، جہلا میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس کی پرستش کرے معہذا چونکہ قبر پرستی مسلمانوں میں عام ہے۔ اس لئے اسی قائد اعظم کی قبر کی پرستش کے آثار آہستہ آہستہ ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا تصویر بجائے خود کوئی ایسی چیز نہیں جسے شجر ممنوعہ قرار دیا جائے۔

Marfat.com

شگفتگی سے نفرت

لیکن اگر آپ تاریخ اسلام (مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) کا بہ تعمق نگاہ مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت آپ پہ واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کے دلوں میں تصاویر کے متعلق جو نفرت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ وہ نہیں جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے۔ بلکہ اس کی تہہ میں کچھ اور ہے۔ ہو سکتا ہے یہ چیز شعوری طور پر مسلمان کے سامنے نہ ہو۔ لیکن اس کا تحت الشعور اس سے متاثر ہے اور اس تاثر کو اس نے مذہب کا سہارا دے کر قائم کر رکھا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جو اسلام ہمارے ہاں مروج ہے یہ وہ اسلام نہیں جو اللہ نے بوساطت نبی اکرم ملت کو دیا تھا۔ ہمارا اسلام مجموعہ ہے ان غیر اسلامی نظریات و تصورات کا جو رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر اسلام کے اجزا بنائے جاتے رہے ان تصورات میں عیسائیت کی رہبانیت کو خاص دخل ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موجودہ اسلام کا بیشتر حصہ اسی رہبانیت پر مشتمل ہے۔ عیسائی خانقاہیت میں دنیا کی ہر حسین شے سے نفرت سکھائی جاتی تھی۔ ان کے اولیا، (SAINTS) کے حالات پڑھیئے وہ اس قدر گھناؤنی زندگی بسر کرتے تھے کہ اس کے تصور سے روح لطافت میں جھرجھری آجاتی ہے۔ ان میں سے جو ولی سب سے زیادہ کریہہ المنظر اور نفرت انگیں حالات میں رہتا تھا۔ وہی سب سے بڑا قطب تصور کیا جاتا تھا۔ اگر کسی کو ساری عمر میں ایک مرتبہ ہنسی آگئی (یا تبسم سے لب کشائی ہو گئی ہے) تو اسے سالہا سال تک اس کا کفارہ دینا پڑتا تھا جب حسن فطرت سے متعلق ان کا یہ زاویۂ نگاہ تھا۔ تو حسن نسائیت کے متعلق ان کا جو تصور

ہوگا وہ ظاہر ہے۔ چونکہ تجرد کی زندگی ان کے نزدیک "منہاج نبوت" کی زندگی تھی، اس لئے ان کے عقیدہ میں عورت دنیا کی بدترین جنس تھی۔ یہ تھی وہ روح خانقاہیت جو آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اسلام کا جزو مذہب بن گئی۔ اس تاریخی پس منظر کے ساتھ آپ اس زندگی کی تصویر کا مطالعہ کیجئے جسے ہمارے ہاں ایک متقی، پرہیزگار، دیندار، مزکی و مقدس انسان کی زندگی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ فلاں بزرگ چالیس سال تک متواتر روتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کے رخساروں کا گوشت بھی گل سڑ گیا۔ فلاں بزرگ بیس سال تک سوئے نہیں۔ فلاں نے عمر بھر گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ فلاں صاحب کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ جونہی کوئی کیڑا زخموں سے نیچے گر جاتا تھا وہ اسے اٹھا کر پھر زخم میں رکھ لیتے تھے۔ فلاں بزرگ کی جوئیں مگر مچھوں جتنی بڑی تھیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس سے آگے بڑھے تو اس "مقدس تصور زندگی" کو خود ذات رسالت مآب اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کر یا کتب سیر و آثار کو دیکھئے۔ ان میں مقدس زندگیوں کی تصویریں اسی قسم کی ملیں گی۔ حضور ساری عمر اس طرح متبسم نہیں ہوئے کہ کسی نے دانت مبارک دیکھ لیا ہو گھر میں چالیس چالیس دن تک آگ نہیں جلتی تھی۔ گیہوں کا آٹا کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ چھلنی کی کبھی ضرورت ہی محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ کپڑوں پر بیسیوں پیوند لگے رہتے تھے۔ ان کی مجالس و محافل میں کبھی شگفتگی و شادابی نے بار نہیں پایا تھا۔ زندگی کے لطیف و خوشگوار پہلوؤں سے وہ ہمیشہ مجتنب رہتے تھے۔ تزئین و آرائش ان کے ہاں مطلقاً حرام تھی۔ دولت و ثروت وہ شجر ممنوعہ تھی۔ جس کے چھونے سے انسان جنت سے نکال دیا جاتا

Marfat.com

ہے۔ عورت وہ ٹیڑھی کمان ہے۔ جس کو سیدھا کرنے کی کوشش کیجیے۔ تو وہ ٹوٹ جاتی ہے وقس علیٰ ہٰذا۔

اس قسم کی زندگی کو مقدس ترین زندگی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور ہر منبر و محراب سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ "دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا"۔ عیسائی خانقاہت کا اثر اس حد تک گہرا ہو چکا ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ہاں کے اچھے اچھے سمجھدار لوگ جب جنت کا ذکر کریں گے کہ تو وہ اس تصور سے جھینپے جھینپے سے دکھائی دیں گے کہ اس میں ازواج کا ذکر کیوں آتا ہے۔ وہ اپنی انتہائی کوشش کریں گے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہر چند وہاں ازواج ہوں گی لیکن ان سے جنسی تعلقات قائم نہیں ہوں گے۔[۲]

جنسی تعلق

یعنی ان کے نزدیک جنسی تعلق ایک ایسی چیز ہے۔ جسے اس دنیا کی آلودگیوں میں تو گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے بلند و بالا "روحانیت" کی زندگی میں اس کو بالکل دخل نہیں ہو سکتا۔ ان کے خیال میں اگر جنت میں بھی جنسی تعلق باقی رہا۔ تو ساری جنت پلید ہو جائیگی۔ آپ نے غور فرمایا کہ جنسی تعلق کو روحانیت کی زندگی کے نقیض تصور کرنے کا خیال کہاں سے آیا؟ یہ اسی عیسائیت کا اثر ہے۔ جس میں تجرد کی

---

[۱] واضح ہے کہ بنا بر استغنا، سادہ زندگی بسر کرنا اور شے ہے اور دولت و ثروت اور زیبائش و آرائش کو قابل نفرت سمجھنا اور شے۔ ہمارے ہاں کے تصور دین میں ان چیزوں کو قابل نفرت قرار دیا جاتا ہے۔

[۲] ہم اس وقت جنت اور اس سے متعلقات قرآنی تصریحات سے بحث نہیں کر رہے۔ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ "جنسی تعلق" کو ہمارے ہاں کس طرح روحانی زندگی کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

Marfat.com

زندگی کو روحانیت کی بلند ترین زندگی بتایا گیا ہے۔ اور یہی اثرات ہمارے ہاں عین دین بن چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے "دین" میں احساس حسن کہاں بار پا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جہاں حسن Beauty کو اس درجہ قابل نفرت سمجھا جاتا ہو۔ وہاں حسن کے مظاہر (فطری ہوں یا انسانی کوششوں کے نتائج) کس طرح قابل ستائش قرار پا سکتے ہیں۔ یہ ہے اصل وجہ تصویر (اور دیگر فنون لطیفہ) کی "حرمت" کی۔ اسلام اور آرٹ ایک وسیع موضوع ہے جس پر اس طرح ضمناً گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اگر "کشاکش روزگار" نے فرصت دی۔ تو اس باب میں بھی مفصل گفتگو کی جا سکے گی۔ اس وقت ہم صرف ان اشارات پر اکتفا کرتے ہیں کہ حسن کے متعلق یہ اس قوم کا زاویہ نگاہ ہے۔ جس کے خدا نے نیکی کے لئے بھی حسن کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور جنت کے لئے بھی حسن مآب۔ یعنی جس

حسن کیا ہے

عمل میں حسن نہیں (یعنی زندگی کا جو کام حسین نہیں)۔ وہ اس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ حسن کیا ہے؟ توازن و تناسب۔ جونہی کسی شے کا توازن (Proportion) بگڑا۔ اس میں فساد رونما ہو گیا۔ کائنات کا یہ تمام سلسلہ اسی حسن (توازن) پر قائم ہے۔ تخلیق کے ساتھ تحسین یہاں کا آئین محکم ہے اشیائے کائنات صرف پیدا ہی نہیں کی جاتیں۔ بلکہ انھیں حسین ترین انداز میں پیدا کیا جاتا ہے الذی احسن کل شیٔ خلقہ (۳۲/۷) اللہ وہ ہے کہ اس نے جو چیز بنائی۔ حسین ترین (احسن) انداز میں بنائی وانبتنا فیھا من کل شیٔ موزون (۱۵/۱۹) ہم نے زمین میں

Marfat.com

ہر شے توازن و تناسب کو لئے ہوئے اُگا ئی : خود انسانی صورت میں بھی اس اعتدال و تناسب کو ملحوظ رکھا۔ جس پر حسن کا مدار ہے الذی خلقک فسواک فعدلک (۸۲) وہ خدا جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر ٹھیک ٹھیک درست کیا۔ پھر تمہارے قویٰ اور صورت میں تناسب واعتدال ملحوظ رکھا۔

جمالی پہلو پھر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا گیا کہ موزونیت و تناسب اور تحسین و تزئین کا یہ انداز سلسلہ تخلیق ہی کا ایک جزو نہیں کہ اس سے اس کے سوا کچھ اور مقصد نہ ہو۔ بلکہ آرائش و جمال کی یہ تمام آئینہ گری انسان کی نظر افروزی اور ذوق لطیف کی تسکین کے لئے ہے۔ غور کیجئے! یہ تمام اجرام فلکی، اس سلسلہ کائنات میں جذب و کشش کے ثقیل الجثہ مظاہرے ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی فرمادیا کہ سقف سماوی کی یہ مرصع کاری تمہاری نگاہوں کے لئے سامان زینت ہے افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینھا و زینھا (۵۰) کیا ان لوگوں نے کبھی آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے۔ اور کس طرح اس کے منظر میں خوشنمائی پیدا کر دی ہے۔ دوسری جگہ ہے ولقد جعلنا فی السماء بروجا و زینھا للنظرین (۱۵) اور ہم نے آسمان میں (گردش سیارگان کے لئے) برج بنائے۔ اور انھیں دیکھنے والوں کے لئے باعث زینت بنا دیا۔ آسمان سے نیچے اتر کر زمین کی طرف دیکھئے انبتنا فیھا من کل زوج بھیج (۵۰) اس میں تم قسم کی خوبصورت نباتات پیدا کر دی — حتیٰ کہ تمہارے مویشی جن سے تم نے بار برداری کا

کام لینا تھا۔ ان کی یہ کیفیت ہے کہ ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون (۱۶/۶)

جب تم انھیں شام کے وقت چراگاہوں سے واپس لاتے ہو اور صبح کے وقت لے جاتے ہو۔ تو تمہارے ان مویشیوں میں تمہارے لئے حسن و جمال کا سامان ہوتا ہے۔

آپ قرآن کے مختلف مقامات پر نگہ ڈالئے۔ تخلیق و تعمیر کے ساتھ ساتھ تحسین و تزئین کی یہ تمام جمال آرائیاں آپ کے سامنے آجائیں گی جن کی طرف آپ کو بار بار دعوت نظارہ دی جائے گی۔ اور وہ دعوت بھی اس انداز سے کہ

ماتری فی خلق الرحمٰن من تفوت۔ فارجع البصر هل تری من فطور۔ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر۔ (۶۷/۳)

تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں کوئی اونچ نیچ نہیں پاؤ گے۔ ایک بار نہیں۔ بار بار دیکھو کیا تمہیں کوئی سلوٹ نظر آتی ہے۔ تم اسی طرح بار بار دیکھتے رہو۔ تمہاری نگاہ اٹھے گی اور اسی طرح خاسر و درماندہ کاشانۂ چشم میں واپس آجائے گی لیکن صنعت گاہ کائنات میں کوئی جھول نہ پا سکے گی۔

جس خدائے کائنات کی جمال آفرینیوں کا یہ عالم ہو کیا وہ آرائش و زیبائش اور حسن و جمال کی تمام راہیں اپنے بندوں پر حرام قرار دیدے گا؟ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔

قرآن تو اس نمائش گاہ حسن و تزئین کی طرف بار بار دعوت نظارہ دے رہا ہے اس لئے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا گویا اس کے صانع پر یہ تہمت دھرنا ہے کہ تم نے

یہ سامان زیبائش وتحسین یونہی بے کار پیدا کیا۔ اور پھر جب یہ تمام جمال آفرینی بھی مقصدِ تخلیق کائنات میں سے ہے۔ تو ظاہر ہے کہ خود انسانی ذات کی تعمیر وارتقاء میں اس کا کتنا بڑا حصہ ہوگا حقیقت یہ ہے کہ جو آنکھ حسن وجمال کی نیرنگیوں سے کیف اندوز نہیں ہوسکتی۔ وہ انسان کا دیدۂ بصیرت نہیں۔ حیوان کا آلۂ بینائی ہے۔

ذوقِ حسن

اور جو قوم ذوقِ حسن وزیبائی سے بے بہرہ ہوجاتی ہے۔ اس پر رموزِ کائنات کی گرہ کشائیاں حرام ہوجاتی ہیں۔ کائنات جمالیاتی Aesthetic اور افادی Utilitarian گوشوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ انسان چونکہ ہمیشہ افراط وتفریط کے جھولوں میں جھولتا چلا آیا ہے اس لئے اس کا یہ مسلک رہا ہے کہ کبھی وہ محض جمالیاتی رنگ میں ڈوب گیا۔ اور کائنات کے افادی پہلو سے کنارہ کش ہوگیا۔ یہ یکسر جذباتی دنیا تھی۔ جس نے انسان کو دنیائے ممکنات میں بیکار کرکے رکھ دیا۔ اور کبھی یہ تفریط کی طرف آیا۔ تو یکسر افادی پہلو کو

حمدیت اور ربوبیت

مسلک حیات قرار دے لیا۔ اس سے یہ کائنات محض تجارت گاہ بن گئی۔ اسلام نے آکر بتایا کہ کائنات کے ان دونوں گوشوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ یعنی

حمدیت Appreciative اور ربوبیت Utilitarean دونوں کا منبع اس کی ذات ہے یہ تھا "مسلمان کا خدا"۔ لیکن آج مسلمان کی یہ حالت ہے کہ اس میں نہ حمدیت کا کوئی رنگ ہے۔ اور نہ ربوبیت کی کوئی شان۔

خسر الدنیا والاخرہ ذالک الخسران المبین

(ان امور کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے۔ اسباب زوال امت)

Marfat.com

ملّی تقاریب

ایک دوست نے ایک سوال پوچھا ہے۔ جس کا جواب طلوع اسلام کی وساطت سے دے رہا ہوں۔ کیونکہ یہ عام افادی حیثیت رکھتا ہے۔ (پرویز)

استفسار یہ ہے کہ آپ نے یہ بتایا ہے کہ حج ایک بین الملّی اجتماع ہے۔ جس میں نمائندگان ملت اجتماعی امور کے متعلق تدابیر سوچتے ہیں۔ قرآن کریم سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ اس لئے یہ امر بڑا موجب اطمینان ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حج میں جو رسوم ادا کی جاتی ہیں (مثلاً۔ احرام، طواف، سعی۔ رمی الجمار وغیرہ) ان سے کیا مفہوم ہے؟ یعنی ایک افادی اجتماع کے ساتھ یہ رسومات کیوں؟

جواب۔

آپ کے سوال کے جواب سے پہلے ایک تمہید ضروری ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا ایک حصہ جبلت Instinct سے متعلق ہوتا ہے۔ مثلاً بھوک اور پیاس کی تسکین۔ اس میں نہ جذبات کو دخل ہوتا ہے۔ نہ عقل کو۔ دوسرا حصہ جذبات سے متعلق ہوتا ہے۔ مثلاً نفرت یا پسندیدگی۔ جو محض ذاتی رجحان کی بنا پر ہو۔ اس سے آگے

Marfat.com

بڑھیئے تو عقل و بصیرت کا مقام آتا ہے۔ اس مقام میں انسان اپنے نقصان اور اپنے فائدے کے متعلق سوچتا ہے۔ اور جس کام کو نفع بخش سمجھتا ہے، اسے اختیار کرتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ عقل کی رو سے انسان اپنے مقصد کے حصول کے ذرائع سوچتا اور اختیار کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جبلت کے تقاضے کے ماتحت انسان کو بھوک لگتی ہے۔ بھوک کے لئے کھانا درکار ہے۔ لیکن انسان چاہتا یہ ہے کہ کھانا لذیذ بھی ہو۔ اور خوش آئند بھی۔ برتن صاف ستھرے ہوں۔ ماحول جاذب نگاہ ہو۔ یہ حصہ ذوق سے تعلق رکھتا ہے جس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے۔ کھانے کی افادی حیثیت بھوک کی تسکین یا قوت برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اس کے ساتھ ذوق کی تسکین بھی کچھ کم حیثیت نہیں رکھتی۔ باقی رہی عقل سو

افادی اور جذباتی پہلو

وہ انسان کو ایسی تدابیر سکھاتی ہے۔ جس سے اسے اس قسم کا کھانا اور اس کے متعلقات میسر آجائیں۔ اگر عقل بے زمام ہے، تو وہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ممکن ذریعہ اختیار کرے گی۔ لیکن اگر وہ قوانین خداوندی کے تابع ہے تو وہ صرف ایسی تدابیر اختیار کرے گی جنہیں یہ قانون جائز قرار دے۔ جائز تدابیر کی رو سے جو کچھ حاصل کیا جائے گا اس میں انسان کے جبلی تقاضے (بھوک) کی تسکین کا سامان بھی ہوگا۔ اور اس کے جذبات (لذت نگہ و کام و دہن) کی تسکین کا بھی۔ عقل بھی اس سے مطمئن ہو جائے گا۔ اور شرف انسانیت کی برومندی کا بھی سامان پیدا ہو جائے گا۔

اس مثال میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ افادی پہلو اور جذباتی پہلو دونوں ہی

Marfat.com

سامنے آجاتے ہیں۔ "دنیائے مذہب" میں سمجھا یہ جاتا تھا کہ افادی پہلو یکسر دنیاداری ہے مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ باقی رہے جذبات۔ سو ان میں سے جن جذبات کو مذہب نے "سفلی" قرار دیا ہے۔ ان کا فنا کر دینا مذہب کی غایت قرار پا گیا۔ یہ حصہ مذہب کا منفی پہلو تھا۔ مثبت پہلو یہ تھا کہ جن جذبات کو "علوی" سمجھا گیا۔ ان کی تسکین کا سامان بہم پہونچایا جائے۔ اس کے لئے پوجا پاٹ اور گیان دھیان کو ذریعہ قرار دیا گیا۔

قرآن نے آکر بتایا کہ افادی اور جذباتی دونوں پہلو یکساں ضروری اور شرف انسانیت کی برومندی کے لئے لاینفک ہیں۔ بس اس شرط کے ساتھ کہ انھیں قانون خداوندی کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھا جائے۔ اور ان کے حصول کے لئے کوئی ایسا ذریعہ اختیار نہ کیا جائے جسے اس قانون نے جائز نہ قرار دیا ہو۔ اس نے کہا کہ جذبات کی "سفلی" اور "علوی" تقسیم حدیث بے خبراں ہے۔ سب جذبات وجہ بالیدگی آدمیت ہیں۔ بشرطیکہ ان میں توازن رکھا جائے۔ اور وہ "حدود اللہ" سے نہ ٹکرائیں۔

اظہار جذبات

جذبات غیر محسوس اور غیر مرئی کیفیات کے نام ہیں۔ لیکن انسان ہمیشہ اپنی جذباتی کیفیات کے اظہار میں لذت و تسکین محسوس کرتا ہے اظہار جذبات محسوس و مرئی پیکروں کا متقضی ہوتا ہے۔ الفاظ اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں۔ لیکن بہت سے مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں چہرے کے تغیرات یا جسمانی

له "مذہب" اور "دین" کے فرق کے لئے دیکھئے "اسباب زوال امت" شائع کردہ طلوع اسلام
اسلام دین ہے۔ مذہب نہیں ہے۔

حرکات وسکنات الفاظ سے بھی واضح تر الفاظ میں اظہار جذبات کر دیتے ہیں۔ پیشانی کی شکن، نگاہ کا انداز، رخسار کی رنگت، لبوں کا ارتعاش، سر کی جنبش، جسم کی تھرتھراہٹ پاؤں کی حرکت، بعض اوقات وہ کچھ کہہ جاتی ہے۔ جو ہزار مرصع غزلوں سے بھی بن نہیں پڑتا

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک

بہر پیمانِ محبت، نیست سوگندے دگر!

نگاہوں اور تبسموں، جنبشوں اور ارتعاشوں کا یہ خاموش اسلوب بیان۔ ہزار نامہ و پیام سے زیادہ اثر انگیز اور لاکھ عرض والتماس سے بڑھ کر دل دوز ہوتا ہے۔ شاد عظیم آبادی (مرحوم) کے الفاظ ہیں۔

ہے ہے میری چشم حیرت کا۔ سب حال دل ان سے کہہ جانا

کچھ سوچ کے ان کا دانتوں میں ہونٹوں کو دبا کر رہ جانا

رسومات

یہ اظہار جذبات کا انفرادی پہلو ہے۔ جب یہی چیز اجتماعی یا قومی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، تو اسے "رسومات" سے تعبیر کیا جاتا ہے، رسومات کیا ہیں؟ کسی قوم کے اجتماعی جذبات کے اظہار کی راہیں اور ملی تاثرات کے انکشافات کے ذرائع۔ قرآن اظہار جذبات کے ان مرئی اور محسوس پیکروں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ نظام صلوٰۃ کے محسوس عنصر (نماز) میں قیام رکوع وسجود، تسلیم اطاعت کے جذبات اور ہم آہنگی و یکرنگی کے تاثرات ہی کے مرئی پیکر ہیں۔ یہ پیرایۂ اظہار جذبات، حج کی تقریب میں اور بھی مشہود ہو جاتا ہے، حج ملت اسلامیہ کے اس عزم کا مظہر اور اس نصب العین

Marfat.com

کے حصول کی تدبیر کا ذریعہ ہے۔ کہ جس طرح تمام عالم آفاق میں ایک ہی قانون جاری وساری ہے۔ اسی طرح تمام عالم انسانیت میں بھی ایک ہی قانون (یعنی قانون خداوندی) کی حکمرانی ہونی چاہیئے۔ اسی کا نام توحید ہے۔ ملت اسلامیہ اس نظریہ توحید کی علمبردار ہے اور کعبہ ان کا مرکزِ محسوس ہے۔ لہذا کعبہ اس مجرد حقیقت کا مرئی نشان Symbol ہے۔ اسی اعتبار سے کعبہ اور اس کے متعلقات کو شعائر الٰہی (نشانات خداوندی یا Symbols کہا گیا ہے۔ ان شعائر کی تعظیم۔ جذباتِ توحید کا مرئی مظاہرہ ہے۔ تعظیم کعبہ کے اینٹ اور پتھر کی نہیں اینٹ اور پتھر تو کعبہ کی عمارت میں کئی بار لگائے گئے اور کئی بار بدلے گئے بعض اوقات وہ برباد بھی ہو گئے۔ لیکن وہ نشان جو ملت حنیفہ کے موسس اول کے ہاتھوں رکھا گیا تھا جذبات توحید کے مظہر کی حیثیت سے آجتک قائم ہے

شعائر الٰہی

حج کی حیثیت توانا دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جذباتی پہلو کی رعایت کے پیش نظر ان مراسم (مناسک) کو قائم رکھا گیا ہے۔ جو اجتماعی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ ان مراسم میں احرام اور طواف نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ احرام (دو بن سلی چادروں کا لباس) وحدت ملت دمساواتِ آدمیت کا محسوس مظہر ہے۔ اور دنیا میں امن وسلامتی قائم کرنے کے عزم کا اسلوب اظہار۔ اسی لئے حالت احرام میں شکار تک کی بھی اجازت نہیں۔ باقی رہا طواف کعبہ۔ تو یہ اس عہد و پیمان کے اقرار کا ذریعہ اظہار ہے کہ ہماری سعی وعمل کی تمام گردشیں اسی محور کے گرد

طواف کعبہ

Marfat.com

گھومتی رہیں گی انا للّٰہ وانا الیہ راجعون[1] کی بلند حقیقت اسی بلند نصب العین کی ترجمان ہے۔ یعنی اس امر کا اقرار کہ ہماری ہستی قانون خداوندی کے بقاء و استحکام کے لئے ہے۔ اور ہماری زندگی کی گردشیں اسی محور کے گرد گھومتی ہیں۔ طائف رات کے چوکیدار کو کہتے ہیں۔ اور طواف نہایت عمدہ خدمت گار کو۔ طوف ان بیلوں کو کہتے ہیں جو کھلیانوں پر گھومتے ہیں تاکہ ان سے غلہ برآمد ہو جائے۔ نیز یہ اس مشکیزے کو بھی کہتے ہیں۔ جس کے ذریعہ دریا پار کیا جائے۔ طواف کے ان معانی پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ یہ رسم کتنی بڑی مجرد حقیقت کے اظہار کا محسوس انداز ہے۔ اس مرکز توحید کے گرد جمع ہونے سے انسانی قلوب جن والہانہ انداز میں جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں قرآن نے ان کے اظہار کے لئے کعبہ کے "طواف کی رسم" کو قائم رکھا۔ دونوں جذبات کے نہاد کے لئے اگر اس قسم کا راستہ نہ نکالا جاتا تو نفسیاتی طور پر اس کے اثرات بہت دور رس ہو جاتے

پری رو تاب مستوری ندارند

چو در بندی ز روزن سر برارند

جہاں تک "رسوم" کا تعلق ہے قرآن میں انہی دو کا ذکر صراحتاً آیا ہے (باقی رہا عرفات کا اجتماع اور منیٰ کا قیام وغیرہ تو وہ سب اس اجتماعی مقصد کے لئے ہیں۔ جس کا

---

[1] وہی انا للّٰہ وانا الیہ راجعون جس کا مصرف اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ موت کی خبر سنکر اسے دہرا دیا جائے۔ اتنی عظیم الشان حقیقت کس طرح (معاذ اللہ) منحوس سی بات بنکر رہ گئی ہے۔ جیسے سورۃ یٰسین۔

Marfat.com

ذکر اوپر آچکا ہے۔ جہاں تک سعی بین الصفا والمروہ کا تعلق ہے۔ قرآن میں ہے۔

صفا اور مروہ

ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما ۲/۱۵۸

یقیناً صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ جو شخص حج یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں میں طواف کرے۔

صفا اور مروہ دو پہاڑیاں ہیں۔ جن کی وادی میں کعبہ واقع ہے۔ اس آیت میں صرف اتنا مذکور ہے کہ اس بات میں کچھ ہرج نہیں کہ ان کا "طواف" کیا جائے۔ طواف کے معنی گھومنا پھرنا بھی ہے۔ سو یا تو اس سے یہ مفہوم ہے کہ ان کے شعائر اللہ ہونے سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ پہاڑیاں ایسی مقدس ہیں کہ ان میں چلنے پھرنے کی ممانعت ہے شعائر اللہ بن جانے سے ان پہاڑیوں اور ان کی درمیانی وادی میں چلنے پھرنے سے گناہ نہیں ہوتا۔ ان میں چلنے پھرنے کی اجازت ہے۔ یا اس سے یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ یہ بھی کعبہ ہی کے تضمنات میں سے ہے۔ اس لئے ان کا طواف کر لینے میں بھی کوئی ہرج نہیں بہرکیف ان کے طواف کا حکم نہیں۔ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (لاجناح علیہ) اسی اعتبار سے یہ مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے کہ ان میں چلنے پھرنے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی عام پہاڑیوں کی طرح پہاڑیاں ہیں۔ فقط اتنی بات ہے کہ خانۂ کعبہ اور اس سے متعلقہ وادی سب شعائر اللہ (خدا کی توحید کے اعلان کے نشانات) ہیں۔ اس لئے ان کی تعظیم صرف ان کے شعائر اللہ سمجھنے تک ہے۔ ان کے پتھر

Marfat.com

اور مٹی کسی تعظیم کے مستحق نہیں کہ تم انھیں مقدس سمجھ کر ان میں چلنا پھرنا چھوڑ دو۔

ان کے علاوہ قرآن میں حج کی کسی اور "رسم" کا ذکر نہیں۔ نہ حجر اسود کا۔ نہ کنکریاں مارنے کا۔ جہاں تک شعائر اللہ کی تعظیم کا تعلق ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ دیکھنا کہیں ان کی پرستش نہ شروع کر دینا۔ دیکھئے سورۃ حج میں جہاں شعائر اللہ کی حرمت و تعظیم کا ذکر ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ یہ سب کچھ "حنفاء للہ غیر مشرکین" کرنا ہوگا۔ یعنی ہر طرف سے خیالات ہٹا کر صرف ایک اللہ کو سامنے رکھ کر۔ اس لئے کہ

ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر
او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق۔ (۲۲/۳۱)

جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتا ہے۔ تو اس کی مثال یوں سمجھو جیسے وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا۔ یا جیسے کسی چھوٹے سے پرندے کو عقاب یا شہباز اچک کر لے جائے۔ یا آندھی کا جھکڑ کسی کو اٹھا کر اس کے مقام سے دور پھینک دے۔

اور اس کے بعد اس حقیقت کی وضاحت فرمادی کہ شعائر اللہ کی تعظیم سے مقصود کیا ہے فرمایا۔

ذالک من یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب (۲۲/۳۲)

بات یہ ہے کہ جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے اسے سمجھ رکھنا چاہیئے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس کے جذبات (قلب) قانون خداوندی کے

Marfat.com

ہم آہنگ ہیں۔

جذبات اور قانون کی ہم آہنگی

اگر خالی قانون کی اطاعت کرائی جائے تو یہ اطاعت میکانکی عمل Mechanical Action ہو جاتی ہے۔ جس میں زندگی کے نرم و نازک گوشوں کی رعایت نہیں ہوتی۔ اگر محض جذبات کی تسکین پیش نظر رہے تو اس سے زندگی کے حقائق نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قانون کو جذبات کے ساتھ سمو دیا جائے۔ یعنی زندگی کی گاڑی میں پٹرول اور موبل آئل دونوں ساتھ ساتھ استعمال ہوں تاکہ اس کی رفتار بھی قائم رہے اور حرکت کی حدت یا Friction سے پرزے بھی نہ جلنے پائیں۔ یہ ہے جذبات کے سرچشمے (یعنی دل کو) قانون کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا (تقوی القلوب) یہی ہے شعائر اللہ کی تعظیم سے مقصود۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے حج جیسے یکسر افادی اجتماع کے ساتھ دو چار رسوم کا قائم رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ حج کا اجتماع حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ لیکن رسول اللہ کی بعثت کے وقت اس کی افادی حیثیت نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور صرف رسومات باقی رہ گئی تھیں۔ قرآن اس کی افادی حیثیت کو پھر سے سامنے لے آیا جب فرمایا کہ کعبہ قیام انسانیت کا موجب (قیاماً للناس) ہے اور اس اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ تم اپنے اجتماعی منافع اپنے سامنے رکھ کر خود دیکھ لو (لیشھدوا منافع لھم) اور اس کے ساتھ ہی ان رسوم کو بھی قائم رکھا جو جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھیں۔ البتہ انہیں

Marfat.com

ان عناصر سے پاک کردیا جو شرک اور توہم پرستی کی طرف منجر ہو سکتے تھے۔ یہ تھا قرآنی حج جو عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں رائج تھا۔ اس کے بعد اسلام پر جاہلیت چھا گئی جس سے حج کی افادی حیثیت پھر نظروں سے غائب ہوگئی اور فقط رسومات باقی رہ گئیں۔ یہ ہے وہ حج جو اس وقت رائج ہے۔ اس سے جذبات کی تسکین تو ہو جاتی ہے لیکن افادی حیثیت بالکل غائب ہے۔ جس حاجی سے پوچھئے وہ کہہ دے گا کہ سبحان اللہ! حریم کعبہ میں پہونچکر انسان پر ایسی "کیفیت" طاری ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ ٹھیک ہے، لیکن یہ تو محض جذبات کی تسکین ہے۔ اس میں اجتماعی مفاد کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ رسم

ہمارا حج

ہے۔ اسلامی معاشرہ کا جزو نہیں۔ یہ زندگی کی گاڑی میں موبل آئل ہے، پٹرول نہیں جس سے گاڑی چل سکے۔ تنہا موبل آئل لاکھوں من بھی جمع کر لیجئے گاڑی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے گی۔ بلکہ اس سے اس کے پرزوں میں الٹی چیکٹ جم جائے گی۔ اسلامی نظام زندگی میں یہ تبدیلی اس دن سے ہو گئی جب دین مذہب سے بدل گیا۔ اب ہماری صلوٰۃ وہی ہے جو مذہب میں پوجا پاٹ یا ایشور بھگتی کہلاتی ہے۔ ہمارے روزے وہی ہیں جنھیں مذہب میں برت کہتے ہیں۔ ہماری زکوٰۃ وہی شے ہے جسے مذہب دان یا خیرات کہہ کر پکارتا ہے۔ ہمارا حج مذہب کی یاترا ہے۔ ہمارے ہاں یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ اس سے "ثواب" ہوتا ہے۔ مذہب کے ہاں اسی کو پُن کہتے ہیں، اور ثواب سے نجات (مکتی یا Salvation) ملتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح دین (نظام زندگی) یکسر مذہب بنکر رہ گیا۔ اب یہ تمام عبادات اس

Marfat.com

لئے سرانجام دی جاتی ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے، ان امور کو نہ افادیت سے کچھ تعلق ہے نہ عقل و بصیرت سے کچھ واسطہ۔ آج ہم بھی اسی مقام پر ہیں۔ جہاں اسلام سے پہلے دنیا تھی یعنی مذہب کی سطح پر جہاں سے ہمیں دین نے ابھارا تھا۔

لہٰذا اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ دین میں جذبات کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ لیکن دین کا مقصود محض جذبات کی تسکین نہیں۔ دین کے جن احکام سے ہماری دنیا نہیں سنورتی وہ درحقیقت دین کے احکام نہیں ہو سکتے۔ وہ فقط مذہب کی ملمع کاری ہے۔ اور جب تک ہماری دنیا نہیں سنورتی اس وقت تک آخرت بھی نہیں سنور سکتی کہ من کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ۔ جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہو گا۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا — جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا — جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

زندہ قوموں کے تیوہار

لیکن ہمارے ہاں تو رسومات تک بھی میکانکی طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ ان میں کہیں دل کی کشاد اور جذبات کی شگفتگی کو دخل نہیں رہا۔ ہمارے ملی ارکان و شعائر میں نہ افادیت باقی ہے نہ جذبات کی تسکین کا سامان۔ زندہ قوموں کے تیوہاروں کو دیکھئے اس میں کس قدر تازگی اور شگفتگی نظر آتی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ قوم کا ہر فرد، بچہ، بوڑھا، جوان، مرد، عورت، غریب

Marfat.com

امیر ہر ایک پورے جذبات وانہماک اور کامل ذوق شوق سے اس تیوہار کی نزہت و بشاشت اور کشش وجاذبیت کو زیادہ سے زیادہ کرنے میں متانہ وار شریک ہورہا ہے ہمارا مطلب ان لغویات وخرافات سے نہیں جو اکثر قوموں کے تیوہاروں کا جزو بنکر رہ گئے ہیں۔ بلکہ ان کے دل کے انبساط اور روح کی شگفتگی سے ہے۔ جن سے ان تیوہاروں میں حصہ لیا جاتا ہے۔ ایسی تقاریب پر مسرت کے چشمے قلب سے ابلتے دکھائی دیں گے۔ غریب اور امیر کا فرق مٹ جائے گا۔ طبقاتی تقسیم کا احساس محو ہو جائے گا۔ اور اس طرح ہر فرد اپنے آپ کو قوم کا لاینفک حصہ تصور کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔ لیکن ہمارے یہاں ان ملی تقاریب کی کیا کیفیت ہو چکی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو کسی عید کا تصور سامنے لے آیئے۔ اور پھر دیکھئے کہ صبح سے شام تک آپ کا دل کا کس قدر حصہ اس میں شامل تھا اور کس حد تک آپ اس میں محض "رسمی طور" پر Conventionally طوعاً وکرہاً شریک ہورہے تھے۔ آپ محسوس کریں گے کہ آپ کی ہر حرکت مشینی طور پر عمل میں آرہی تھی۔ نہ اس تقریب کے اجتماع میں آپ کی شرکت آپ کے دل کی کشش سے تھی۔ نہ انفرادی طور پر آپ کے سینے میں مسرتوں کا چشمہ ابلا تھا۔ نہ احباب کی ملاقات کے لیے آپ کا آغوش جوش انبساط سے وا ہوا تھا۔ نہ خود اس تقریب کی اہمیت نے آپ کے قلب کو گرمایا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حسرت انگیز وہ منظر تھا جو دور حاضرہ کی ایجاد تشریفات عید Id Receptions میں دیکھنے میں آیا تھا۔ وہاں امیر اور غریب کی جگر سوز تفریق اور طبقاتی تقسیم کی ذلت آمیز تمیز نمایاں طور پر سامنے آرہی

Marfat.com

تھی اور پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اس ملنے سے بچھڑنا ہزار درجے اچھا۔ اور اس اجتماع سے انتشار لاکھ درجے بہتر۔ وہاں ہر ہنسی منافقت کی غماز اور ہر دزدیدہ نگاہ منافرت کی آئینہ دار تھی۔ وہاں ہر مصافحہ اپنے سے نچلے درجے کے انسان کو دور دھکیلنے کا ذریعہ اور ہر معانقہ اس سے پیچھے ہٹنے کا بہانہ تھا۔

آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے بھی کیا حالت ہو چکی ہے۔ ہم وہ ہیں کہ جن کے پاس نہ دین رہا ہے نہ دنیا۔ نہ انادیت رہی نہ جذبات۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

(س) مشاعرے

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ڈان کا سالانہ مشاعرہ رفتہ رفتہ قومی شعار سا بنتا جا رہا ہے کیا کوئی رجل رشید ایسا نہیں۔ جو لغویت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے بند لگاتے؟

جواب۔

اگر افیون کا اثر یہ ہے کہ وہ انسان کے قوائے عملیہ کو معطل کر دیتی ہے۔ تو ہماری شاعری کسی صورت میں بھی افیون سے کم نہیں۔ کم کیا یہ تو اس سے بھی زیادہ مہلک زہر ہے۔ وہ صرف قوائے عملیہ کو شل کر دیتی ہے، اور یہ ان قوی کو شل کرنے کے ساتھ ساتھ جذبات بہیمیہ

کو مشتعل بھی کرتی ہے۔ یعنی اس سے بیک وقت فالج اور سرسام ہو جاتا ہے۔ یہ شاعری ہمارے اس دور کی پیداوار ہے جس میں علم اور عمل دونوں پست ترین درجے تک پہونچ چکے تھے اور سامان عیش و عشرت کی فراوانی عام تھی۔ اگر کسی کی نگاہ مسلمانوں کی تاریخ پر ہے تو وہ علیٰ وجہ البصیرت دیکھ سکتا ہے کہ یہ شاعری ہمارے کتنے سفینے ڈبو چکی ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ شاعر کو عام مشاعرہ میں ایسا لائسنس مل جاتا ہے کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کہتا چلا جاتا ہے۔ اور اس سے کوئی بازپرس ہی نہیں ہو سکتی۔ آپ نثر میں یہ لکھیے کہ میں ہر شام شراب میں بدمست ہو جاتا ہوں اور کسی کی بیٹی یا کسی کی بہن۔ یا کسی کی بیوی یا کسی کی ماں میرے ہم آغوش ہوتی ہے (اس لئے کہ جسے معشوق کہا جاتا ہے اس کی حیثیت ان حیثیتوں میں سے کوئی تو ضرور ہوتی ہے) تو مہذب سوسائٹی آپ کی جوتوں سے تواضع کرے گی۔ لیکن اسی نثر کو آپ منظوم کر دیجئے تو یہی سوسائٹی آپ پر تحسین و آفریں کے پھول برسائے گی۔ طلوع اسلام اس عریاں مثال کے لئے قارئین کے ذوق سلیم سے معذرت خواہ ہے۔ لیکن اس کے سوا بات کو واضح طور پر سمجھانے کا اور کوئی طریق نہیں۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کمیابی

آپ کسی مشاعرے میں جائیے اور شاعر صاحبان سے کہیئے کہ جو کچھ آپ نے نظم میں لکھا ہے اسے نثر میں پڑھ کر سنائیے۔ اور اس کے بعد دیکھئے کہ آپ کے جذبات کا کیا عالم ہوتا ہے غور کیجئے کتنا بڑا ہے یہ سحر جس کی رو سے محض الفاظ کے ادھر ادھر رکھ دینے سے آپ کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔ لیکن سحر فریب ہی ہوتا ہے۔ حقیقت تو نہیں ہو سکتا۔ الفاظ کے ردو

Marfat.com

بدل کر دینے سے مضمون میں تو تبدیلی نہیں آجاتی۔ لیکن اس بات کو ملاحظہ فرمایئے کہ جس ایک فقرہ کو نثر میں سننے کے لئے کوئی شریف آدمی تیار نہ ہو۔ ان فقروں کی کتابوں کی کتابیں ان مجمعوں میں پوری بلند آہنگی سے دہرائی جاتی ہیں۔ جس میں قوم کا شریف ترین طبقہ (بشمول مرد و زن) موجود ہوتا ہے۔ ان فقروں پر ہر ایک سر دھنتا ہے۔ جوش مسرت سے تالیاں پیٹتا ہے۔ کیف و نشاط میں سرشار ہو کر پوری فضا کو قہقہہ بار بنا دیتا ہے۔ اور سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعروں سے اس داد و دہش میں خود "خدا" کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے شعرا حضرات آٹے میں نمک کے برابر ہوتے تھے۔ لیکن اب تو یوں نظر آتا ہے جیسے سارا آٹا وہاں رہ گیا ہو اور نمک ادھر چلا آیا ہو۔ بالخصوص ہمارا دارالخلافہ تو یکسر کان نمک بن چکا ہے۔ شاید ہی کوئی رات ایسی گذرتی ہو گی جس میں کہیں بزم مشاعرہ منعقد نہ ہو رہی ہو۔ یہ اجتماعات قومی "عمرہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تقریب "حج" کی سعادت معاصر ...... کے حصہ میں آئی ہے۔ جس طرح اطراف و اکناف کے عازمین بیت اللہ شریف دو تین مہینے پہلے سفر کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اس سالانہ مشاعرہ کی تیاریاں بھی دو تین ماہ قبل سے شروع ہو جاتی ہیں آدھے آدھے صفحے کے اشتہارات چوکھٹوں میں اعلانات، فلاں صاحب نے شمولیت کا وعدہ فرما لیا ہے۔ فلاں کا تار آگیا، فلاں کی چٹھی مل گئی۔ فلاں جہاز راں کمپنی نے اتنی "نشستیں" فی سبیل اللہ "خیرات کر دیں" فلاں فلاں صاحب اڑ کر ہندوستان پہونچ رہے ہیں۔ تاکہ شعراء حضرات کو اپنے

صلہ کراچی کے ایک روزنامے کی طرف سے ہر سال مشاعرہ کا اہتمام ہوتا تھا۔

Marfat.com

کندھوں پر اٹھا لائیں۔ یہ ٹکٹ ہوگا۔ وہ جگہ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اقبال نے آج سے چالیس سال قبل۔ پہلے پہل اہل یورپ کو دیکھنے کے بعد مدیر مخزن کو لکھا تھا۔

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

دنیا کی تاریخ اور انسانی زندگی کے مشاہدات اس حقیقت کی حرفاً حرفاً تائید کر رہے ہیں کہ اس قسم کی شاعری بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ ویسے تو کسی دور میں بھی بے کار قوم کبھی پنپ نہیں سکی لیکن اس دور میں کشمکش روزگار اس قدر شدید ہو چکی ہے کہ بیکاری تو ایک طرف اگر کوئی راہرو پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے بھی رک جائے تو چلنے والوں کا ریلا اسے کچل کر رکھ دیتا ہے۔ سوچئے کہ ان حالات میں وہ قوم کس طرح سے پنپ سکتی ہے جس کے اتنے بڑے طبقہ کا مشغلہ (ملکہ یوں کہیئے کہ پیشہ)" باتیں بنانا" ہو، اور قوم کا باقی حصہ ان باتوں پر" واہ واہ" میں سر دھنتا رہے۔

تفریح ہمیں تسلیم ہے کہ انسانی زندگی میں تفریح کا گوشہ بھی نہایت ضروری ہے؛ لیکن اسے نہ بھولئے کہ تفریح اسی کو زیب دیتی ہے جو کام کرنے سے تھک گیا ہو۔ جو قوم کام کے بجائے محض تفریح ہی میں مشغول رہے۔ وہ خود زمانے کے لئے تفریح بن جاتی ہے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ ہمارے ہاں شاعری کو تفریح کا سامان سمجھا جاتا ہے؟ کسی شاعر سے پوچھئے۔ وہ اپنی شاعری کو یہ سمجھے بیٹھا ہوگا کہ زمین اور آسمان اسی کے آسرے پر قائم ہیں۔ وہ اسے فطرت کے راز مستور قرار دے گا اور انسانیت کے تمام مسائل کا حل اسی کو ٹھہرائے گا۔ شروع شروع میں تو وہ اس قسم کی باتیں محض تکلفاً کرے گا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد

وہ ایسے فریب نفس میں مبتلا ہو جائے گا کہ وہ ہجر و وصل کی ان فرضی کہانیوں کو سچ مچ حقائق
ماورا کائنات سمجھنے لگ جائے گا۔ اگر آپ کہیں اس سے یہ کہدیں کہ ہم تو شاعری کو محض تفریح
کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو وہ اسے ہتک قرار دے گا۔ اس لئے یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہ مشاعرے
محض تفریح کا سامان ہیں۔ اور تفریح انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ یہ مشاعرے
ہماری بیکاری کے مظاہر۔ ہمارے فریب نفس کی دلیل ، ۔ ہمارے ایضاع مال و قوت کا
موجب اور ہماری قوت عملیہ کے مفلوج کر دینے کا ذریعہ ہیں۔ انہی نے ہمیں پہلے تباہ کیا اور
... یہی ہمیں اب تباہ کریں گے۔ آنیوالا مورخ اس تباہی کا سہرا معاصر ...... کے
سر باندھے گا۔

پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ لغویات و خرافات کے اس محضرنامے کی پیشانی پر " ۷۸۶
کا مقصد پورا کرنے کے لئے لکھ دیا جاتا ہے کہ اس کی آمدنی فلاں فنڈ میں دیدی جائے گی
چنانچہ اس مرتبہ اعلان ہوا ہے کہ آنیوالے مشاعرے کی آمدنی سیلاب زدگان پنجاب کے
امدادی فنڈ میں دی جائے گی۔

سطحی اخلاق Cheap Morality کی ایسی
مثالیں کم دیکھنے میں آئیں گی۔ سمجھا جاتا ہے کہ ذریعہ خواہ کوئی بھی اختیار کر لیا جائے۔ اگر اس
سے حاصل شدہ آمدنی کسی "کار خیر" میں صرف کر دی جائے تو اس ذریعہ کا عیب عیب نہیں
ثواب بن جاتا ہے۔ معلوم نہیں اس کا نام خدا فریبی ہے۔ یا خود فریبی۔

حیات بعد الممات

پرویز صاحب کے نام خط۔

آپ نے طلوع اسلام کے شمارہ دسمبر ۱۹۵۱ء کے باب المراسلات میں انسانی ارتقاء[1] کے بارے میں تحریر فرمایا۔

جب جسمانی نظام طبعی قانون کے ماتحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔ کیا آپ مہربانی کر کے اس "اور نظام" پر روشنی ڈالیں گے کہ وہ نظام کیا ہے۔ اور کس طرح بروئے کار آئے گا۔؟

جواب۔

زندگی کی موجودہ منزل میں انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ زندگی کی آئندہ منزل کے متعلق کچھ معلوم کر سکے۔ ہمارے ذرائع معلومات

---

[1] دیکھئے صفحہ ۳۴۷

ہمارے حواس واحساسات ہیں۔ اور ان کا تعلق محسوسات ومدرکات سے ہے۔ لہٰذا جو چیز
اس دائرہ سے باہر ہوں ان کے متعلق ہم اپنے موجودہ ذرائع معلومات کی رو سے کچھ معلوم نہیں
کر سکتے۔ آنے والی زندگی کیسی ہوگی۔ اس کا نظام کیا ہوگا۔ اس کی شکل وصورت کیا ہوگی ہم
نہیں جان سکتے۔ اس پر البتہ ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے۔... .. اس
لئے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی یقینی ہے۔ اب تو سائنس کی تحقیقات کا رخ بھی
اس طرف ہے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا امکان یقینی ہے

علاوہ ازیں موجودہ زندگی میں اس کاوش کی بھی ضرورت نہیں کہ آینوالی زندگی کی
کیفیت کیا ہوگی، آنے والی زندگی کا تعین قانون مکافات عمل کے لئے ضروری ہے۔ اور
جس شخص کا ایمان ہے کہ زندگی مسلسل ہے اس کا یہ ایمان قانون مکافاتِ عمل کی غیر
منقطع ہمہ گیری کے لئے کافی ہے۔ یہی وہ ایمان ہے جس پر اسلامی تصورِ حیات کی عمارت
اٹھتی ہے۔

حیات بعد الممات میری تصنیف سلسلہ معارف القرآن کی آخری کڑی ہے (لیکن)
ہے۔ اس وقت انشاء اللہ اس کے متعلق پورا پورا قرآنی تصور اور سائنس کے انکشافات
پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

(س) **عذاب قبر** "طلوع اسلام کی حالیہ اشاعت بابت اکتوبر ۷۹
میں شخصیت پرستی[1] کے عنوان سے جو مضمون شائع

[1] یہ مضمون "مقام حدیث" میں الگ شائع کر دیا گیا ہے۔

ہوتا ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ مُردوں میں شعور اور احساس کچھ نہیں ہوتا۔ نہ وہ ہماری سنتے ہیں نہ اس کا علم رکھتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کب اٹھائے جائیں گے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مُردے بالکل بے حس ہوتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر عذاب قبر کیسے ہوتا ہے۔ ہمیں تو یہ بتایا جاتا ہے کہ جب ہم مردے کو دفن کرکے واپس آتے ہیں تو مُردہ چیختا چلاتا ہے۔ وہ ہمارے پاؤں کی آہٹ سنتا ہے۔ لیکن ہم اس کی آواز نہیں سن سکتے۔ اتنے میں قبر میں منکر نکیر آجاتے ہیں۔ مردے سے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ اور پھر نیک لوگوں پر جنت کی کھڑکی کھل جاتی ہے۔ اور گنہگاروں پر عذاب شروع ہو جاتا ہے اس زندگی کو حالت برزخ کہتے ہیں۔ جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ اس کے متعلق وضاحت سے لکھیے کہ یہ عقیدہ غلط ہے یا صحیح ہے۔"

جواب۔

قبر کے عذاب کا عقیدہ ان عقائد میں سے ایک ہے۔ جس کی قرآن سے کوئی سند نہیں ملتی۔ اور جو بعد میں اسلام میں داخل کئے گئے ہیں۔ یہی نہیں کہ اس کی قرآن سے کوئی سند نہیں ملتی۔ بلکہ قرآن اس کی بصراحت تردید کرتا ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے کافی بحث ہو چکی ہے۔ اتفاق سے اس وقت ہمارے سامنے علامہ اسلم جیراجپوری کی تصریحات موجود ہیں۔ جن سے استفادہ باعث اطمینان ہوگا۔

برزخ برزخ کا لفظ قرآن میں روک یا آڑ کے معنی میں مستعمل ہے

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا (۲۵-۵۳)

Marfat.com

اور اللہ نے ان دونوں (شور و شیریں سمندر) میں آڑ رکھدی۔ اور رکاوٹ کی اڈٹ

دوسری جگہ بجائے برزخ کے حاجز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا (۲۵-۵۳)

اور اللہ نے دونوں سمندروں میں آڑ رکھدی ہے

تاکہ وہ دونوں اپنے اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (-۵۵)

دونوں سمندروں کے درمیان آڑ ہے۔ جس سے وہ آگے نہیں بڑھتے

یہی معنی برزخ کے اس آیت میں ہیں۔

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (-۵۵)

اور ان مرنے والوں کے آگے آڑ ہے۔ اس دن تک کہ جس دن وہ اٹھائے

جائیں گے۔

یعنی برزخ کی مدت مرنے والوں کی موت سے لے کر حشر تک ہے کہ اس میں وہ اپنے رب کی حضوری سے آڑ میں رکھے جائیں گے۔ اور جب حشر ہوگا۔ اللہ کے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ
(۳۶-۵۳)

بس ایک شور ہوگا۔ اور ہمارے پاس وہ سب کے سب حاضر کر دیئے جائیں گے

شہدا یعنی مقتولین فی سبیل اللہ جن کی زندگی کی قرآن نے تصریح فرما دی ہے۔ وہ

Marfat.com

برزخ یعنی آڑ میں نہیں بلکہ "عند ربھم" اپنے رب کی حضوری میں ہیں۔ جہاں ان کو نئی زندگی مل گئی ہے۔ اور وہ روزی پاتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے۔ ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کی حضوری میں روزی پاتے ہیں۔

یہ عالم برزخ جس میں شہدا کے سوا باقی مردے رکھے جاتے ہیں۔ اور قرآن کے نزدیک مطلق عالم ممات ہے۔ جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں۔ چنانچہ ان اولیاء اور بزرگان کی نسبت جن کو مشرکین پوجتے ہیں قرآن میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶-۲)

اور وہ اللہ کے ماسوا جن کو پکارتے ہیں۔ وہ کوئی شے پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔ اور (اتنی خبر) بھی نہیں رکھتے کہ کب اٹھائیں جائیں گے۔

اس آیت میں جن معبودان ماسوی اللہ کا ذکر ہے۔ وہ بت یا شجر یا قمر یا شمس وغیرہ بے جان چیزیں نہیں۔ کیونکہ ان چیزوں کے لئے نہ اموات کا لفظ مستعمل ہو سکتا ہے نہ احیاء کا۔ بلکہ یہ وہی ان کے بزرگان دین ہیں۔ جن کو مقبول بارگاہ اور متصرف مان کر وہ پوجتے

Marfat.com

ہیں۔ دوسری آیت میں یہ امر اور بھی واضح ہے

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غَافِلُوْنَ۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَآءً وَّکَانُوْا بِعِبَادَتِھِمْ کٰفِرِیْنَ (۴۶-۶)

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے۔ جو اللہ کے سوا ان لوگوں کو پکارتا ہے۔ جو قیامت کے دن تک بھی اس کو جواب نہیں دینے کے۔ اور ان کی پکارسے بے خبر ہیں۔ اور جب لوگ (حشر کے لئے) اٹھائے جائیں گے۔ تو وہ ان کے دشمن ہوں گے۔ اور ان کی پرستش کا انکار کر دیں گے۔

اس سے جہاں اس بات کی تصریح نکلی کہ معبودان غیر اللہ پکارنے والوں کی پکارسے بے خبر ہیں۔ وہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ معبودان بت وغیرہ بے جان چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ وہی بزرگان دین اور مقبولان بارگاہ ہیں۔ جو قیامت کے دن ان کی پرستش سے انکار کر دیں گے۔ کیونکہ بے جان چیزوں میں انکار کی قدرت نہیں ہے۔

تیسری آیت میں انھیں معبودان غیر اللہ یعنی بزرگان دین کی سماعت کا انکار ہے

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ۔ اِنْ تَدْعُوْھُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا

Marfat.com

لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ (۳۵ — ۱۴)

اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو۔ وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ تم اگر ان کو پکارو گے۔ تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور جو سنتے بھی تو جواب نہ دیں گے۔ اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔

اس انکار کی کیفیت قرآن میں کئی جگہ بیان کی گئی ہے

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ۔ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۶ — ۸۶)

اور جب مشرکین قیامت میں اپنے شرکا کو دیکھیں گے۔ تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب یہی وہ شرکا ہیں۔ جن کو ہم تیرے سوا پکارتے تھے۔ وہ شرکا ان کو جواب دیں گے۔ تم بالکل جھوٹے ہو۔

دوسری جگہ ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ۔ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ (۱۰ — ۲۹)

Marfat.com

اور جس دن سب کو ہم جمع کریں گے۔ تو مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکا اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو جاؤ۔ پھر ان کے تعلقات کو ہم منقطع کر دیں گے۔ ان کے شرکا کہیں گے کہ تم ہم کو نہیں پوجتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان میں اللہ کی شہادت کافی ہے کہ ہم تمہاری پرستش سے بے خبر تھے۔

ان آیات سے جہاں اس کا بین ثبوت ملتا ہے کہ مشرکین کے معبودان غیر اللہ ان کے مردہ اولیاء اور بزرگان دین ہی ہیں۔ جن کو وہ مقبولان بارگاہ اور صاحبان قدرت سمجھ کر پوجتے تھے۔ وہاں یہ بھی تصریحاً ثابت ہوتا ہے کہ تمام مردے جو برزخ میں ہیں۔ ان میں نہ علم ہے۔ نہ احساس نہ شعور نہ سماعت اور بالکل غافل اور بے خبر ہیں۔ اور قیامت کے دن اپنے پوجنے اور پکارنے والوں کو صاف جواب دیدیں گے کہ نہ ہم کو تمہاری پرستش کی خبر تھی نہ تمہاری پکار کی۔

اب ایک دوسری حیثیت سے دیکھئے۔ قرآن کی رو سے انسان کی صرف دو ہی موتیں اور دو ہی زندگیاں ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن کفار کہیں گے

أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ (– ۱۱)

(اے رب) تو نے ہم کو دوبارہ موت دی۔ اور دوبارہ زندہ کیا۔ ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا جہنم سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔

یہ اگرچہ کفار کا قول ہے۔ لیکن حقیقت ہے۔ کیونکہ سورہ بقر میں اللہ فرماتا ہے۔

Marfat.com

كُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲ - ۲۸)

تم مردہ تھے۔ اس نے تم کو زندگی بخشی۔ پھر وہ تم کو موت دے گا۔ پھر تم کو زندہ کرے گا پھر تم اس کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

دنیاوی زندگی سے پہلے کی حالت موت سے تعبیر کی گئی ہے۔ جس کے بعد یہ زندگی ملی ہر پھر موت آئے گی۔ پھر اس کے بعد دوسری زندگی ملے گی۔ جس کے لئے موت نہیں ہے اب یہ دوسری زندگی کس دن ملیگی؟ قبر میں یا حشر کے دن؟ قرآن بتلاتا ہے کہ یہ دوسری حشر کے دن ملیگی۔

ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ○ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ (۲۳-۱۶)

پھر تم اس کے بعد مرنے والے ہو۔ پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اس لئے یہ متعین ہو گیا کہ دوسری زندگی جو انسان کو ملے گی۔ وہ حشر کے دن ملے گی۔ نہ کہ قبر میں۔ لہذا اس دنیاوی زندگی سے منقطع ہو جانے کے بعد اہل برزخ میں مطلقاً زندگی کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اور زمانہ چونکہ اعتباری شے ہے۔ اور اہل برزخ میں شعور اور احساس نہیں ہے۔ اس لئے زمانہ کا بھی ان کو احساس نہیں ہے۔ چنانچہ جب قیامت کے دن وہ اٹھائے جائیں گے۔ تو اپنے خیال میں اپنے آپ کو اسی ساعت اور اسی لمحے میں سمجھیں گے۔ جس میں ان کی جان نکلی تھی۔ اور کہنے لگیں گے۔

Marfat.com

يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶-۵۲)

ہائے ہماری شامت! کس نے ہم کو ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا

یعنی حشر کے وقت وہ اپنے آپ کو اپنی خوابگاہ ہی میں سمجھتے ہوں گے۔ جہاں مرض الموت میں مرے تھے۔ اور ان کو اپنے گاڑنے یا جلانے کی بھی خبر نہ ہو گی۔ مرقد کے معنے اس آیت میں قبر کے نہیں ہیں۔ جن میں اردو شعراء اس کو استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ بستر خواب کے ہیں کیونکہ رقاد کے حقیقی معنی نیند کے ہیں۔ قرآن کریم میں اصحاب کہف کے قصہ میں یہ لفظ آیا ہے۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ (۱۸-۱۸)

اور تو ان کو بیدار خیال کرے گا۔ حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں

الغرض یہ امر قرآن کے نصوص صریحہ سے روز روشن کی طرح ثابت ہو گیا کہ موت اور حشر میں مردوں کے لئے فصل زمانی نہیں ہے۔ یعنی ان کو برزخ کے زمانہ کا مطلق احساس نہ ہو گا۔ اور جب وہ محشور ہوں گے۔ تو اپنے خیال میں اسی ساعت اور اسی لمحہ میں اپنے آپ کو سمجھتے ہوں گے جس میں ان کی جان نکلی تھی۔ دوسری آیتوں میں زمانہ برزخ کی مقدار بمنزلہ ایک گھڑی کے بتائی گئی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ (۱۰-۴۵)

اور جس دن اللہ ان کو اٹھائیگا۔ گویا وہ نہیں رہے۔ مگر دن کی ایک گھڑی

اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ (۳۵)

جس دن وہ اس (حشر) کو دیکھیں گے۔ جس سے ان کو ڈرایا جاتا ہے (وہ یہ خیال کریں گے) کہ گویا وہ نہیں رہے۔ مگر دن کی ایک گھڑی۔

ان کا یہ گمان محض تبدیلیٔ حالت کی وجہ سے ہوگا۔ ورنہ وہ حقیقت میں ایک گھڑی بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت یَا وَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں "کان" (گویا) کا لفظ تشبیہ مستعمل ہو رہا ہے۔ یعنی حقیقتاً تو وہ اپنے علم میں ایک لمحہ بھی برزخ میں نہیں رہے۔ صرف ایسا خیال کریں گے کہ ہم ایک گھڑی رہے ہیں۔ کیونکہ حالت بدلی ہوئی ہو گی۔

(مجرمین جن کی نسبت لوگ سمجھتے ہیں کہ برزخ میں رات دن ان پر گرز کی مار پڑتی رہتی ہے۔ اور آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے ان کے اوپر یہ مدتِ برزخ۔ بیمار کی رات کی طرح جو بہت دراز ہوتی ہے۔ کروڑوں سال کی ہونی چاہیے تھی۔ وہ بھی یہی کہیں گے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَٰلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ

Marfat.com

اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ فَھٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰکِنَّکُمْ
کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (-۵۶)

اور جس دن قیامت قائم ہو گی۔ مجرم قسم کھائیں گے کہ وہ تو بس ایک گھڑی رہے۔ اور اسی لئے وہ بھٹکائے جاتے تھے۔ اور جن کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ کہیں گے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں رہے قیامت تک، سو یہ قیامت کا دن ہے۔ مگر تم نہیں جانتے تھے۔

مجرم تو حشر کے دن قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ مگر اہل علم و ایمان ان سے کہیں گے کہ تم اللہ کے نوشتہ میں قیامت تک رہے۔ لیکن تم کو خبر نہ تھی یہ تصریح ہے ان کے عدم احساس زمانی کی۔ خود ان مومنوں کو بھی احساس نہ تھا جیسا کہ ہم اوپر کی آیتوں سے ثابت کر چکے ہیں۔ مگر اپنی یوم البعث پر عقیدہ رکھنے کے باعث وہ قیامت کے دن کو پہچان لیں گے اور کہنے لگیں گے کہ برزخ کی طویل مدت تم پر گذر چکی ہے۔ مگر تم کو علم نہ تھا۔

ہماری یہ تمام بحث انسانی جسم کے متعلق نہیں ہے جو سڑ کر اور گل کر عناصر میں مل جاتا ہے۔ بلکہ اس کی روح کے متعلق ہے۔ عالم برزخ میں روح کی بقاء کے متعلق جو کچھ قرآن میں کہا گیا ہے۔ وہ یہی ہے کہ اس کا علم اللہ کے نوشتہ میں ہے جیسا کہ آیت بالا میں اہل ایمان و علم کے قول سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسری آیت ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی قَالَ عِلْمُھَا

عِنۡدَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ (۲۰ - ۵۲)

فرعون نے پوچھا کہ گزشتہ نسلوں کی کیا حالت ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس نوشتہ میں ہے

اس کی تصریح پارہ عم میں ہے۔

اِنَّ کِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِیۡ سِجِّیۡنٍ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا سِجِّیۡنٌ کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ (۸۳ - ۹)

گنہ گاروں کا اندراج سجین میں ہے۔ اور تجھے کیا خبر کہ سجین کیا ہے۔ وہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

اِنَّ کِتٰبَ الۡاَبۡرَارِ لَفِیۡ عِلِّیِّیۡنَ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا عِلِّیُّوۡنَ کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ (۸۳ - ۲۱)

نیکوکاروں کا اندراج علیین میں ہے۔ اور تجھے کیا معلوم کہ علیین کیا ہے؟ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔

اسی کو سابقہ آیات میں لبثت فی کتاب لکھا گیا ہے جس سے مراد قیام برزخ کی مدت ہے دوسرا لفظ لبث فی الارض ہے جس سے مراد روئے زمین پر رہنے کی مدت یعنی دنیاوی زندگی ہے۔ اس کا بھی قیامت کے دن سوال ہوگا۔ اس کے جواب میں لوگ ایک گھڑی نہیں بلکہ ایک دن کہیں گے۔

Marfat.com

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ قَالُوا لَبِثْنَا

يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْأَلِ الْعَادِّينَ

اللہ پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے۔ وہ کہیں گے کہ ایک دن یا اس

سے بھی کم ان لوگوں سے پوچھ جو شمار رکھتے تھے

دوسری آیت میں دس دن کا بھی ذکر ہے۔

يَتَخَافَتُونَ بَيْنَهُمْ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا عَشْرًا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا

يَقُولُونَ إِذْ يَقُولُ أَمْثَلُهُمْ طَرِيقَةً إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا ۲۰-۱۰۵

وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ تم نہیں رہے مگر دس دن۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ

وہ کہیں گے۔ جو سب سے زیادہ رو براہ ہوگا۔ وہ کہیگا کہ تم تو صرف ایک دن رہے

نتائج

ان تمام تفصیلات کے بعد ہم حسب ذیل نتائج پر پہونچتے ہیں جو قرآن کریم سے تصریحاً ثابت ہوتے۔

(۱) عالم برزخ عالم ممات ہی ہے جس میں نہ مُردوں میں شعور ہے نہ احساس۔ نہ علم نہ سمع، نہ حیات کا کوئی شائبہ!

(۲) انسان کے لئے دو ہی زندگیاں ہیں اور دو ہی موتیں۔ پہلی زندگی یہ دنیوی زندگی ہے۔ اور دوسری زندگی حشر کے دن ملیگی۔ برزخ میں زندگی نہیں ہے

(۳) اہل برزخ کو زمانہ کا مطلق احساس نہیں ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ مرنے والے کے لئے موت ہی کا دن حشر کا دن ہے۔

Marfat.com

ان تصریحات کے ہوتے ہوتے برزخ میں عذاب یا ثواب کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں عذاب یا ثواب کا ذکر ہے۔ وہاں صرف دنیاوی اور اخروی عذاب و ثواب کا ذکر ہے۔ برزخ کا کہیں نام تک نہیں آیا ہے۔

سینکڑوں آیتیں مختلف قسم کے مجرموں کے عذاب کے متعلق ہیں۔ مگر کسی میں سوائے دنیا اور آخرت کے عذاب کے برزخ کے عذاب کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اور ہو کیسے جبکہ نہ برزخ میں حیات کا کوئی شائبہ ہے۔ نہ زمانۂ عذاب و ثواب سے اثر پذیری کی کوئی صلاحیت یہی وجہ ہے کہ بجز ان انفرادی اور اجتماعی اعمال کے جن کی سزا یا جزا لازمی طور پر دنیا میں بھی مل جاتی ہو۔ اور جن کی تصریح آیاتِ قرآنی میں کر دی گئی ہے۔ صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ دارالجزاء آخرت ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ
وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۶ — ۶۱)

اور اگر اللہ لوگوں کا ان کے گناہوں پر مواخذہ کرنے لگتا۔ تو زمین میں کوئی جاندار نہ چھوڑتا۔ لیکن اس نے لوگوں کو ایک وقت مقررہ تک مہلت دے رکھی ہے۔

یہ "اجل مسمیٰ" کون سا دن ہے؟ اس کی تصریح کئی جگہ قرآن میں کر دی گئی ہے۔

لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۔ لِيَوْمِ الْفَصْلِ (۷۷-۱۲)

کس دن کے لئے مہلت دی گئی ہے فیصلہ کے دن کیلئے

یہ فیصلہ کا دن قیامت کا دن ہے۔

وَقَالُوا يَا وَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۲۷-۲۰)

اور کافر کہیں گے کہ ہائے ہماری شامت! یہ انصاف کا دن ہے (ہاں) یہی وہ فیصلہ کا دن ہے۔ جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

اس لئے دنیا کے بعد حساب وکتاب وعذاب کا دن قیامت کا دن ہو۔ برزخ نہیں ہے یہاں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اللہ کے یہاں انصاف ہے۔ یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ کہ جس نے حضرت نوحؑ کا انکار کیا۔ وہ پانچ ہزار برس پہلے سے عذاب سہے اور برزخ میں جلے۔ اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا۔ وہ پانچ ہزار یا دس ہزار برس بعد۔

اعتراضات کا جواب

قرآن کی رو سے دونوں کے فیصلہ کا ایک ہی دن مقرر ہے اسی دن ان کے اعمال نامے نکالے جائیں گے۔ اور حساب وکتاب ہوگا۔ اور جزا و سزا دی جائے گی۔ برزخ کے زمانے کا دونوں میں سے کسی کو احساس نہ ہوگا۔

اب میں ان چند آیات کو بھی لکھ دیتا ہوں۔ جسے لوگوں نے غلط فہمی سے برزخ کا عذاب سمجھا ہے

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۳۲)

جن کو فرشتے اس حالت میں وفات دیتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں (تو ان سے) کہتے ہیں کہ تمہارے اوپر سلامتی ہو۔ تم جنت میں داخل ہو۔ ان کاموں کے عوض جو تم کرتے تھے۔

یہ آیت خاص دار آخرت کے متعلق ہے۔ برزخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کا سلسلہ بیان یہ ہے۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ۔ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۱۳۲)

اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے۔ اور کیسا اچھا گھر ہے پرہیزگاروں کا۔ ہمیشہ رہنے والے باغات میں وہ داخل ہوں گے۔ جن کے نیچے بہتی نہریں ہوں گی ان میں جو کچھ وہ چاہیں گے۔ ان کو وہ ملے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔ جن کی جانیں ملائکہ نے اس حالت میں قبض کی ہیں جبکہ وہ پاک تھے۔ کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو۔ اپنے عمل کے بدلے جنت میں چلو

دوسری آیت جس سے لوگوں کو عذاب برزخ کا خیال ہوا ہے یہ ہے۔

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ۔ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ

Marfat.com

عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ

اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ

اور آلِ فرعون کو برے آگ کے عذاب نے گھیر لیا۔ جس پر وہ صبح و شام پیش

کئے جائیں گے۔ اور قیامت کے دن کہا جائیگا کہ آلِ فرعون کو سخت ترین عذاب

میں ڈال دو

آیت کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ آل فرعون غرق ہونے کے بعد روزانہ صبح اور شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ عذاب برزخ ہے۔ پھر جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں داخل کر دو۔

یہ مفہوم ان تمام قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جو پہلے بدلائل بیان کر دی گئی ہیں کیونکہ اگر برزخ میں آل فرعون روزانہ صبح و شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ تو ان میں زندگی اور عذاب کی اثر پذیری کی صلاحیت یعنی شعور و احساس بھی ہونا چاہیئے۔ جن کا قرآن تصریحاً انکاری ہے۔ اور قرآنی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ دراصل ساری خرابی اس وجہ سے ہے کہ "یعرضون" کے معنی یہاں حال کے لئے گئے ہیں۔ یعنی وہ پیش کئے جاتے ہیں۔" حالانکہ یہاں اس کے معنی استقبال کے ہیں۔ کیونکہ کفار جن میں آلِ فرعون بھی شامل ہیں۔ ان کی آگ پر پیشی قیامت ہی کے دن ہوگی۔

وَ يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَذْهَبْتُمْ

طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيٰوتِكُمُ الدُّنْيَا (۴۶ — ۲۰)

Marfat.com

اور جس دن کفار آگ پر پیش کئے جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) کہ

تم اپنی لذتیں دنیوی زندگی میں اٹھا چکے۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ آگ پر پیشی دوسری زندگی میں ہوئی۔ جو حشر کے دن ملے گی چنانچہ سورۃ ہود میں اس کی تصریح موجود ہے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ (۱۱-۹۸)

فرعون اپنی قوم کے آگے آگے آئے گا۔ قیامت کے دن اور ان کو آگ میں

اتارے گا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ برزخ کا غیر زمانی ہونا ہم ثابت کر چکے ہیں۔ اس میں نہ صبح ہے نہ شام اور اس آیت میں غُدُوًّا وَّعَشِيًّا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ بجنسہ اسی طرح جس طرح جنت کے لئے بُكْرَةً وَّعَشِيًّا کا لفظ آیا ہے۔ جس کے معنی مفسرین اور اہل لغت نے دوام کے لکھے ہیں۔

وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (۱۹-۶۲)

اور جنتیوں کو ان کی روزی اس میں صبح و شام ملتی رہیگی

جو صبح اور شام جنت میں ہے۔ وہی دوزخ میں ہوگی۔ خواہ اس کے معنی دوام کے لئے جائیں یا کچھ اور۔ اب اس طرح آیت کا دوسرا حصہ پہلے حصہ کی تشریح ہوگا۔ یعنی آل فرعون کو آگ کا دائمی عذاب جو دیا جائے گا۔ وہ اس طرح ہوگا کہ فرشتوں کو حکم ملے گا کہ ان کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو۔

Marfat.com

وَاَتْبَعْنَاهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ (۲۸-۴۲)

اور ہم نے اس دنیا میں آل فرعون کے پیچھے لعنت لگا دی۔ اور قیامت کے دن وہ برے حال میں ہوں گے۔

دنیا میں ان کے ملعون اور قیامت میں مقبوح ہونے کی تصریحات کی گئی ہیں۔ مگر برزخ کا نام نہیں لیا گیا۔

اصلیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جا بجا موت کے ساتھ ہی ساتھ عذاب یا ثواب کا جو ذکر آتا ہے وہ قیامت کے دن عذاب یا ثواب ہے۔ برزخ کا نہیں ہے کیونکہ موت اور قیامت میں مُردوں کے لحاظ سے فصل زمانی نہیں ہے۔ لوگوں کی نظر چونکہ اس نکتہ پر نہ تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے عام اعتقاد کے مطابق اس عذاب و ثواب کو موت کے بعد برزخ کا سمجھ لیا۔

جو حال آلِ فرعون کا ہے۔ بجنسہٖ وہی حال قوم نوحؑ کا ہے۔ یعنی وہ بھی قیامت ہی کے دن آگ میں داخل کیے جائیں گے

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا (۲۵)

وہ غرق کیے گئے اور آگ میں داخل کیے گئے۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا ضروری ہے کہ قرآن میں جنت کے ثواب اور جہنم کے عذاب کے متعلق جا بجا ماضی ہی کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں۔ کیونکہ اللہ جو زمانہ سے بری ہے۔ اس کے

Marfat.com

سامنے یہ سب واقعات حاضر ہیں۔ مثلاً حشر کے متعلق ہے

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا

لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا (۱۴ - ۲۱)

اور وہ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوئے۔ اور کمزوروں نے ان لوگوں سے

کہا جو بڑے بنتے تھے۔

یا جہنمیوں کے بارے میں ہے۔

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ (۲۲ - ۲۰)

جن لوگوں نے کفر کیا۔ ان کے لئے آگ کے کپڑے تراشے گئے۔

یا جنتیوں کے متعلق ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ

اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ (۳۷ - ۵۱)

جنتیوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف سوال کرتے ہوئے رخ کیا۔ ایک

کہنے والے نے کہا کہ میرا (دنیا میں) ایک ساتھی تھا۔

اس لئے قوم نوح کے متعلق جو ماضی کے صیغے مستعمل ہوئے ہیں۔ یہ قیامت کے دن کے لئے ہیں۔ کیونکہ دوسرے مقامات میں فیصلہ حساب وکتاب اور عذاب و ثواب کے دن کی تصریح کردی ہے کہ وہ یوم الحشر ہے۔ لہذا ماضی کے صیغوں سے استدلال صحیح نہیں۔

تیسری آیت جو برزخ کے عذاب کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ یہ ہے

وَلَوْ تَرٰى إِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
بَاسِطُوْٓا أَيْدِيْهِمْ أَخْرِجُوْٓا أَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ
عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ
وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى
كَمَا خَلَقْنٰكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ
وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ
الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا

(۶ — ۹۴)

اور تو دیکھتا رہا جب یہ ظالم موت کے سکرات میں ہوتے ہیں۔ اور فرشتے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی جانیں نکال دو۔ آج کے دن تم کو ذلت کا عذاب دیا جائیگا۔ اس لئے کہ تم اللہ پر جھوٹ بولتے تھے۔ اور تم ہمارے پاس اکیلے آئے۔ جس طرح کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا۔ اس کو پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔ اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے۔ جن کی بابت تم گمان رکھتے تھے کہ تمہارے امور میں وہ ہمارے ساجھی ہیں۔

اس آیت میں الیوم کے لفظ سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ برزخ کا عذاب ہے۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ برزخ غیر زمانی ہے۔ اور موت اور قیامت کے دن میں مُردوں کے ک

Marfat.com

سے فصیل نہیں۔ تو یہ آج یعنی موت کا دن بعینہٖ قیامت کا دن ہے۔ چنانچہ آیت میں اول مرۃ (جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا) کا لفظ صاف تصریح کر رہا ہے۔ کہ یہ حیاتِ اخروی کا واقعہ ہے۔ دوسری جگہ اسی آیت کے ساتھ حشر کی تصریح کر دی گئی

وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۸-۴۸)

اور ہم ان کو حشر میں اٹھائیں گے۔ اور ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور وہ صف بستہ تیرے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) کہ تم ہمارے پاس آئے۔ جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا

اس میں باوجود اس کے کہ سارے صیغے ماضی کے مستعمل ہوئے ہیں۔ تصریح کی گئی ہے۔ کہ یہ سوال وجواب حشر کے دن کا ہے۔

الغرض قرآن کریم سے عذاب یا ثواب برزخ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ عقیدہ حدیث کی بنیاد پر قائم ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "میرے پاس مدینہ کی دو یہودی بڑھیا عورتیں آئیں۔ انھوں نے کہا کہ قبر میں مردوں پر عذاب ہوتا ہے۔ میں نے ان کو جھٹلایا۔ جب وہ دونوں چلی گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے۔ تو یہ بات میں نے آپؐ سے ذکر کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں ان دونوں عورتوں نے سچ کہا۔ مردوں پر قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ جس کو سارے چوپائے سنتے ہیں

Marfat.com

پھر اس کے بعد سے میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلعم ہر نماز کے بعد عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے"۔ یعنی اس وقت تک رسول عظیمؐ عذاب قبر سے خالی الذہن تھے۔ ان یہودی عورتوں کے کہنے سے خیال پیدا ہو گیا

یہ اور اسی قسم کی حدیثیں ہیں۔ جن سے اس عقیدہ کی تخلیق ہوئی

چونکہ مستفسر نے صرف عذابِ قبر سے (یا عالمِ برزخ) کے متعلق ہی سوال کیا ہے اس لئے ہم نے جواب کو بھی اسی حد تک محدود رکھا ہے۔ ورنہ اصل سوالات تو یہ ہیں۔ کہ قرآن کے نزدیک حیات کسے کہتے ہیں؟ موت کے کیا معنی ہیں؟ قیامت کا تصور کیا ہے؟ عذاب و ثواب سے کیا مفہوم ہے؟ جنت اور دوزخ سے کیا مقصود ہے؟ نجات کا قرآنی تصور کیا ہے؟ وقس علیٰ ہذا۔ مسلمان کو چونکہ اس زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا (کہ زندگی سے واسطہ زندوں کو ہوا کرتا ہے۔ مردے کیا جانیں کہ زندگی کسے کہتے ہیں) اس لئے اس نے ان اہم سوالات کو قیامت پر ملتوی رکھا ہے۔ اور قیامت بھی صرف وہ جو مرنے کے بعد آئے گی۔ وہ اس قیامت سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ جو اس کی ایک ایک سانس میں پوشیدہ ہے۔ اور اس

قیامت موجود

جنت و دوزخ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ جو قدم قدم پر اس کے سامنے ہے۔ نہ وہ اس میزان کو دیکھتا ہے جس میں قوموں کے اعمالِ حیات ہر آن تلتے رہتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ اس عذاب و ثواب پر نگاہ رکھتا ہے۔ جو اس کی زندگی کے ہر ثانیہ کو متاثر کئے جا رہا ہے

Marfat.com

یہ ہیں وہ سوالات جو زندگی کے حقائق سے متعلق ہیں۔ لیکن مسلمان حقائق کا سامنا کبھی نہیں کرنا چاہتا کہ ان حقائق کے آئینہ میں اسے اپنی تصویر ایسی بھیانک دکھائی دیتی ہے جس سے اس کی چیخیں نکل جاتی ہیں۔ اسی لئے اسی میں عافیت سمجھ رکھی ہے کہ حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ گویا آنکھیں بند کر لینے سے حقائق معدوم ہو جائیں گے۔

بہر حال یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ مردوں میں نہ شعور ہوتا ہے۔ نہ احساس۔ نہ وہ ہماری سنتے ہیں نہ اس کا کچھ علم رکھتے ہیں۔ لیکن مسلمان نے زیرِ زمین ایک دنیا بسا رکھی ہے۔ اور اس موجودہ دنیا کا سارا نظم و نسق زیرِ زمین مردوں کے سپرد کر رکھا ہے

مردہ بدست زندہ

ساری دنیا "مردہ بدست زندہ" کی قائل ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک تمام زندہ انسان مردوں کے بس میں ہیں۔ یہی مردے (غوث، قطب، ابدال، اولیا وغیرہ) نظامِ عالم کے مختار کار ہیں اور محکمۂ قضا وقدر کے مالک۔ جب زندہ انسان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے۔ تو وہ ان مردوں سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔ وہ ان کے حضور جا کر روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ فریاد کرتا ہے۔ ان سے دادرسی چاہتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ مردے اس کی تقدیریں بدل دیں گے۔ غور کیجئے کہ جو انسان اپنی تقدیریں مردوں سے بدلوائیں۔ ان سے بڑھ کر موت بھی کسی اور پر طاری ہو سکتی ہے۔ فطرت انھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر آگاہ کرتی ہے کہ تمہاری کیوں مت ماری گئی ہے۔ لیکن یہ (بظاہر) زندہ (درحقیقت) ایسے مردہ ہیں کہ انھیں فطرت کی تنذیر سے بھی آگہی نہیں ہوتی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ بڑی بڑی درگاہیں

اور خانقاہیں۔ جنھیں یہ اپنے عقیدہ میں تمام قوتوں کا مرکز سمجھا کرتے تھے۔ اور اپنی تمام امیدوں کا ملجا و ماویٰ ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں کس بری طرح سے پامال ہو ئیں اور ہو رہی ہیں۔ وہ قبریں نہ صرف یہ کہ اپنے معتقد بندوں کی حفاظت نہ کر سکیں۔ بلکہ اپنے آپ کو بھی نہ بچا سکیں۔ آج ان سب درگاہوں پر ہندوؤں اور سکھوں کا قبضہ ہے۔ اور وہ انھیں جس طرح جی چاہے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر مسلمان کی آنکھ میں ذرا بھی روشنی ہوتی تو وہ دیکھتا کہ جنھیں یہ اتنی بڑی قوتوں کا مالک سمجھتا تھا۔ وہ کس قدر بے بس نکلے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نور بصیرت کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی۔ اس نے ان قبروں کے ثمنی یہاں بنانے شروع کر دیئے ہیں۔ اور اب ان کے حضور سجدہ ریزی ہونے لگ گئی ہے۔

کوئی پتھر ہو مطلب تو ہر پھوڑنے سے ہے!

نماند ناز شیریں بے خریدار!
اگر خسرو نباشد، کوہکن است

Marfat.com

انسانی ارتقاء

نظریۂ ارتقاء سے متعلق میرا مضمون (مطبوعہ طلوع اسلام بابت نومبر ۷۱ء) پڑھنے کے بعد ایک صاحب نے لکھا ہے۔

"آپ نے لکھا ہے کہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے۔ ارتقاء کا قانون یہ ہے کہ ایک علت (Cause) سے ایک معلول Effect پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلۂ علت و معلول مسلسل آگے چلا جاتا ہے۔ چونکہ انسان کی ارتقاء (بقول آپ کے) مادہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے اس سے ظاہر ہے کہ انسان میں مادی تغیرات سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں۔ یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقاء بھی مادی ہی ہونا چاہیئے۔ کیا صراط مستقیم پر چلنے کے یہی معنی ہیں؟ یعنی جس خط پر اس وقت تک ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے۔ اسی پر آگے ارتقاء ہو؟

پرویز صاحب کا جواب۔

آپ نے غالباً قانون ارتقائے طبعی کا پورا پورا مطالعہ نہیں کیا۔ اس قانون کا حاصل یہی نہیں کہ ایک علت سے اس قسم کا معلول پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ یہ قانون نظریۂ ارتقاء کے ابتدائی دور کی پیداوار ہے۔ بعد میں سائنس کی تحقیقات نے یہ بتایا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک علت Cause اپنے سلسلہ کی کتنی ہی کڑیاں پھاند کر کسی ایسے معلول Effect تک جا پہنچتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ نتیجہ بالکل انوکھا اور یکسر غیر متوقع ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا نام فجائی ارتقاء Emergent Evolution رکھا گیا ہے۔ نباتات میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے بیج سے الگ الگ قسم کے پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں اصطلاح میں Sports کہتے ہیں۔ یہ واقعہ بڑا نادر الوقوع ہوتا ہے۔ اس لئے ارباب علم و تحقیق اس قسم کے Sports کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انسانوں میں ایک فطین یا نابغہ Genius کی پیدائش اسی قسم کے Sports میں شمار کی گئی ہے۔ چنانچہ اس باب میں Hogben لکھتا ہے:۔

> بیتس سال کے گہرے تجربے نے اس امر کے لئے بین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کے خصائص اپنے آبا و اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان افراد کو Mutants !

Marfat.com

Sports کہتے ہیں۔

The Naturo Of Living Matter

اس قسم کے ارتقاء سے جو چیز وجود میں آتی ہے وہ اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سائنس کی تحقیقات نے ایسی اشیاء کی تخلیق اور وجود کا پتہ تو لگا لیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکی ہے کہ یہ ہوتا کیسے ہے؟ چنانچہ پروفیسر Taylor اس باب میں لکھتا ہے :-

ان تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے۔ ہر ممکن محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اپنے نشو و نما کے بعد یہ شے ایک ایسی خصوصیت کی حامل بن جائے۔ جو ان عناصر میں کہیں بھی موجود نہ ہوں جن سے یہ شے مرکب تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

Evolution In The Light Of Modern Knowledge

ہمارے زمانے میں اس ہنگامی ارتقاء Emergent Evolution کا سب سے بڑا امام لائیڈ مارگن ہے۔ وہ اپنی کتاب میں (جو اسی نام پر ہے) لکھتا ہے۔

Marfat.com

اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم Emergent
کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا۔ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی قسم
کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے
نئے ہوتے ہیں۔ تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق
ان کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ نئے روابط کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق وائی کونٹ سمیوئیل کہتا ہے کہ

علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں
صرف دست قدرت ظہور میں لا سکتا ہے۔

فجائی ارتقاء کا نظریہ عصر حاضر کے اہم انکشافات میں سے ہے۔ اور اس کے متعلق شرح و بسط سے لکھنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن ان مختصر سے اشارات سے اتنی بات تو واضح ہو گئی ہو گی کہ قانون ارتقاء صرف وہی نہیں جو آپ کے ذہن میں ہے اس میں "فجائی ارتقاء" بھی شامل ہے۔ جس کی رو سے

ایک نئے عنصر کا ظہور

علت و معلول میں بعض اوقات ایسے غیر متوقع عناصر ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ جن کی تخلیق کے متعلق سائنس کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیسے ظہور میں آ گئے۔ یہ عناصر سلسلہ علت و معلول کی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اس تمہید کی روشنی میں انسانی سلسلۂ تحقیق کو دیکھئے۔ پیچھے سے سلسلہ طبیعی ارتقاء چلا آ رہا ہے یعنی خلق الانسان من طین۔ انسان کی تخلیق کی ابتدا جامد مادہ سے

ہوئی) ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین (پھر یہ مختلف ارتقائی منازل کے بعد اس درجے میں پہنچا جہاں افزائش نسل بذریعہ حمل ہوتی ہے) یہاں تک عام ارتقائی قانونی کڑیاں چلی آرہی تھیں۔ اس کے بعد یکایک ایک اور منزل سامنے آجاتی ہے۔ جو گزشتہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے۔ یعنی ثم سواہ و نفخ فیہ من روحہ (پھر اس میں اعتدال پیدا کیا۔ اور اس میں خدائی قوت کا عنصر پھونک دیا) یہ بطریق فجائی ارتقاء ہوا۔ اب یہ "تو" Thou[1] کہہ کر پکارنے کے قابل ہوگیا۔ کیونکہ اس میں انسانی خصوصیات کے حامل ذرائع علم و تصور Knowledge and Imagination پیدا ہوگئے۔

وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ (اور تمہارے لئے سماعت، بصارت اور قلب بنایا)۔ یہ "ونفخ من روحہ" (خدائی قوت کا کرشمہ) وہ نیا عنصر یا نیا رابطہ ہے جو سابقہ عناصر کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جدید اور نرالا اضافہ ہے۔ یہی انسانیت کا امتیاز خصوصی ہے۔ اسی سے انسان صاحب اختیار و ارادہ بنا ہے اور اسی سے اس قابل کہ یہ مجرد زمان و مکان Abstract Time and Space کا احساس کرسکے اس کے بعد اس کی ارتقاء کا خط Line وہ نئی پٹڑی ہوگی۔ جسے "نفخ من روحہ

---

[1] اس کا تخاطب کن انسانی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے لئے Bubar کی کتاب I And Thou دیکھئے۔

نے متعین کیا ہے۔ یعنی انسان کی موجودہ سطح دو حصوں کا مرکب ہے۔ ایک خالص طبیعی ارتقاء کا نتیجہ۔ جسے اس کا طبیعی جسم کہنا چاہیے۔ اس کی نشوونما اسی قانون کے مطابق ہوگی جو حیوانی زندگی کو محیط ہے۔ دوسرا حصہ وہ جو "نفخ روح" (خدائی قوت کی تنفیخ) سے ظہور میں آیا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جسے انسان کی مضمر صلاحیتیں کہا جاتا ہے (حصہ اول یعنی جسم) درحقیقت ان صلاحیتوں کا مرکب یا ذریعہ شہود (پیکر) ہے۔ اس لئے اصل انسانیت یہی صلاحیتیں ہیں۔ اس کی مزید تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے کہ ان خصوصیات کا اہم نتیجہ انسانی ارادہ و اختیار ہے۔ اور

ارتقاء کی اگلی منزل

جسم اس اختیار و ارادہ کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ) اب اس کی ارتقاء ان صلاحیتوں کے ارتقاء کا نام ہوگا۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے۔

انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبیعی نہیں۔ بلکہ ذہنی اور نفسی ہوگی پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کرکے حیوانیت سے انسانیت کے درجے پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت پر پورا کمال حاصل کیا ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کردیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کرکے انسان کے درجے میں قدم

رکھے۔ پھر اسکی جبلی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اور اسٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے۔ کہ اپنا قدم آگے بڑھائے۔ اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ترقی کی طرف ہوگا۔

صرف ذہنی اور نفسیاتی ارتقار نہیں بلکہ ان کے ساتھ انسانی ذات Personality کا وہ ارتقار بھی۔ جو اس پر اس حقیقت کو منکشف کردے کہ زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے اس لئے ہر فرد کی اپنی صلاحیتوں کے ارتقار کا راز تمام افراد انسانیہ کی صلاحیتوں کی برومندی میں مضمر ہے (اسی کا نام ربوبیت عامہ ہے۔ جس کی طرف میں شروع سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہوں اور جو قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے) اس قسم کے جامع ارتقار کو (کسی اور موزوں اصطلاح نہ ہونے کی وجہ سے) "ارتقائے انسانیت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے قرآن نے اس کے لئے "تزکیۂ نفس"[1] کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ لیکن چونکہ تصورات عجم کی بدولت اس اصطلاح کا عام مفہوم یکسر غیر قرآنی ہو چکا ہے۔ اس لئے اس اصطلاح کو اس وقت تک استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ جب تک یہ پھر قرآنی مفہوم کی آئینہ دار

---

[1] Realisation, Growth and Development of Nafs (Self
یہ ہیں تزکیۂ نفس کے معانی)

Marfat.com

نہ بن جاتے۔ بہرحال اب انسانی ارتقار اس جدید خط پر ہوگا۔ اور چونکہ قرآن کی رو سے زندگی صرف یہی طبیعی زندگی نہیں۔ اس لئے اس ارتقار کی منازل موت کے بعد بھی طے ہوتی رہیں گی۔

قرآن کا حرکیاتی تصور

آپ نے "صراط مستقیم" سے جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ قرآن سے پہلے ذہن انسانی زندگی کی دَوری حرکت کا قائل تھا۔ جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا قرآن نے زندگی کا حرکیاتی Dynamic تصور پیش کرکے یہ بتایا کہ حیات، کسی چکر Cycle میں گردش نہیں کر رہی۔ بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا اس کی حرکت آگے بڑھنے کی Progressive ہے "صراط مستقیم" سے اس غلط فلسفۂ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال اور اس صحیح مقصودِ حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہوگیا۔ پھر چونکہ "مستقیم" میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے۔ اس لئے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ زندگی، مختلف توتوں میں توازن رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ "صراط مستقیم" پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے۔ اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو

کسی نچلے نقطے سے اوپر کے نقطے کی طرف جائے لترکبن طبقاً عن طبق (۸۴/۱۹) تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے چلے جاؤ۔ اس نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ "صراط مستقیم" تمہارے اس نشو ونما دینے والے (رب) کی راہ (قانون) ہے۔ جو "ذی معارج" (۷۰/۳) ہے یعنی "سیڑھیوں والا خدا" سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف لے جانے کا ذریعہ بھی۔ گھسٹتے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ابھرتے ہوئے (jump کرتے ہوئے) اوپر چڑھنے کا ذریعہ۔ یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اقطار السموٰت والارض (۵۵/۳۳) یعنی موجودہ زمان و مکان کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ ارتقاء اس نظام ربوبیت کے بغیر ناممکن ہے۔ جو قرآن کی رو سے قائم ہوتا ہے۔ اس نظام انسانی میں معاشرہ انہی خطوط پر متشکل ہو جاتا ہے۔ جن خطوط پر خارجی کائنات خدائی قوانین کے سامنے طوعاً و کرہاً سجدہ ریز اپنی ارتقائی منازل طے کئے چلی جا رہی ہے۔ یعنی خارجی کائنات طوعاً و کرہاً مشیت کے پروگرام کو پورا کر رہی ہے۔ لیکن انسان اپنی دنیا میں اپنے اختیار و ارادہ سے اس پروگرام کو پورا کرتا ہے۔ اسی طرح خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک عظیم القدر پروگرام کی تکمیل میں ایک دوسرے کے رفیق۔

بقول علامہ اقبالؒ

اس ارتقائی تبدیلی کے طرق و مناہج میں خدا خود بندے کا رفیق بن جاتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس باب میں پہل کرے۔ ان اللہ لا یغیر

ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم ۔ لیکن اگر وہ اس باب میں
پہل نہیں کرتا۔ اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔
اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا۔ تو
اس کی روح پتھر کی قساوت اختیار کر لیتی ہے اور (وہ انسان نہیں
رہتا بلکہ) جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (تشکیل جدید)

Hansdriesh پنزنگ یونیورسٹی کا پروفیسر ہنس ڈریش
اس مقام کے متعلق کہتا ہے کہ وہاں پہونچکر "ہم اپنے آپ کو خدا کے سپاہی کہہ سکتے ہیں"
قرآن اس جماعت کو "حزب اللہ" کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ "حزب اللہ" وہ معاشرہ
ہے۔ جو قرآنی نظام ربوبیت کی رو سے متشکل ہوتا ہے۔

قوتِ فیصلہ

جس چیز کا نام ہم نے "نفخ روح خداوندی" کا نتیجہ رکھا ہے۔ ذرا غور
کیجیے کہ اس کی خصوصیات کبریٰ کیا ہیں؟ قرآن نے اس تخلیقی ارتقاء
کے بعد فرمایا ہے کہ پھر انسان کو سماعت و بصارت اور فواد مل گئے ہیں۔ سماعت اور
بصارت وغیرہ حواس۔ خارجی دنیا کی معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ معلومات
انسان کی داخلی دنیا میں ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہیں۔ جہاں سے مختلف امور کے فیصلے ہوتے
ہیں۔ "فیصلہ کرنے" کا نام اختیار و ارادہ ہے۔ حیوانات کی نقل و حرکت ان کے جبلی تقاضوں
Instinot کی رو سے ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے سامنے بیک وقت
ایک سے زیادہ ممکنات Possibilities آتے ہیں۔ ان ممکنات

Marfat.com

میں سے وہ صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس انتخاب کو فیصلہ کہتے ہیں۔ اور یہ فیصلہ اختیار وارادہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذ "فؤاد" کا کام انسانی اختیار و ارادہ کا استعمال ہے۔ یہی بنیادی خصوصیت ہے۔ جو انسان کو حاصل ہے

انسانی جسم کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ خارجی دنیا کی معلومات حاصل کر کے "اندر" پہونچاتا ہے اور پھر "اندر" سے جو فیصلہ صادر ہو اس پر عمل کرے۔ اس کے برعکس حیوانی سطح کی زندگی میں تمام تقاضے انسانی جسم کے ہوتے ہیں۔ (جنھیں خواہشات کہا جاتا ہے)۔ اور "اندر" کے فیصلہ کو وہاں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اب دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک حیوانی سطح کی زندگی۔ جس میں جسم کے تقاضے جبلی طور پر Instinctively پورے ہوتے رہیں اور انسانی اختیار و ارادے کو اس میں کچھ دخل نہ ہو۔ دوسرے انسانی سطح کی زندگی جس میں اصل شے انسانی فیصلہ ہو۔ اور جسم اس فیصلہ کرنے والی قوت کے لئے آلہ اور ذریعہ کا کام دے۔ اس اعتبار سے انسانی معاشرے کی تین قسمیں ہو جائینگی۔

(۱) جس میں نہ جسم کے تقاضے پورے ہوں۔ نہ قوتِ فیصلہ کے استعمال کے مواقع۔ یہ زندگی انسانی سطح تو ایک طرف۔ حیوانی سطح سے بھی گئی گذری ہوتی ہے۔

۲۔ جس میں انسانی جسم کے تقاضے تو پورے ہوتے رہیں۔ لیکن نفس انسانی (اختیار و ارادہ) کی تربیت و پرورش کا سامان نہ ہو۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہو گی۔

اور (۳) جس میں جسم انسانی کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں۔ اور اس کے ساتھ

ہی انسانی اختیارات کی وسعتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ انسانی زندگی کی سطح ہوگی۔ قرآن یہی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس میں ہر وہ عمل جو انسانی اختیار کو وسعت وتقویت بخشتا ہے۔ عمل خیر کہلاتا ہے (خیر اور اختیار کا مادہ ایک ہی ہے) لیکن چونکہ اختیار وارادہ تخریبی مقاصد کے لئے بھی صرف ہو سکتا ہے اور تعمیری کے لئے بھی۔ اس لئے وہ اختیار وارادہ کے استعمال کے لئے ایک روشنی، ایک میزان، ایک معیار بھی دیتا ہے تاکہ ہر معاشرہ کا ہر اختیار تعمیری نتائج کا حامل ہو۔ تخریبی کا نہ ہو۔ یہ میزان ضابطۂ آئین خداوندی (قرآن) ہے۔

قرآنی معاشرہ

لہذا جس معاشرے میں۔

(ا) انسانی جسم کے تقاضے بطریق احسن پورے ہوتے رہیں۔

(ب) انسانی اختیارات کے حدود وسیع سے وسیع ہوتے رہیں اور

(ج) انسانی اختیارات کا استعمال وحی کی روشنی میں ہو۔

وہ قرآنی معاشرہ یا مسلمان کی زندگی ہے۔ اس معاشرے میں انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کرکے آگے بڑھے گی۔ اس میں تمام خارجی دنیا کی تسخیر ہوگی۔ (وسخر لکم ما فی السموٰت والارض جمیعاً) اور چونکہ انسانی جسم بھی خارجی (طبیعی) دنیا سے متعلق ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی تسخیر ہوگی۔ یعنی جسم کا کام انسانی قوت فیصلہ (نفس) کے لئے معلومات فراہم کرنا۔ اور اس کے فیصلوں کو جاری رکھنا ہوگا۔ اس قوت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائیگی۔ اسی قدر انسانی زندگی ابدیت

Immortality سے ہمکنار ہوتی جائیگی۔ جب جسمانی نظام طبعی قانون کے تحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں)۔ تو اس پختگی اور وسعت یافتہ قوت (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے۔ اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔

اس قوت کی پختگی اور وسعت صرف اس نظام میں ہو سکتی ہے۔ جسے نظام ربوبیت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں ہر فرد اپنی محنت کے ماحصل کو اپنے اختیار وارادہ سے دوسروں کی پرورش اور تربیت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اس سے اس کے اختیارات کی وسعتیں زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی جسم کے تقاضوں کے پورا کرنے کا انتظام از خود موجود ہے۔ اس نظام میں یہی ہوتا ہے۔ ہر فرد کی تمام بنیادی ضروریات (جسم کے تقاضوں) کے پورا کرنے کا ذمہ نظام اپنے سر لے لیتا ہے۔ اور افراد اس فکر سے آزاد ہو کر اپنی محنتوں کے ماحصل کو پورے کے پورے معاشرے کی تعمیر و تربیت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہ ہے۔ وہ معاشرہ (حزب اللہ) جس کی کھیتی پکتی ہے (ھم المفلحون) جس کے درخت برگ و بار لاتے ہیں۔ یہی ہیں۔ وہ جو سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزلوں میں پہونچنے کے اہل ہوتے ہیں۔

نظام ربوبیت

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ نہ تو انسان۔ خالص طبیعی ارتقاء کی آخری کڑی ہے (بلکہ اس کی "انسانیت" طبعی ارتقاء کے سلسلہ علت و معلول سے الگ ہے) اور نہ ہی اس کا مزید ارتقاء طبیعی ہو گا۔ طبیعی ارتقاء کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے

اس میں جوہر انسانیت غیر طبیعی ہے۔ جسم انسانی اس جوہر انسانیت کے فیصلوں کے لئے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ اور ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا آلہ یا واسطہ ہے۔ اس کے بعد مزید ارتقاء جسمانی نہیں بلکہ اس غیر طبیعی جوہر انسانیت کا ہوگا جسے ہم موت کہتے ہیں وہ درحقیقت جوہر انسانیت کا جسم کے آسرے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہر انسانیت (انسانی اختیار و ارادہ) کی نشوونما ارتقاء قرآنی نظام ربوبیت سے ہوتی ہے۔ زندہ وہ ہے جس کے اختیار و ارادے کی قوتیں (قرآنی روشنی میں) تمام خارجی کائنات کو (جس میں خود اس کا جسم بھی شامل ہے) مسخر کئے جاتی ہیں۔ نہ کہ وہ جس کے جسم کی طبیعی مشینری چل رہی ہے۔ جو اس طرح زندہ ہے۔ وہ موت سے نہیں مر سکتا۔ اسی کا نام سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل طے کرنا ہے۔

سوچئے کہ ہم میں آج کتنے زندہ ہیں؟

(س) آدم

ایک اور صاحب لکھتے ہیں۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے انسان سلسلۂ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا اس شکل میں آیا ہے۔ اس صورت میں آدم سے کیا مراد ہوگی۔ کیونکہ ابھی تک تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ ہم سب بابا آدم اور اماں حوا کی اولاد ہیں۔ یعنی انسان کے ایک جوڑے سے ساری نسل آگے چلی ہے۔

Marfat.com

جواب۔

آدم کے متعلق میں تفصیل سے معارف القرآن کی دوسری جلد میں لکھ چکا ہوں وہاں سے معلوم ہوگا کہ قرآن کے بیان فرمودہ قصۂ آدم میں آدم سے مراد کوئی خاص فرد نہیں ہے. بلکہ اس سے مراد نوعِ انسانی کا نمائندہ Representative of Mankind ہے اور وہ قصہ کسی ایک شخص کی سرگزشت نہیں. بلکہ انسانی زندگی کے تجربات وکیفیات کی تمثیلی داستان ہے۔ (تفصیل محولہ بالا کتاب میں ملے گی)

Marfat.com

قومی ملکیت

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ طلوع اسلام اس نظریہ کا داعی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اسلامی معاشرہ کی مکمل شکل اس وقت وجود میں آتی ہے۔ جب زمین اور دیگر ذرائع پیداوار اجتماعی نظام کی تحویل میں دیدیئے جائیں اور وہ تمام افراد مملکت کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ اس کے برعکس سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اپنی کتاب مسئلہ ملکیت زمین میں اس نظریہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ۔ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف

Marfat.com

اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جاسکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریہ تمدن واجتماع سرے سے اس تخیل کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمراں گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جوان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انھیں ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جاتے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمین پر قبضہ نہ کیا جائے پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا ورغبت خرید لے۔ تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیات شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو۔ مگر کلیات شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدل اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے۔ نہ کہ

Marfat.com

اسلامی تصور۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔

یعنی ان کے نزدیک اس طریق سے ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ ہم حیران ہیں کہ ہم اسے کیا سمجھیں کیا آپ براہ کرم اس پر روشنی ڈالیں گے؟

جواب۔

ہم نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ مودودی صاحب کے حواریوں میں سے ایک مر... ایک صاحب نے ان کی شان میں یہ فرمایا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دس کروڑ مسلمانوں میں تنہا پاتے ہیں۔ لہٰذا جس کی پوزیشن یہ ہو وہ اگر ہر اس نظام اور نظریہ کو جو ان کی مصلحت کوشیوں سے ٹکراتا ہو سب سے بڑا انسانیت کش شیطانی نظام قرار دیں تو اس سے کم اور کیا کہیں۔ مودودی صاحب کی تکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو ال... کے گورکھ دھندے میں الجھاتے چلے جاتے ہیں۔ آپ ان کی کتابوں کو دیکھئے۔ بات سیدھے سادے طور پر ایک صفحے میں کہی جا سکتی ہے۔ وہ اس کے متعلق بیسیوں صفحات لکھتے چلے جائیں گے۔ اور پھر بھی بات صاف نہیں ہونے پاتے گی۔ اور...

بیس صفحات ہیں وہ بڑے بڑے ائمہ اور ان کی بڑی بڑی تصانیف کا ذکر بار بار کرتے چلے جائیں گے۔ تاکہ عام نوجوان طبقہ اس سے مرعوب ہو جائے۔ قومی ملکیت کے مسئلہ پر جو کچھ طلوع اسلام میں آیا ہے۔ اس کے متعلق قرآنی دلائل دیئے گئے تھے۔ مودودی صاحب نے اپنے اس فتویٰ میں کسی قرآنی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں سمجھی۔ باقی رہی ان کی وہ ادیبانہ دلیل۔ جو انہوں نے اس اقتباس میں پیش کی ہے۔ سو وہ تلبیس حق و باطل کی ایک بڑی دلچسپ مثال ہے۔ سوال پیش نظریہ تھا کہ اسلامی نظام معاشرت و تمدن میں ذرائع پیداوار مرکزی تحویل میں دیئے جائیں گے یا افراد کے پاس رکھے جائیں گے۔ یہ حقیقت واضح ہے اور خود مودودی صاحب اور ان کی جماعت آج تک یہی پکارتی چلی آ رہی ہے کہ اسلام کے نظام حکومت میں نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو نہایت متدین متشرع، متقی، پرہیزگار، خداترس یعنی بہمہ وجوہ خدا اور رسول کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے۔ اور وہ حکومت کو علیٰ منہاج نبوت و منہاج خلافت راشدہ قائم کریں گے۔ اب مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی نظام حکومت میں ذرائع پیداوار کو نظام کی تحویل میں دیدیا جائے تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمراں گروہ کی غلام بنکر رہ جائیگی جو ان ذرائع پر متصرف ہوگا۔ جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون ساری کی طاقتیں ہوں گی انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانداری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہو جائے گا۔ جس سے بڑھ کر

Marfat.com

انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ گویا مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی نظام حکومت میں ــــــ

(۱) پورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر حکمراں گروہ کے ہاتھ میں آجائے گا

(۲) ملت اس حکمران گروہ کی غلام ہوگی

(۳) اس حکمراں گروہ کے ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی جو وہ دوسروں کو غلام بنانے کے لئے استعمال کر سکیں گے

لہذا

(۴) سوداگری کارخنداری اور زمینداری بھی سمٹ کر انہی کے ہاتھوں میں آگئی تو اس شیطانی نظام کے ہاتھوں انسانیت ذبح ہو جائے گی۔

اگر اسلامی نظام حکومت کے ارباب حل و عقد کی بھی یہی حالت ہوگی کہ اگر ان کے ہاتھ میں رزق کے سرچشمے چلے گئے۔ تو وہ انسانیت کا گلا گھونٹ دیں گے۔ تو فرمایئے کہ ایک فرعونی نظام اور ایک اسلامی نظام میں پھر فرق کیا ہوگا؟ اگر حالت یہی ہونی ہے تو پھر اس اسلامی نظام میں کیا خوبیاں ہیں جن کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کی ہر کوشش کا نام جہاد رکھا جاتا ہے؟ اگر اسلامی نظام میں بھی بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کا محکوم بننا ہے۔ اگر اس میں بھی پولیس، فوج، عدالت اور قانون سازی کی طاقتوں نے حکمراں گروہ کے مفاد ہی کا تحفظ کرنا ہے۔ اگر انھوں نے بھی ذرائع پیداوار پر سانپ بنکر بیٹھ جانا ہے۔ تو پھر موجودہ نظاموں میں کونسی خ

ہے کہ اس نظام میں نہیں ہوگی۔ پھر یہ اتنا بڑا دھوکہ دنیا کو کیوں دیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات انسان کی زبان اور قلم سے غیر شعوری طور پر ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو اس کے قلبی پس منظر کی صحیح صحیح ترجمانی کر دیتی ہیں۔ مودودی صاحب اور ان کی جماعت زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے اور اس کا نام اسلامی نظام حکومت کا قیام قرار دیتی ہے۔ چونکہ ان کی اس آرزو کا جذبہ محرکہ بھی وہی ہے جو دوسرے ہوس پرستوں کا ہوتا ہے اس لئے ان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقشہ بھی وہی ہوتا ہے جو ہر لیڈروں کی جماعت کا ہوا کرتا ہے۔

یہ ہے وہ دلیل جس کی بنا پر مودودی صاحب نے قومی ملکیت کو شیطانی نظام قرار دیا ہے۔ یعنی بات اسلامی نظام کی ہو رہی ہے اور اس مسئلہ کے خلاف خرابیاں وہ گنا رہے ہیں جن کا موجودہ غیر اسلامی نظام حکومت میں پیدا ہو جانے کا احتمال ہے ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے شام اور عراق اور دیگر مفتوح ممالک کی زمینوں کے متعلق یہ انتظام فرمایا تھا کہ انھیں افراد میں تقسیم کرنے کی بجائے تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے اور اس کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے تیا بتا نظام حکومت کرے تو کیا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) شیطان کی ایجاد تھا؟ اور کیا اس انتظام سے وہ تمام خرابیاں رونما ہو گئی تھیں جنھیں مودودی صاحب اس نظام کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔!

Marfat.com

اس تصور کے خلاف کہ زمین افراد کی ملکیت نہ ہو بلکہ قوم یا اسٹیٹ کی ملکیت ہو مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "مسئلہ ملکیت زمین" میں ایک عجیب طنزیہ تنقید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

آج کل کے اشتراکیت زدہ مجتہدین نے قرآن سے ایک اور نقطہ یوں نکالا ہے۔ "الارض للہ" اور انھوں نے اس پر قیاسات کا ایک پورا کریملن تعمیر کر ڈالا ہے۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں:۔

اس طرح کی من مانی تاویلیں کرنے پر کوئی اتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہدیا ہے کہ للہ ما فی السموٰت وما فی الارض (آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے)

قطع نظر اس کے کہ الارض للہ زمین کی تلی ملکیت کی تائید میں کوئی اہم دلیل بن سکتی ہے یا نہیں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب ایک ہی قسم کی آیات سے ایک مفہوم اپنے مطلب کے مطابق لیتے ہیں اور اسی قسم کی دوسری آیات کا مفہوم جب ان کی مصلحت کے خلاف جاتا ہے تو اسے مردود قرار دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اسلامی جماعت کے تمام دعاوی کا مدار اس اصولی دعوے پر ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کے لئے ہے۔ کسی فرد کو حق حکومت حاصل نہیں۔ اور "خدا کی حکومت

سے ان کی مراد یہ ہے کہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو (بقول ان کے) خدا کی نیابت کے طور پر اس کی منشا کے مطابق حکومت چلائیں۔ اس دعوے کی بنیاد الحکم للہ (ان الحکم الا للہ) ہے۔ یعنی "خدا کی حکومت" اب ذرا سوچئے کہ مودودی صاحب نے الحکم للہ سے قیاسات کا یہ سارا کرملین اپنے حق میں تعمیر کر لیا کہ حکومت کا حق افراد کو نہیں پہونچتا بلکہ اس کا حق ملت کو پہونچتا ہے جو منشائے خداوندی کے مطابق حکومت چلائے۔ یعنی ان کے نزدیک الحکم للہ سے یہ قیاس بالکل منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص الارض للہ سے بعینہ اس قسم کا مفہوم لے یعنی وہ کہے کہ زمین پر افراد کو ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ملت کی ملکیت ہے۔ اور ملت ہی کو حق پہونچتا ہے کہ وہ منشائے خداوندی کے مطابق اس کا انتظام کرے۔ تو مودودی صاحب کے نزدیک یہ "من مانی تاویل" بن جاتی ہے۔ یعنی الحکم للہ کی وہی تاویل عین قرآنی ہے۔ اور الارض للہ کی اس قسم کی تاویل من مانی ہے۔ الارض للہ کے خلاف مودودی صاحب کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں تو یہ بھی آیا ہے کہ للہ ما فی السموٰت وما فی الارض لیکن ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح سے الحکم للہ کے ضمن میں بھی تو قرآن میں یہ آیا ہے۔ کہ ملکوت کل شئی خدا کے لئے ہے اور ملکوت السموٰت والارض اسی کے لئے ہے۔

یعنی مودودی صاحب چونکہ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں، اس لئے الحکم للہ کی تفسیر اس امر کی تائید کرتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ اپنے حامیوں کی زمینداریاں

Marfat.com

اور جاگیرداریاں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے الارض للہ کی اسی قسم کی تفسیر انھیں من مانی دکھائی دیتی ہے۔

یہ ہے نمونہ ان لوگوں کا جو اس طرح نیزوں پر قرآن لٹکا کر میدان سیاست میں آرہے ہیں کہ

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد

مودودی صاحب نے بڑے طعن آمیز انداز میں فرمایا ہے کہ اس طرح تو مرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ جو کچھ زمین آسمان میں ہے، اللہ کا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ میاں بیٹھے بیٹھے یونہی شاعری کرتے رہتے ہیں اس لئے جو کچھ وہ کہتے ہیں، اسے سچ مچ نہیں سمجھ لینا چاہیئے انھیں کون سمجھائے کہ قرآن میں اللہ نے شاعری نہیں کی ہے۔ جو کچھ کہا ہے سچ مچ ٹھیک کہا ہے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق قائم کردہ نظام میں "افراد کی ملکیت" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں افراد کا فریضۂ زندگی نوعِ انسانی کی ربوبیت (نشو ونما) ہوتا ہے۔ چونکہ نوعِ انسانی میں وہ خود بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں ان کی اپنی ربوبیت بھی شامل ہوتی ہے۔ ان کی ربوبیت کے لئے کچھ چیزیں ان کے تصرف میں بھی دیدی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس آئین و ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جو نوعِ انسانی کی ربوبیت عامہ کے اصولِ کلی کی روشنی میں مدون کئے جاتے ہیں۔ یہ ایک بالکل نیا تصور تھا۔ جو قرآن نے مملکتی نظام کے ضمن میں پیش کیا۔ درحقیقت

مملکتی نظام میں معدلت گستری زیادہ سے زیادہ اسی کو سمجھا جاتا تھا کہ مملکت ایک ایسا انتظام کرے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی ملکیت کو غصب نہ کرنے پائے۔ یعنی مملکت کا کام افراد کے حقِ ملکیت کا تحفظ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ تصور پیش کیا کہ مملکت کا کام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا انتظام کرنا ہے اور اس کے لئے ایسا نظم و نسق قائم کرنا ہے کہ کوئی فرد کسی دوسرے کے سامانِ ربوبیت کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے بلکہ اس ربوبیت عامہ کا ذریعہ بنے۔ یہ تھا وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا تھا۔ اور جو دنیا کے ہر قسم کے نظام سرمایہ داری کے خلاف اعلان جنگ تھا مسلمانوں کے دورِ ملوکیت نے اس تصور کو الٹ کر پھر وہی پرانا سرمایہ دارانہ تصور قائم کردیا اور یہی وہ دورِ ملوکیت کا تصور ہے جسے مذہب پرست طبقہ (جس میں جماعت اسلامی پیش پیش ہے) علاوہ نافذ کرنا چاہتا ہے۔ خدا مسلمانوں کو اس لعنت سے محفوظ رکھے۔

(س) **انتظام یوسفی** ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ جب مصر میں قحط پڑا۔ تو حضرت یوسف نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی کہ آپ اس مقصد کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائے تھے۔ کیا اس کی تفصیل کہیں سے مل سکتی ہے!

جواب۔

Marfat.com

قرآن میں تو اتنا ہی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ اس مقصد کے لئے شعبۂ مالیات (منسٹری آف فنانس) میری تحویل میں دیدو اس لئے کہ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ روپے کو کس طرح حفاظت سے رکھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ اس کا بہترین مصرف کیا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے ملک کی غلہ کی گرانی کو دور کرنے کے لئے کیا طریق عمل اختیار کیا اس کی تفصیل تورات میں ملتی ہے۔ چنانچہ کتاب پیدائش باب ۴۷ میں اس تفصیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لئے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی اس غلہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا۔ جمع کی۔ اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی۔ تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوتے کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چُک گئی یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چُک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے تمہیں دوں گا۔ وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کنے لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں۔ اور اس نے ان کے سب

چوپایوں کے بدلے میں انھیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گزر گیا وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد خرچ ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہماری چوپاؤں کے گلے بھی لے لیے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے۔ اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے۔ اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لئے مول لی۔ کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو نپٹ تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ سب لوگ سو اس نے انھیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی۔ کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انھیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسف نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لئے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لئے ہے۔ کھیت میں بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ

فرعون کو دو گے۔ اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو اور تمہاری خوراک
اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لئے
ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں۔ ہم اپنے خداوند کی نظر
میں مورد رحم ہوں۔ اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے۔ اور یوسفؑ
نے ساری مصر کی زمین کے لئے یہ آئین جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ
فرعون پانچواں حصہ لے گا۔ مگر صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب بغلت مرض پر غور کیا تو انھوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئی۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا اور انھیں آسانیاں بہم پہونچا دیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشتکار اپنی محنت کے ماحصل کے آپ مالک تھے۔ صرف پیدائش کا پانچواں حصّہ حکومت کو دینا پڑتا تھا تاکہ اس سے مملکت کا نظام چل سکے۔ اب زمیندار کاشت کار کی محنت کے ماحصل میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح سے حضرت یوسفؑ نے ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا۔ جو دبلی گایوں کو کھائے جا رہی تھیں۔

Marfat.com

(س) انفرادی مفاد پرستی

کراچی سے ایک طالب علم کا سوال ہے۔
کیا قرآنی نظام میں انفرادی مفاد
Individual Enterprise
کی گنجائش ہوگی؟

جواب۔

"انفرادی مفاد" سے مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص ذاتی سرمایہ لگا کر کوئی کاروبار کرے اور اس کاروبار کے منافع کا مالک سمجھا جائے۔ اس سوال کے جواب کے لئے "روپیہ" کے متعلق قرآن کا نظریہ سامنے رکھیئے بات خود بخود صاف ہو جائے گی۔

قرآن کی رو سے

(الف) زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ اس لئے فاضلہ روپے سے زمین نہیں خریدی جا سکتی۔

(ب) جب زمین نہیں خریدی جا سکتی تو ظاہر ہے جائیداد کی غرض سے بھی مکانات نہیں بنائے جا سکتے۔ قرآن کی رو سے معاشرہ پر لازم ہے کہ وہ تمام افراد کے لئے سکنی مکانات مہیا کرے۔ اس لحاظ سے بھی مکانات کرایہ پر دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(ج) روپیہ کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قرآن کی رو سے چاندی اور سونے کا اکتناز منع ہے۔ اور دولت جمع کر کے گنتے رہنے والوں کے لئے بڑی تہدید آئی ہے۔

(د) کوئی شخص بلا ضرورت روپیہ خرچ نہیں کر سکتا اسے تبذیر کہتے ہیں۔ جس کی قرآن

Marfat.com

میں سخت ممانعت ہے۔

(۱۷) نہ ہی کوئی شخص ضرورت سے زیادہ خرچ کر سکتا ہے۔ اسے اسراف کہتے ہیں اور قرآن کی رو سے اسراف بھی منع ہے۔

اب فرمایئے کہ ایک شخص ذاتی کاروبار سے منافع حاصل کر کے اس روپیہ کو کرے گا کیا۔ وہ روپیہ تو اس کے لئے وبال جان ہو جائے گا۔ اس کے پاس اس روپیہ کو رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ وہ نہ تو اسے جمع رکھ سکے گا۔ نہ خرچ کر سکے گا۔

اندریں حالات قرآنی نظام میں Individual Enterprise کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی ذاتی ملکیت کا تصور اس دور کا پیدا کردہ ہے جب مسلمانوں میں ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری آچکی تھی۔ اگرچہ اس دور کے مفاد پرستانہ استبداد نے عہد رسالت مآب کے صحیح واقعات ہم تک پہونچنے نہیں دیئے لیکن پھر بھی کہیں کہیں ایسی کرن نظر آجاتی ہے کہ اس دور میں روپیہ پاس رکھنے کا تصور تک بھی نہیں آتا تھا۔ خود رسول اللہ صلعم کے متعلق اس قسم کے واقعات تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں کہ آپ کے پاس جو کچھ آتا تھا۔ آپ اسے رات سے پہلے پہلے تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وفات سے چند لمحات پہلے آپ نے حضرت عائشہ رض سے پوچھ لیا کہ گھر میں کوئی روپیہ تو نہیں رکھا۔ جو چند درہم موجود تھے جب تک انھیں بھی ضرورت عامہ کے لئے نہیں دیدیا اطمینان نہیں ہوا۔ کتب تاریخ میں حضور کا یہ ارشاد بھی باقی رہ گیا ہے کہ انبیاء کی جماعت کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑا کرتی یعنی ان

Marfat.com

کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ ربوبیت عامہ کے لئے وقف ہوتا ہے۔ ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں کتب روایات میں موجود ہیں لیکن ہمارا مُلا رسول اللہ کی اس سنت کی طرف کبھی توجہ نہیں دلاتا۔ وہ صرف یہی بتاتا ہے کہ میٹھا کھانا سنت ہے یا اس قسم کی روایات بیان کرتا ہے کہ حضرت عثمان کے پاس اتنے لاکھ دینار تھے، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس مال و متاع کے لدے ہوتے اتنے اونٹ تھے ایسا بیان کرنے میں وہ کبھی نہیں سوچتا کہ ایک طرف تو صحابہ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے (اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ رسول اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے (جو رنگ درحقیقت قرآن کا رنگ ہے) اور دوسری طرف وہ یہ بتاتا ہے کہ روپے پیسے کے معاملہ میں رسول اللہ کا عمل وہ تھا اور ان صحابہ کا عمل یہ۔ ہمارے نزدیک رسول اللہ اور آپ کے صحابہؓ کے عمل کے پرکھنے کا صحیح معیار قرآن ہے۔ کتب روایات میں ان بزرگوں کی طرف جس قدر ایسے واقعات منسوب کئے گئے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ وہ سب وضعی ہیں اور اس ملوکیت اور سرمایہ داری کے دور کی پیداوار ہیں جسے اپنی زراندوزی اور جاگیرداری کے نظام کے لئے اس قسم کی سندات کی ضرورت تھی۔

(س) مہاجرین کا مسئلہ

طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (جون ۱۹۵۰ء) میں مہاجرین کے مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا۔ اس کے متعلق ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

Marfat.com

ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ جس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے کسی حساس قلب کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے اس ضمن میں مشورہ دیا ہے کہ

(۱) ہندوستان کے مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں بسنا ہے۔ تو اس کی صورت یہ ہے کہ ان قومی رہنماؤں کو ہندوستان واپس بھیجا جائے۔ جو وہاں کے مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر یہاں آ بیٹھے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان بااثر لوگوں کے وہاں چلے جانے کے بعد وہاں کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھ جائے گی۔ لیکن یہ توقع کرنا کہ یہ لوگ یہاں کی آسائشیں چھوڑ کر وہاں کی ذمہ داریاں اپنے سر لینے کے لئے ہندوستان واپس چلے جائیں گے ایک خیال خام ہے۔ اگر انھیں اپنی ذمہ داریوں کا ایسا ہی احساس ہوتا تو یہ ہندوستان چھوڑتے ہی کیوں؟ اس لئے یہ علاج ناقابل عمل رہے گا

(۲) دوسرا علاج آپ نے یہ بتایا ہے کہ اگر یہاں کے قائدین وہاں جانے پر آمادہ نہ ہوں۔ تو پھر وہاں کے مسلمانوں پر پاکستان کے دروازے بند نہ کئے جائیں۔ تاکہ وہ اور سب کچھ لٹا کر کم از کم اپنی جان اور آبرو کی حفاظت تو کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان میں بے بسی اور بیچارگی کے عالم میں چھوڑ دینا ان

Marfat.com

پر انتہائی ظلم ہے۔ لیکن پاکستان میں اتنی سکت کہاں ہے کہ وہ اس قدر کثیر آبادی کو اپنے یہاں آباد کرلے گا۔ اس لئے یہ طریق علاج بھی ناقابل عمل دکھائی دیتا ہے۔

اندریں حالات ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرلیا جائے اور اس کے بعد اس مشکل کا کوئی ایسا حل تجویز کیا جائے جو موثر بھی ہو اور قابل عمل بھی۔

جواب۔

ہم نے مہاجرین کے مسئلہ کے متعلق ماہ جون کی اشاعت میں جو کچھ لکھا تھا۔ وہ درحقیقت صورتِ حالات کا منطقی تجزیہ تھا اس معاہدہ کی روشنی میں جو اقلیتوں کے تحفظ سے متعلق بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان طے پایا ہے۔ ورنہ جہاں تک ہمارا ذاتی خیال ہے ہم اس سے پہلے کئی بار دہرا چکے ہیں اور اب بھی اسی خیال پر قائم ہیں کہ ہمیں فی الواقعہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا کوئی حل تلاش کرنا ہے تو وہ اول و آخر تبادلۂ آبادی کی ہی صورت میں ہوسکیگا۔ اس کے سوائے کوئی دوسری صورت اس مشکل کا حل پیش نہ کرسکیگی۔ ہم اشیاء کا مسئلہ کاغذی معاہدوں سے حل کرسکتے ہیں لیکن انسانوں کا معاملہ قلبی معاہدوں کے بغیر نہ کبھی طے پایا ہے اور نہ طے پائے گا۔ قلوب کی تعمیر کسی قوم کے فلسفۂ زندگی سے متشکل ہوتی ہے۔ ہندو قوم کا فلسفۂ زندگی ہمارے سامنے ہے۔ وہ اپنے ہاں کے چار درنوں کے باہر کسی کو انسان تسلیم

نہیں کرتی جتنے کہ خود ان کے ورنوں میں بھی سے کم از کم ایک ورن کے اندر انسانیت کی ذلت اور نفرت کے تمام امکانی تصورات جمع ہیں۔ اونچے ورن کا ہندو ان کے چھونے سے ہی نہیں بلکہ ان کے سایہ تک سے بھی بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ اس تعلیم کی روشنی میں غیر ہندو سے نفرت اور لہذا عداوت ایک کھلا ہوا منطقی نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کے خلاف یہی وہ جذبۂ نفرت تھا جسے انھوں نے تاریخی افسانوں سے ہوا دی اور ہر ہندو کے دل میں علیٰ قدر حوصلہ انتقام کی آگ بھڑکا دی گئی۔ اسی آگ کے شعلوں کی لپیٹ ہے جس سے بھارت ورت کی چار دیواری میں مسلمانوں کے لئے زندگی جہنم بن رہی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے ارباب حکومت سیاسی مصالح کی پیش نظر مسلمانوں کے تحفظ کا یقین دلاتے رہیں اور اس کی توثیق معاہدات سے بھی کر دیں لیکن وہاں کے مسلمانوں کو ان ارباب حکومت کی کوٹھیوں میں زندگی بسر نہیں کرنی۔ انھیں وہاں کی ہندو جاتی میں زندگی گزارنی ہے۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ وہاں کے ارباب حکومت ہر مسلمان کے ساتھ ایک ایک باڈی گارڈ مقرر کر دیں گے اور جو ان کے جان، وہاں اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتا رہیگا۔ اور اگر غور سے دیکھئے تو باڈی گارڈ بھی کسی کی کہاں تک حفاظت کر سکتے ہیں حکومت کے انتظامات جاتی کے ہاتھوں مہاتما گاندھی جیسی شخصیت کی حفاظت نہ کر سکے۔ تو کیا وہ انتظامات وہاں کے چار کروڑ مسلمانوں کی فی الواقعہ حفاظت کر سکیں گے؟ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

ہندوؤں کا پروگرام بالکل واضح ہے اور جن لوگوں نے تقسیم ہند سے کچھ

عرصہ پہلے مہاتما گاندھی کی ان تقریروں کو غور سے سنا تھا۔ جو وہ دہلی سے نشر کیا کرتے تھے وہ اس کی تائید کریں گے کہ ہندوؤں کے پیش نظر شروع ہی سے یہ منصوبہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان جو بالعموم تعلیمیافتہ ہونے کی وجہ سے اپنے جداگانہ قومی تشخص (یعنی مسلمان ہونے) کا عقیدہ محکم طور پر رکھتے تھے۔ انھیں یا تو تہ تیغ کردیا جائے یا پاکستان جانے پر مجبور باقی رہے دیہاتی مسلمان تو وہ ایک آدھ نسل کے بعد خود بخود ہندوؤں میں جذب ہوجائینگے ان حالات کے تحت یہ سمجھنا کہ ہندوستان کا مسلمان وہاں بحیثیت مسلمان زندہ اور باقی رہ سکیگا۔ خود فریبی سے کم نہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ کا حل سوائے تبادلۂ آبادی کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔

اگر تقسیم ہند معتدل حالات کے ماتحت وجود میں آتی۔ تو اس مسئلہ کا حل اسی وقت کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت ملک کی تقسیم کا معیار اس وقت کی اکثریت کے علاقے قرار نہ پاتے بلکہ اس کی جگہ ہوتا یہ کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے غیر مسلموں اور ہندو اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں سے کہدیا جاتا کہ جس کا جی چاہے وہ ایک معینہ مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اپنی اکثریت کے علاقوں کی طرف منتقل ہوسکتا ہے۔ انتقالِ مکانی کے ساتھ ان کے املاک اور اموال کے تحفظ کی ضروری ضمانت بھی دی جاتی۔ یہ انتقال آبادی انگریزی حکومت کے زیر انتظام طے پاتا۔ جب اس طرح آبادیاں منتقل ہوجاتیں۔ تو آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ملک کے رقبہ کی تقسیم کی جاتی اور یہی تقسیمی خطوط پاکستان اور ہندوستان کی مملکتوں کے حدود قرار پاتے۔ لیکن بدقسمتی سے

Marfat.com

حالات ایسے پیدا ہو گئے یا کر دیئے گئے کہ جن کے ماتحت ایسا نہ ہو سکا اور جو ابھی کل شام تک اپنے مکانوں اور دوکانوں پر پاکستانی جھنڈے لہرا رہے تھے دوسری صبح انھوں نے دیکھا کہ ریڈ کلف کی ابرو کے ایک اشارہ نے انھیں بھارت ورش کی چار دیواری میں محبوس کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک اب بھی اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ جو کچھ اس وقت نہ ہو سکا اسے اب کر لیا جائے۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کے درمیان معاہدہ یہ ہونا چاہیئے کہ ان کی حدود مملکت میں بسنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہدیا جائے کہ جس کا جی چاہے اپنی اکثریت کے علاقوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس تبادلۂ آبادی کی ذمہ داری متعلقہ حکومت اپنے سر لے اور منتقل ہونے والے باشندوں کی جائدادوں کے انتقال کی ضمانت بھی دے۔ یہ سب کچھ ایک مدت معینہ کے اندر مکمل ہو جانا چاہیئے۔ اس کے بعد آبادی کے تناسب سے ملک کے رقبہ میں مناسب ترمیم کی جائے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ اس تبادلہ آبادی میں بہت سی انتظامی دشواریاں پیش آئیں گی لیکن وہ دشواریاں بہر کیف اور بہر حیثیت ان مستقل مشکلات اور مسلسل بد امنی سے کم ہوں گی جو غیر مطمئن رعایا کو مجبوراً اپنے ہاں رکھنے سے دونوں مملکتوں کو پیش آتی رہیں گی۔ اس تین برس کے عرصہ کو دیکھئے۔ فکری تدبیروں اور انتظامی کارکردگیوں کا بیشتر حصہ اقلیتوں کے تحفظ کے مسئلہ کی نظر ہو گیا۔ اور اس کے باوجود نہ صرف یہ کہ کوئی اطمینان بخش صورت پیدا نہ ہو سکی بلکہ حالات اس درجہ نازک ہو گئے کہ اگر بعض موانع

حائل نہ ہوتے تو ان دونوں مملکتوں میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی۔ جو کچھ اس تین سال کے عرصہ میں ہوا ہے وہی کچھ مستقل طور پر ہوتا رہے گا۔ ہندو جاتی اپنی اس ذہنیت کے ماتحت جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے مسلمان کو دوہری مار مارتی ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں پر بے حد مظالم ہو رہے ہیں اور اس طرح پاکستان کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں پر گوشۂ عافیت تنگ کر دیتے ہیں جس سے وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان کی طرف بھاگ آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انہیں خود تو اس طرح بھاگ آنے پر مجبور کیا جاتا ہے مگر ان کے چلے آنے کے بعد شور یہ مچایا جاتا ہے کہ پاکستان بھارت میں بدامنی پھیلانے کے لئے یہاں کی مطمئن رعایا کو اکسا اکسا کر اپنے ہاں بلا رہا ہے۔ ابھی پچھلے معاہدہ کو دیکھئے۔ پاکستان میں ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں نے اس کا عشر عشیر بھی نہیں کیا جو انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ لیکن معاہدہ کی تمہید میں انہوں نے پاکستان کو اس اعتراف پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو برابر کا ملزم تسلیم کرے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے پراپیگنڈے کے اثر سے بین الاقوامی ادارے پاکستان کو کچھ زیادہ ہی ملزم سمجھتے ہیں کہئے کہ ان حالات میں کس طرح امن کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں دونوں مملکتوں میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی اطمینان بخش صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ باہمی رضامندی اور مفاہمت سے تبادلۂ آبادی کو ممکن بنا دیں۔ اور اس طرح ہمیشہ

کے لئے ان خار دار جھاڑیوں سے نجات پالیں۔ یہ کچھ اول و آخر زود یا بدیر کرنا ہی ہوگا جتنی جلدی یہ کر لیا جائے اتنا ہی یہ دونوں مملکتوں کے حق میں نفع بخش ہوگا۔ جتنی دیر کی جائے گی دشواریاں بڑھتی جائیں گی۔ کچھ عرصہ پیشتر ترکوں اور یونانیوں کی ملحقہ مملکتوں کو بھی اسی قسم کی دشواری پیش آئی تھی۔ انھوں نے سیاسی عاقبت اندیشی سے کام لیا۔ اور باہمی سمجھوتے سے متعلقہ حکومتوں کے زیر اہتمام تبادلہ آبادی کے مراحل طے کر لئے۔ اور اس کے بعد دونوں مملکتیں امن چین سے رہنے لگیں۔ اگر یہ کچھ وہاں ہو سکتا تھا۔ تو یہاں کیوں نہیں ہو سکتا۔

ہماری پیشکردہ تجویز کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن العمل ہو سکتی ہے جب اس پر ہندو بھی رضامند ہو۔ لیکن اگر ہندو اس پر رضامند نہ ہو تو؟ یہ صورت واقعی غور طلب ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ ہندو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ پاکستان کا مسلمان اپنی ہندو اقلیت کی حفاظت بہر حال کرے گا۔ اس لئے کہ اس کا فلسفہ زندگی اسے ظلم اور ناانصافی کی کبھی اجازت نہ دے گا۔ لہٰذا سوال کی نوعیت یوں ٹھہری کہ اگر ہندو تبادلہ آبادی پر رضامند نہ ہو تو کیا ہندوستان کے مسلمان پر پاکستان کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ اور اس طرح انھیں بےکسی اور بےبسی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ یا تو ذلت کی زندگی جیئیں اور یا بےچارگی کی موت مریں۔ عملاً اور سیاسی اعتبار سے اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ سیاسی اعتبار سے وہاں کے مسلمان بھارت کی

رعایا ہے۔ اور اسے اپنے معاملات اپنی حکومت سے خود سلجھانے چاہئیں۔ ہم اپنے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کی حفاظت اور بہبود کے ذمہ دار ہیں۔ دوسرے ملک میں بسنے والے مسلمانوں سے سوائے لفظی ہمدردی کے ہمارا کچھ تعلق نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے سیاسی نقطۂ خیال سے یہ جواب نہایت مدلل اور یہ طرزِ عمل بالکل مناسب ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک مسلمان (یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والے انسان) کے نزدیک بھی یہ جواب معقول اور اسلوبِ فکر مناسب قرار پائے گا۔ جیسا کہ ہم اپنی آزادی کی دس سالہ جدوجہد میں اعلان کر چکے ہیں (اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے دعوے آزادی کی بنیاد ہی اس مسئلہ پر تھی) مسلمان کی قومیت کا مدار کسی ملک کی حدود پر نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس کی قومیت

اسلامی قومیت کا مدار

وحدتِ فکر و عمل سے ترتیب پاتی ہے۔ جس کا نام دین کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ ہم نے اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے کو انگریز اور ہندو دونوں سے اسی بنیادی حقیقت کی بنا پر منوایا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم تھی۔ مسلم ہے اور مسلم رہے گی کہ مسلمانوں کی قومیت کا مدار ایمان کے سوا اور کسی شرط پر نہیں۔ بنا بریں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ملکی تقسیم کا خط ادھر کے مسلمانوں کو ہم سے الگ قوم نہیں بنا سکتا۔ اگر ہم میں سے کوئی اس تقسیمی خط کو جداگانہ قومیت کا معیار قرار دیتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے بنیادی تقاضے سے علی الاعلان انکار کرتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ دنیا کو یہ بتاتا ہے کہ ہماری جنگ

Marfat.com

آزادی میں جداگانہ قومیت کا تقاضا محض ایک وکیلانہ حربہ تھا یا ہے۔ اسی چال خدا
پناہ میں رکھے ایسے شخص سے جو قرآنی حقیقت کا اس طرح انکار کرے اور پوری
کی پوری ملت اسلامیہ پاکستانیہ کو ایسا منافق ثابت کرے۔ لہٰذا اس حقیقت کبریٰ
میں کسی شبہ یا تاویل کی کوئی گنجائش نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان
ایک ہی ملت کے افراد اور ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ اس لئے اگر ہندوستان تبادلہ
آبادی پر رضامند نہ بھی ہو تو ہم کسی صورت میں بھی ہندوستانی مسلمانوں پر اپنا
دروازہ بند نہیں کرسکتے۔ ہماری سیاست کا مرکز حریم کعبہ ہے جس کے متعلق
قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ وہ سواء العاکف والباد
ہے۔ یعنی اس کے دروازے وہاں کے رہنے والوں اور باہر کے آنے والوں سب

مرکز امن

کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ ہم جس مقام پر بھی اسلامی حکومت
کے قیام کا ارادہ کریں گے۔ کعبہ کا سیاسی قانون ہمارے آئین ودستور
کی بنیاد ہوگا۔ اس لئے اگر کعبہ کا دروازہ ملکی اور غیر ملکی مسلمانوں میں تمیز نہیں رکھتا
اور ہر ایک کے لئے کھلا کھلا اعلان کرتا ہے کہ ومن دخلہ کان آمنا یعنی جو بھی
اس گھر میں داخل ہوگیا وہ ہر قسم کے خطرات سے مامون ہوگیا۔ تو وہ کونسا مسلمان
ہے۔ جو قرآن پر ایمان رکھتے ہوئے یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ پاکستان کا دروازہ
ہندوستان کے مسلمانوں پر بند ہے؟ ہماری سیاسی مصلحت کوشیوں کے تقاضے کچھ
بھی ہوں۔ لیکن دین کا تقاضا ان سب پر غالب رہے گا۔ اور اگر ہمارے لئے قول

Marfat.com

فیصل دینی تقاضا نہیں ہے۔ بلکہ سیاسی مصلحت کوشیاں اور ہنگامی مفاد انگیزیاں ہیں تو پھر ہمیں ان اعلانات سے فوراً دست بردار ہو جانا چاہیئے کہ پاکستان اسلامی دستور زندگی کی تشکیل کے لئے وجود میں لایا گیا ہے کہ کبر مقتا عند اللہ ان تقولو ما لا تفعلون۔

بنا بریں یہ خیال ایک لمحہ کے لئے بھی ہمارے دل میں نہیں آنا چاہیئے۔ کہ جو مسلمان اس وقت پاکستان میں ہیں۔ پاکستان انہی کا گھر ہے۔ اور جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ وہ غیر ہیں۔ ان کا اس گھر میں کوئی حصہ نہیں۔ پاکستان وہ مسجد ہے۔ جس میں ہر مسلمان کا برابر کا حصہ ہے۔ اور قرآن کے فیصلہ کے مطابق اُس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے۔ جو لوگوں کو اللہ کی مسجد میں آنے سے روکنے کے لئے پاکستان کے دروازے ہندوستان کے مسلمانوں پر کسی صورت میں کبھی بند نہیں کئے جا سکتے ولو کرہ المشرکون لہذا ہمیں ان مسائل کے دوسرے حل تلاش کرنے ہوں گے۔ جو ہندوستان کے مسلمانوں کے پاکستان میں آنے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ دردِ سر کا علاج سر کو الگ کاٹ کر پھینک دینے سے نہیں ہوا کرتا۔ جو طبیب اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں جانتا، وہ جتنی جلدی اپنی دعوے طبابت سے دست کش ہو جائے۔ اتنا ہی نوع انسانی کے لئے مفید ہو گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس اتنی کثیر آبادی کے لئے گنجائش کہاں ہے ہم پوچھتے ہیں کہ اگر دس برس میں پاکستان کے موجودہ مسلمانوں کی اپنی آبادی ہی سوائی

یا ڈیوڑھی ہو جائے۔ تو کیا آپ آبادی کے اس اضافہ کو بحیرۂ عرب میں ڈبو دیں گے؟ اس وقت بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ جو کچھ اس وقت کیا جائے گا۔ اسے آج ہی کر لیجئے حکومت کرنے والی قوموں کے تدبر کی آزمائش ایسے ہی مسائل کے حل سے ہوا کرتی ہے۔ ممکن ہے یہ بھی کہا جائے کہ سوال جگہ کا نہیں۔ معاشی مشکلات کا ہے۔ اس امر کا فیصلہ کہ پاکستان کے معاشی ذرائع اتنی آبادی کے کفیل ہو سکتے ہیں یا نہیں صحیح اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جو ہمارے ہاں موجود نہیں۔ لیکن ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ جو کچھ ہمیں ملا ہے۔ اگر اس کی تقسیم مساویانہ حیثیت سے

معاشی حل

کر دی جائے۔ تو یہی ذرائع کم از کم چار گنا زیادہ آبادی کی ضروریات زندگی کے لئے بآسانی مکتفی ہو سکتے ہیں۔ اس تقسیم کا صحیح طریق یہ ہے کہ ان ذرائع پیداوار (زمین۔ کارخانے۔ معدنی ذخائر وغیرہ) کو افراد کی ملکیت قرار دینے کی بجائے ملت کی مشترکہ ملکیت قرار دیا جائے۔ جس کے ماحصل میں ہر فرد ملت کا برابر کا حصہ ہو[1] بس غریب کے گھر میں چار روٹیاں پکتی ہیں۔ اس کے آٹھ افراد خاندان آپس میں آدھی آدھی روٹی بانٹ لیتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک شخص پیٹ بھر کر کھا لے اور باقی سات بھوکے سو رہیں۔ اس وقت ہم پر ایسا ہی وقت آپڑا ہے۔ اور اس مشکل کا حل بھی یہی ہے۔ اس وقت سارے پاکستان میں ذرائع پیداوار چند گنتی کے خاندانوں کے قبضہ میں ہیں۔ یہی ہیں جو یہاں کے غریبوں کو انسانی سطح پر آنے نہیں

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "قرآنی دستور پاکستان" شائع کردہ طلوع اسلام۔

دینا چاہتے۔ اور یہی ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی دہیں بند رکھنا چاہتے ہیں اگر ان تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیدیا جائے۔ تو ان سے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے موجودہ مسلمانوں ہی کی اقتصادی سطح بلند ہو جائے گی۔ بلکہ یہ بھی کہ ہم ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو بھی بہ آسانی بسا سکتے ہیں۔ ہماری مشکل معاشی کمزوری نہیں بلکہ یہ ہے کہ مترفین کا گروہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے۔ اور خدا کی ربوبیت کو عام نہیں ہونے دیتا۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر ارباب حکومت کے دل میں اس مسئلہ کے حل کی تلاش کا جذبۂ صادق موجود ہو تو اس کے لئے صرف عزم راسخ کی ضرورت ہے۔ باقی سب کچھ یہاں موجود ہے ولما فتحوا متاعھم وجدوا بضاعتھم ردت الیھم ہمارا سامان زیست خود ہماری اپنی بوریوں میں بند ہے۔ بس سوال ان بوریوں کے منہ کھول دینے کا ہے۔

جو کچھ گزشتہ صفحات میں گزارش کیا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) اقلیتوں کے مسئلہ کا اطمینان بخش اور موثر حل پاکستان اور بھارت دونوں مملکتوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔

(۲) ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا مستقل، موثر اور قابل اطمینان حل اس کے سوا اور

Marfat.com

اور کچھ نہیں کہ اقلیتوں کو اپنے اکثریت کے علاقوں میں کسی مدت معینہ کے اندر چلے جانے کی کھلی اجازت دیدی جائے ...... اور جس ملک میں فاضل آبادی انتقالِ مکانی کرے۔ اسے مزید علاقہ دیدیا جائے۔ جتنی جلدی اس حل کو اختیار کیا جائے گا اتنا ہی ہر دو مملکتوں کے لئے مفید ہوگا

(۳) ان حالات کے پیش نظر حکومت پاکستان اور حکومت ہندوستان کے مابین اقلیتوں کے تبادلہ اور اس کے تضمنات کے متعلق گفت وشنید شروع کردینی چاہیئے۔

(۴) جب تک یہ امور عملی طور پر طے نہ پاجائیں۔ اتنے عرصے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمان وہاں امن سے دن بسر کرسکیں اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ انہیں وہاں بے یارومددگار نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ ان سربر آوردگانِ قوم کو جو انہیں چھوڑ کر یہاں آگئے ہیں۔ واپس بھیج دیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت ہند ان کی واپسی میں مزاحم نہ ہوگی۔

(۵) اگر یہ سربرآوردگان قوم جانے پر تیار نہ ہوں۔ یا ان کی مراجعت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانوں کو اطمینان نصیب نہ ہو۔ تو آخری حل کے مذاکرات کے دوران میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ صرف پاکستان آنے کی اجازت ہونی چاہیئے بلکہ اس باب میں ضروری سہولتیں بھی بہم پہونچانی چاہیئں۔

(۶) ان تدابیر کے ساتھ ہی خود پاکستان میں مسلمانوں کی موجودہ آبادی

اور ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں کو امن اور خوشحالی کے ساتھ بسانے کے مختلف طریقوں پر غور و فکر کرنا چاہیئے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ معاشی ہے جس کا حل یہ ہے کہ پاکستان کے تمام ذرائع پیداوار کو انفرادی ہاتھوں سے نکال کر قومی ملکیت قرار دیا جائے۔ اور اس طرح ان ذرائع کے ماحصل کی تقسیم تمام باشندگان پاکستان کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق کی جائے۔ کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ۔ یہی ہے وہ اسلامی سوشلزم جس کے متعلق ہمارے وزیر اعظم امریکہ میں بار بار اعلان فرما چکے ہیں۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

(نوشتہ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء)

Marfat.com

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری

لاہور سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ دعوےٰ ہے کہ اسلام تمام نوعِ انسان کو ایک برادری قرار دیتا ہے۔ اور اس طرح وحدتِ حیات سے ایک عالمگیر اخوت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ لیکن باقی مذاہب والوں سے بات کیجئے (بالخصوص عیسائیوں اور ہندوؤں سے) تو وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کے ہاں تمام انسانوں کو ایک برادری بنایا گیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اسلام کا یہ دعوےٰ اپنے اندر کیا خصوصیت رکھتا ہے۔

جواب۔

کہنے کی بات کا تو یہ عالم ہے کہ آجکل یہ فیشن ہو رہا ہے کہ کوئی اہم نظریہ سامنے آئے۔ ہر مذہب اور تہذیب کے مدعی فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہاں پہلے ہی سے موجود ہے۔ نظریات و اصولات کی دنیا تو ایک طرف محسوسات کی دنیا تک میں یہی ہے۔ چنانچہ آپ نے عام ہندوؤں کو کہتے سنا ہوگا کہ ہوائی جہازوں کا ذکر رامائن میں ہے۔ اور مہاراج بھرت نے ہنومان کو ہوائی جہاز کے

کے ذریعہ اجودھیا سے لنکا پہونچایا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر انگریز ہندوستان میں نہ آتا۔ تو بھارت دیش کے راجاؤں کو بہلیوں سے بڑھ کر کوئی سواری نصیب نہ ہوتی۔ ہندا حقیقی دلیل یہ نہیں کوئی کہتا گیا ہے۔ دلیل اصل یہ ہے کہ مدعی کی مزعومہ آسمانی کتاب میں کیا لکھا ہے۔ ہندو تو کبھی اس باب میں سامنے آنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتے۔ جن کے ہاں بھارت دیش کے باہر انسان نہیں ملیکش بستے ہوں۔ اور خود بھارت کے اندر ہندو جاتی میں برہمن۔ کھشتری، شودر اور دیش کی ازلی پیدائشی تقسیم موجود ہو۔ اور جن کے ہاں اچھوت حیوانات سے بدتر سمجھے جاتے ہوں۔ اور یہ سب کچھ ویدوں اور سمرتیوں کی تعلیم کے مطابق ہو رہا ہو۔ انھیں کیا حق پہونچتا ہے کہ وہ انسانیت کی عالمگیر برادری کا نام بھی لے سکیں۔ باقی رہے عیسائی۔ سو ان کے ہاں واضح الفاظ میں موجود ہے کہ خدا کا پیغام صرف قوم بنی اسرائیل کے اندر محصور رہے گا۔ غیر بنی اسرائیل تک اس پیغام کا ایک لفظ تک نہیں پہونچایا جائے گا۔ انجیل متی میں ہے کہ حضرت مسیحؑ نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو

انھیں حکم دے کر کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی۔ باب ۱۰ آیات ۵-۶)

اسی کی تفسیر میں دوسری جگہ ہے۔

Marfat.com

پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو (متی ۷-۶)
سو ظاہر ہے کہ جس تعلیم کی مخاطب صرف ایک قوم بنی اسرائیل ہے اس
میں انسانیت کا عالمگیر تصور کہاں سے آسکتا ہے؟ یہ قرآن ہے جس نے
یا ایھا الناس (اے نوع انسانی) کے تخاطب سے تمام انسانیت کو دعوت
دی۔ اس نے خدا کو رب العالمین۔ قرآن کو ذکر للعالمین اور رسول کو کافۃ للناس
(تمام نوع انسانی کی طرف رسول) کہہ کر پکارا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس
نے تمام نوع انسانی کی پیدائش کا سرچشمہ "نفس واحدہ" قرار دے کر صرف
نظری اعتبار سے نہیں بلکہ بطور ایک حقیقت نفس الامری کے وحدت انسانیت
کا اعلان کیا۔ اگر کسی اور مذہب میں اس حقیقت کا ذکر ہے۔ تو اس سے کہیے کہ
فاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔ ورنہ زبانی دعاوی میں کون
پیچھے رہتا ہے۔؟

Marfat.com

نیابت الٰہی

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ عام طور پر کہا جاتا ہے (اور اسلامی جماعت کی طرف سے اسے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے) کہ اسلام میں حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور ملت اسلامیہ اس کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتی ہے۔ حکومت پاکستان نے اپنی قرار داد مقاصد میں بھی یہ لکھا ہے کہ اختیار اعلیٰ Sovereignty خدا کے لئے ہے۔ لیکن اس نے اپنے اختیارات بندوں کو تفویض Delegate کر دیئے ہیں۔ یہ تصور تھیوکریسی Theocracy کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی یہی کہا جاتا تھا کہ اصل اختیار تو خدا کو حاصل ہے۔ لیکن انہی Divine Rights کو بادشاہ استعمال کرتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے بھی اپنے ہاں مرد مومن کو نائب حق کہا ہے۔ ان دونوں تصورات میں کیا فرق ہے؟

جواب۔

Marfat.com

ہمارے نزدیک نیابت الٰہی کا تصور صحیح نہیں۔ خدا نے کہیں نہیں کہا کہ ہم نے اپنے اختیارات کسی اور کو تفویض Delegates کر دیئے ہیں خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا انسانوں کی جماعت۔ اور اب وہ بادشاہ یا جماعت خدا کے Behalf پر دنیا میں حکومت کریں گے۔ نیابت کی سند میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا۔ یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں لکھا کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے خلیفہ کے معنی جانشین Successor ہیں۔ اور جانشینی اس کی کی جاتی ہے۔ جو خود موجود نہ ہو۔ اس لئے خدا کا جانشین Successor ہونے کا تصور غلط ہے (خلیفہ کے صحیح تصور کے لئے معارف القرآن کی دوسری اور چوتھی جلد ملاحظہ فرمایئے) جماعت اسلامی کے سامنے تھیوکریسی ہی کا تصور ہے۔ ان کے نزدیک زمامِ حکومت ارباب مذہب کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ جو خدا کے نائبین کی حیثیت سے حکومت کریں گے۔ نائبین زمین پر خدا کا سایہ ہوں گے کیونکہ ان کے خیال کی رو سے سلاطین ظل اللہ ہوتے ہیں۔ انہی کی غوغا آرائی سے ہمارے ارکان حکومت بھی متاثر ہو گئے۔ اور انھوں نے قرارداد مقاصد میں انہی کی تقلید میں یہ لکھ دیا کہ حکومت خدا کے تفویض کردہ اختیارات Delegated Powers کو استعمال کرے گی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ انسان نہ خدا کا نائب ہے۔ نہ خلیفہ۔ اور نہ ہی خدا نے اپنے اختیارات تفویض

کئے ہیں۔ اسلام تھیوکریسی کے اس تصور کو مٹانے کے لئے آیا تھا

جو قوم دنیا میں حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کی عمارت کن بنیادوں پر استوار ہوگی۔ جب تک یہ اصول طے نہ پا جائیں اس وقت تک کسی حکومت کا قیام آئینی طور پر صحیح نہیں ہوتا۔ عام حکومتیں خود اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطابق اپنی حکومت کی بنیادیں متعین کرتی ہیں۔ لیکن جس حکومت کا تصور قرآن نے دیا ہے۔ اس میں حکومت انسانی ذہنوں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق متشکل نہیں ہوتی۔ بلکہ ان اصولوں کے مطابق قائم کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرہ کے لئے متعین فرمائے ہیں۔ اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ یعنی یہ وہ حدود اللہ ہیں جس کے اندر انسان اپنے اختیارات کو استعمال کر سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر قرآنی حکومت انسانی اختیارات و باہمی معاملات کی حدود متعین کرتی ہے۔ یہ حدود غیر متبدل ہیں۔ اور تمام نوع انسانی کو محیط ان حدود کے اندر انسان اپنے اختیارات کے استعمال میں خود مختار ہوتا ہے جس طرح فٹ بال کی گراؤنڈ میں حدود و قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر کھلاڑی اپنے جوہر کے مظاہرے میں صاحب اختیار ہوتا ہے ان الحکم الا للہ سے یہی مفہوم ہے حکم کے معنی ہی روکنے کے ہیں۔ اور خدا کے حکم سے مفہوم یہ ہے کہ وہ بتلائے کہ انسانی اختیار کو کہاں رکنا ہے۔ یہ حکومت خدا کی جانشین نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کے اختیارات خدا کے تفویض کردہ Delegated ہوتے ہیں۔

Marfat.com

انسان صاحب اختیار ہے۔ جو قوم اپنے اختیارات کو اپنی وضع کردہ حدود کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ وہ غیر قرآنی حکومت کہلاتی ہے۔ اور جو قوم ان اختیارات کو قرآنی حدود کے تابع استعمال کرتی ہے۔ اسے قرآنی حکومت کہا جاتا ہے۔ طلوع اسلام نے جب کبھی قرآنی حکومت یا خدا کی حکومت کا نام لیا ہے تو اس سے مقصود اسی قسم کی حکومت ہے۔ علامہ اقبالؒ کے ہاں نائب حق کی اصطلاح ضرور ملتی ہے لیکن اگر ان کی پوری تعلیم کو سامنے رکھا جائے۔ تو یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان کے پیشِ نظر تصور وہی تھا۔ جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور جو تھیوکریسی کے یکسر مخالف ہے۔ وہ اس اصطلاح کو استعمال نہ فرماتے تو اچھا تھا۔ کیونکہ اس سے بعد میں التباس کا امکان ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

نوجوانوں کے دل کی دھڑکن

اس خط کو ملاحظہ فرمایئے۔

محترمی ایڈیٹر صاحب طلوع اسلام کراچی۔ تسلیم! طلوع اسلام کافی عرصہ سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کا طرز استدلال اور اجتہاد قابل داد ہے۔ اور آپ کی روشن دماغی مسلم۔ قرآن فہمی میں جو ملکہ آپ کو حاصل ہے۔ شاید ہی کسی کو ہو۔ مگر آپ کی یہ ذہانت اور استدلال اسلام کے راستہ کی مشکلات کو رفع نہیں کر سکتا۔ چونکہ جو واقعات صدیوں سے صفحہ تاریخ پر ثبت ہیں۔ وہ طلوع اسلام کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتے۔ اور اگر آپ آج پونے چودہ سو سال بعد ان واقعات کو نوچ نوچ کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرنا چاہیں۔ تو میرا خیال ہے۔ یہ ایک سعی لاحاصل ہوگی۔

اسلامی نظام ایک وہمہ ہے

آپ ہر بار اسلامی نظام کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام سے بہتر نظام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ کی طرح

Marfat.com

خوش عقیدہ اور لوگ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ کا ایک ایک ورق
بار بار یہ دُہرا رہا ہے کہ اسلامی نظام صرف ایک واہمہ ہے۔ جس کی
کوئی اصلیت نہیں۔ یہ امرا اور حکمران طبقے کے ہاتھ میں ایک ایسا سحر ہے
جس سے وہ جس وقت چاہیں عوام کو سلا سکتے ہیں۔ اور اُن کی آنکھوں
سے اس کا اثر زائل ہی نہیں ہونے دیتے۔ اس کے سوا اگر اور کوئی
اسلامی نظام ہے۔ تو وہ ممکن ہے کہ آپ کے یا اور کسی کے ذہن
میں موجود ہو تو ہو مگر آج تک نہ تو تاریخ نے اس نظام کی کبھی جھلک
دیکھی۔ اور نہ آئندہ کبھی دیکھ سکیگی۔ کیونکہ دوسرے نظاموں کی طرح
یہ مفروضہ نظام کچھ عرصہ زندہ رہ کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اور خدا
کی مشیت بھی یہی ہے کہ کوئی نظام پائیدار نہ ہو۔ کیونکہ انسان
ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے۔ اور اگر کوئی مستقل نظام اس پر مسلط
کر دیا گیا۔ تو اس کا ارتقا رک جائے گا۔ جو سراسر خلاف قانون قدرت
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی نظام خواہ وہ انسان کا بنایا ہوا ہو
یا اسے خدا کا بنایا ہوا کہا جائے۔ وہ روئے زمین پر کہیں بھی متواتر رائج
نہیں رہ سکتا۔ اس میں تغیر و تبدل زمانہ کی ضروریات کے
مطابق ہوتے رہتے ہیں۔

آپ کے مبینہ نظام اسلام نے کیا کار ہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس

Marfat.com

دورِ اول کی تاریخ

وقت جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رحلت فرمائے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ حضورؐ کے صحابہ کرامؓ نے کیا کچھ کیا۔ خلیفہ اول کو کس نظام نے تلوار کی گھاٹ اتارا۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو کس نظام نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حضرت عثمانؓ پر کیا بیتی۔ حضرت علیؓ کا کیا حشر ہوا۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھے۔ ان کا کیا حشر ہوا اور اس کے بعد آج تک کیا ہو رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کا وہ کون سا صفحہ، صفحہ نہیں سطر بلکہ وہ کون سا لفظ ہے۔ جو بے گناہوں کے خون سے نہ لکھا گیا ہو۔ خیر اس پر تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام صرف خلافت راشدہ تک ہی قائم رہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے اسلام بری الذمہ ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کو کیوں قتل کیا گیا۔ اور ان کے قاتل کو کیوں سزا نہیں دی گئی۔ اور حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص لینے والے امیر معاویہ نے نیزوں پر قرآن لٹکا کر کیوں علیؓ کی فوج کو لڑنے سے روک دیا۔ اور کہا کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ قرآن کو درمیان میں رکھکر بذریعہ ثالثی کیا جائے۔ اور پھر ثالثی فیصلہ کا کیا حشر ہوا۔ کیا اس جنگ میں دونوں اطراف سے صحابہ عشرہ مبشرہ موجود

لہ خلیفہ اول کو کسی نے تلوار کی گھاٹ نہیں اتارا تھا۔ طلوع اسلام

Marfat.com

نہ تھے۔ وہ صحابہؓ موجود نہ تھے۔ جنھوں نے رسول پاک کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ کیا وہ اسلامی نظام سے واقف نہ تھے۔ پھر کیوں خونریزی ہوئی۔ اور وہ بھی اس وقت جبکہ حضور پاک کو رحلت فرمائے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ اور ان کے فیض سے براہ راست مستفیض ہونے والے صحابہؓ کرام اسلامی نظام کو ہم اور آپ سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے۔ وہ دوبارہ اسلامی نظام کو کیوں نہ زندہ کر سکے۔ کیا خدائی نظام ایسا ہی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں صرف چند سال اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے۔ اور اس کے مقابلہ میں انسان کا بنایا ہوا نظام ہزار ہا سال تک چلتا ہے۔ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ اللہ میاں سے تو اس کے بندے ہی زیادہ سمجھدار ہیں کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو اللہ میاں کے نظام کے مقابلہ میں زیادہ مقبول ہوتا ہے۔ اور زیادہ عرصہ چلتا ہے۔

محترم مدیر صاحب یاران سبکسار ان تو محمل تک جا پہنچے ہیں اور آپ اپنی قوم کے دامن کو پکڑ کر آج سے تیرہ سو سال پہلے کے دور وحشت کی طرف گھسیٹ رہے ہیں۔

اسلامی آئین کیا ہے

آپ کس نظام کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں آج تک اس کی کوئی باقاعدہ تشکیل ہوئی

آئین اسلامی کی کوئی کتاب چھپی۔ یا ویسے آئین کا مجموعہ تیار کیا گیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے۔ کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ آپ سے پوچھا جائے اسلامی آئین کیا چیز ہے۔ آپ قرآن کی ایک دو آیت پڑھ کر تفسیر کرنے لگیں گے۔ کسی حنفی سے پوچھا جائے۔ وہ بخاری۔ مشکوٰۃ یا فقہ کی کتاب کا حوالہ دے گا۔ شیعہ سے دریافت کیا جائے۔ تو وہ مجتہدین کے اقوال کے حوالے دینے لگے گا۔ اور باقی فرقوں کے لوگوں سے پوچھنے پر بھی اسی قسم کا جواب ملیگا۔ مگر آج تک نہ ہی کسی فرقہ کے علماء نے آئین کی کتاب مرتب کی ہے۔ اور نہ ہی اجتماعی طور پر تمام فرقوں کے علماء نے کوئی آئین بنا کر پیش کیا ہے۔ آئین کے مطابق جو استدلال کیا جاتا ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی رائے تو ہو سکتا ہے۔ مگر اسے قرآن۔ حدیث یا فقہ کا منشا نہیں کہا جا سکتا۔

ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ ہمارا آئین زمانہ کے مطابق ترقی یافتہ لائنوں پر وضع کیا جائے۔ تاکہ ہم دنیا کی دیگر اقوام کے شانہ بشانہ مادی ترقی کر سکیں۔ اور عالم اسلام پر جو ذلت اور نحوست چھائی ہوئی ہے اس سے نجات دلا سکیں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کا کوئی مبینہ اسلامی نظام قائم کر دیا گیا۔ تو اس کا حشر معلوم۔ کیونکہ بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی صدیوں کی کشمکش کی تاریخ شاہد ہے۔ اور یہاں بھی وہی

Marfat.com

تاریخ دہرائی جائے گی - یہ مرزائی ہے۔ اسے وزارت خارجہ سے الگ کردو اور مرزائیوں کو اقلیتی فرقہ قرار دو - یہ شیعہ ہے اسے وزارت یا سفارت سے نکال دو کیونکہ یہ کافر ہے صحابہؓ پر سب وشتم کرتا ہے - یہ وہابی ہے یہ فقہ کو نہیں مانتا اُسے بھی نکال دو - اور یہ اہل قرآن ہے اسے بھی کراچی سے شہر بدر کر دو کیونکہ یہ محدثین کی عرقریزی سے جمع کی ہوئی احادیث کا منکر ہے اس لئے کافر ہے اور یہ . . . . .

آپ کون سا اسلامی نظام قائم کریں گے - کیا آپ بقول شیعہ حضرات حق خلافت سادات کو تفویض فرمائیں گے - اگر نہیں تو شیعہ حضرات آپ سے کیسے تعاون کرینگے - کیا آپ خلیفہ ثانی مرزا محمود احمد کو خلیفہ اول پاکستان تسلیم کریں گے - نہیں تو پھر مرزائی صاحبان کیوں ایسے نظام کو تسلیم کریں گے - اسی طرح دوسرا کونسا فرقہ ہوگا جو اسلامی آئین کی تشکیل میں آپ کا ساتھ دے -

آپ میرا یہ طویل خط جس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں پڑھ کر مجھے گمراہ کہہ سکتے ہیں - کافر کہہ سکتے ہیں - کمیونسٹ یا اور جو کچھ آپ کے ذہن میں آئے کہہ سکتے ہیں - مگر خدارا حقائق کو نظر انداز نہ کریں قوم کو تباہی اور بربادی کے غار میں نہ دھکیلیں - بار بار اسلامی آئین کی رٹ نہ لگائیں - یہ ایک واہمہ ہے - خوش اعتقادی ہے - ہٹ

دھرمی اور ضد ہے۔ جس کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی آیئن بنا کر بھیجا ہوتا۔ تو یقیناً وہ اس کے نفاذ کے لئے حالات پیدا کر دیتا۔ اور اپنے ہمہ گیر آیئن سے کبھی بھی اپنے بندوں کو محروم نہ کرتا۔ اس کا آیئن یہی ہے جو چل رہا ہے۔ اور زمانے کے ساتھ چلتا رہے گا۔ اس میں حالات کے مطابق ترامیم و تنسیخ بھی ہوں گی۔ ایک آیئن کو ختم کر کے دوسرا بہترین آیئن نافذ بھی کیا جائے گا۔ یہی مشیت ربی اور سنت اللہ ہے۔ جو ازل سے ابد تک چلی جائے گی۔

یہ عریضہ بے ربط سہی یا محض جذباتی ہی سہی۔ مگر میں صرف اتنی استدعا کرتا ہوں کہ آپ صحابہ عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے۔ ابوبکرؓ۔ عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ نہیں بن سکتے۔ اگر یہ بھی نہیں بن سکتے۔ تو اسلامی آیئن کیسے نافذ کریں گے۔ جس نظام کو پہلے دو خلفا نے مضبوط کیا۔ وہ عثمانؓ اور علیؓ کے دور خلافت میں کیوں روبہ انحطاط ہو گیا۔ آپ اس بارے میں غور فرمائیں کیا یہی مشیت الٰہی نہیں تھی کہ وہ نظام ختم ہو کر ایک اور نظام جنم لے اور پھر ایک اور، اور، اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔

میں پھر اس طویل خط کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ اسے

Marfat.com

مطالعہ کر کے جو بھی سخت سے سخت الفاظ میرے لئے استعمال کریں گے انھیں میں خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کے جذبات کو بہت بڑی ٹھیس پہونچادی ہے۔ اور اگر اس ٹھیس سے کوئی آواز پیدا ہو تو مجھے یہ برداشت کرنا پڑے گی۔

اچھا - زیادہ آداب

طلوع اسلام

اس خط کو ہم نے اس لئے شائع کیا ہے کہ یہ صرف مراسلہ نگار کے ذاتی خیالات کا آئینہ دار نہیں بلکہ ترجمانی کر رہا ہے ہماری موجودہ نسل کے نوجوانوں کے عام خیالات کی جو اسلام کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو کر ذہنی انتشار کا باعث اور انھیں اسلام کی طرف سے متنفر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہمارے پاس اس قسم کے خطوط عام طور پر آتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر نوجوانوں کی طرف سے زبانی گفتگو میں بھی اسی قسم کے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں۔ بنابریں اسے زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کا جواب انفرادی نہیں بلکہ عمومی حیثیت سے بذریعہ طلوع اسلام دیا جائے۔ اس خط میں بہت سی تلخیاں اور بہت کچھ غلطیاں بھی ہیں۔ لیکن ہم ان جزئیات سے صرف نظر کر کے صرف اصولی جواب پر اکتفا کریں گے۔

مراسلہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام چند دنوں کے لئے قائم ہوا اور اس کے بعد ختم ہو گیا۔ اگر یہ نظام مبنی بر صداقت تھا۔ اور

Marfat.com

اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی۔ تو ہمیشہ کے لئے کیوں قائم نہ رہا۔ چونکہ یہ نظام نہ تو آگے بڑھ سکا اور نہ ہی آج کہیں قائم ہے۔ اس لئے اس نظام کے احیاء اور از سرِ نو قیام کی دعوت اور کوشش ایک مقدس آرزو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں اس خوش عقیدگی سے دامن چھڑا کر اسی قسم کا نظام قائم کر لینا چاہیئے۔ جس قسم کے نظام دنیا کی اور قوموں میں قائم ہیں۔

اسلامی نظام آگے کیوں نہ چلا

معترضین کے نزدیک کسی اصول یا نظام کے سچا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس پر تمام انسان یا کم از کم انسانوں کا کوئی گروہ ہمیشہ کاربند رہے اور اسی طرح وہ اصول یا نظام مسلسل آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہ دلیل بڑی کمزور اور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب سے انسانی شعور پیدا ہوا ہے یہ حقیقت بطور مسلمہ تسلیم کی گئی ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو اس اصول سے انکار کرتا ہو اور انسانی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب اس اصول سے انکار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام انسانی تاریخ میں (سوائے جستہ جستہ لمحات کے) کوئی دور بھی ایسا نہیں آیا جس میں انسانوں نے کوئی ایسا نظام قائم کیا ہو جو خالص سچائی پر مبنی ہو۔ آپ گزشتہ تاریخ کو چھوڑیئے خود اپنے زمانے پر نگاہ ڈالئے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا

برعکس ہے۔ لیکن (قریب قریب) ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا دلیل کو صحیح مانا جائے۔ تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ چونکہ انسانوں نے ہمیشہ سچ نہیں بولا۔ اور آج بھی کوئی نظام ایسا نہیں جو سچائی پر مبنی ہو۔ اس لئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا۔ چونکہ تمام انسان جھوٹ بولتے ہیں اس لئے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ جھوٹ کو محکم اصول تسلیم کر کے اسی کے مطابق زندگی کا نظام بنا لیا جائے۔ اللہ میاں نے یہ کہہ کر کہ جھوٹ بری چیز ہے ایک تجربہ کیا تھا جو (معاذ اللہ) ناکام ثابت ہوا۔ اس کے مقابل میں انسانوں کا نظام جو جھوٹ پر مبنی ہے اچھا بھلا چلتا رہا ہے۔ اس لئے یہی راہ صواب کی ہے

اسے بھی چھوڑیئے۔ روزمرہ کی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ ہر ذیابیطس کا مریض اچھی طرح جانتا ہے کہ میٹھا کھانا اس کے لئے موجب ہلاکت ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے (کہ چند مستثنیات کے علاوہ) ہر مریض میٹھا کھا لیتا ہے۔ اور پھر چیختا چلاتا ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر دوائی دیتا ہے اور میٹھے سے سخت پرہیز بتاتا ہے۔ مریض تین چار دن تک اس پر عمل کرتا ہے۔ اور پھر میٹھا کھانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کی مندرجہ بالا دلیل کی رو سے یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ عام مریض پرہیز شکن واقع ہوئے ہیں اور ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود میٹھے سے باز نہیں آتے۔ اسی لئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ میٹھا ذیابیطس کے مریضوں کے لئے مہلک ہے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ ذیابیطس کے مریض خوب میٹھا کھائیں۔

Marfat.com

اسلام اور مسلمانوں میں فرق

اب آیئے اس شبہ کی طرف جو اسلام کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ اور جس کا اظہار اوپر کے خط میں کیا گیا ہے۔ اس شبہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر اسلام اور مسلمانوں کو ایک فرض کر لیتے ہیں۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ایک خاص خطہ زمین کے انسانوں نے زندگی کے کچھ اصولوں کو اپنایا اور اس سے نہایت شاندار نتائج برآمد ہو گئے۔ اس کے بعد ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ قوم قعر مذلت میں گر گئی۔ اور اس میں وہی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو دنیا کی دوسری قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہونچے کہ وہ اصول اس قسم کے تھے کہ ان سے ہنگامی طور پر اچھے نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔ لیکن ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مستقل طور پر ان نتائج کو برآمد کرتے رہتے۔ حالانکہ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ایک قوم نے ان اصولوں کو ضابطہ زندگی بنایا۔ اور زندگی کی کامیابیاں حاصل کر لیں۔ کچھ وقت کے بعد اس قوم نے ان اصولوں کو چھوڑ دیا۔ اور ان نتائج سے محروم ہو گئی جو ان اصولوں پر کاربند ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ فرمایئے کہ اس میں ان اصولوں کا کوئی قصور ہے؟ آپ کہتے یہ ہیں کہ چونکہ اس قوم نے ان اصولوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ نہ رکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصول اس قابل تھے ہی نہیں کہ وہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے۔ لیکن یہ مفروضہ بالبداہت غلط ہے۔ کیجئے۔ ہم دیکھیں

Marfat.com

کہ وہ اصول زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے چل رہے ہیں یا انھیں دنیا پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ آئی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس خاص قوم نے تو ان اصولوں کو چھوڑ دیا۔ لیکن انسانیت بحیثیت مجموعی غیر شعوری طور پر انہی اصولوں کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے۔ اس کا ثبوت ذیل کی تصریحات سے ملے گا۔

کیا اسلام آگے بڑھ رہا ہے یا نہیں؟

(۱) نزول قرآن کے وقت (یعنی چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں بادشاہت Monarchy ایک ایسا مسلمہ نظام حکومت تھا۔ جس کے غلط ہونے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آ سکتا۔ بادشاہ کو "ایشور کا اوتار" اور خود خداوند سمجھا جاتا تھا۔ ہر گردن اس کے حقوق خداوندی Divine Rights کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ ملوکیت وجہ فساد آدمیت ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ نہ ہی کوئی انسان پیدائشی طور پہ یہ حق لے کر دنیا میں آتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھا جائے۔ بڑائی کا معیار جوہر ذاتی ہے۔ نہ کہ نسبی انتساب۔ انسانوں کے باہمی معاملات عدل اور انصاف کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پانے چاہئیں۔ ایک قوم نے اس اصول کو اختیار کیا۔ اور اس کے انسانیت

Marfat.com

سازنتائج سے بہرہ یاب ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے اس اصول کو چھوڑ دیا۔ لیکن ذرا دیکھئے کہ اس تیرہ سو سال میں عام انسانیت کا قدم اس اصول کی طرف اٹھتا گیا ہے جو قرآن نے پیش کیا تھا۔ یا اس اصول کی طرف جسے نزول قرآن سے پیشتر ایک مسلمہ کی حیثیت سے عام اصول مانا جاتا تھا۔

ملوکیت

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت غیر شعوری طور پر اسی راستہ پر بڑھتی چلی آرہی ہے۔ جسے قرآن نے تجویز کیا تھا۔ اور اس راستہ کو چھوڑ کر چکی ہے (یا چھوڑتی چلی جارہی ہے) جسے انسانوں نے اس سے پہلے اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ دنیا سے بادشاہتوں کے نام مٹ چکے ہیں۔ اور شاہوں کے تاج آئے دن فضا میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو سمجھدار ہیں وہ خود اس اصول کو اختیار کئے جاتے ہیں۔ جو از خود نہیں چھوڑتے ان سے زمانے کے تقاضے بار بار کر تخت و تاج چھین رہے ہیں۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ایسا موجود ہو۔ جو یہ کہے کہ ملوکیت صحیح نظامِ حکومت ہے

ہم اپنے بھائی سے پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا قرآن کے تجویز کردہ نظام کو قبول کر رہی ہے۔ یا اس نظام کو جو اس سے پہلے انسانوں نے خود وضع کیا تھا۔ اور یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کا دیا ہوا اصول صرف چند دنوں کے لئے چلا تھا۔ یا تیرہ سو سال سے برابر آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔

پیشوائیت

(۲) نزول قرآن کے وقت ایک مسلمہ اصول یہ تھا کہ کچھ انسان

Marfat.com

ایسے ہوتے ہیں جو خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ انھیں مذہبی پیشوا یا Priests کہا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ زلزلہ انگیز آواز بلند کی کہ خدا اور بندے کا تعلق (اس کے ہمہ گیر قانون کی رو سے) براہِ راست ہے اور پیشوائیت مفاد پرست انسانوں کا خود ساختہ تصور ہے۔ ایک قوم نے اس اصول کو اپنایا۔ اور ان کے قلوب و اذہان ان زنجیروں سے آزاد ہو گئے۔ جو پیشوائیت کی عقیدت مندیاں وضع کئے چلی آ رہی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا اور ملائیت کی لعنت پھر سے ان کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئی۔ لیکن آپ دیکھئے کہ آج انسانیت کا رخ اس تصور کو مٹانے کی طرف ہے یا اسے مستحکم کرنے کی طرف آپ دیکھیں گے کہ آج انسان پیشوائیت سے بیزار ہو چکا ہے۔ اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے

مدارِ قومیت

(۳) نزولِ قرآن سے پہلے دنیا کے انسان قبیلوں اور قوموں میں بٹے ہوئے تھے اور نسلی و جغرافیائی امتیازات انسان اور انسان کے درمیان حدِ فاصل بن رہے تھے۔ قرآن نے آکر ان تمام خود ساختہ حدود بندیوں کو مٹایا۔ اور انسانوں کو اس اصلِ عظیم سے روشناس کرایا کہ تمام انسانوں کی پیدائش نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے تمام انسان بلا تمیز نسب و وطن ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ ایک خطۂ زمین میں اس اصول کو اپنایا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ کس طرح مختلف نسلوں اور مختلف وطنوں کے انسان ایک امت بن گئے

Marfat.com

کچھ عرصہ بعد یہ اصول فراموش کر دیا گیا۔ اور وہ قوم پھر خود ساختہ گروہ بندیوں میں بٹ گئی۔ لیکن آپ سوچئے کہ آج انسانیت کا قدم ان گروہ بندیوں اور رعد دسازیوں کو مستحکم کرنے کی طرف ہے۔ یا ان کو مٹا کر ایک عالمگیر نظام قائم کرنے کی طرف۔ آپ دیکھیں گے کہ آج ہر اہل فکر اسی کوشش میں ہے کہ ان امتیازات کو مٹا کر تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر لینے کا نظام قائم کیا جائے۔ کہئے کہ انسانیت اسلام کے بتائے ہوئے اصول کو اپنا رہی ہے۔ یا اس اصول کو جسے انسانوں نے خود وضع کیا۔

سرمایہ داری

(۴) نزول قرآن سے پہلے سرمایہ داری اور مفاد پرستی ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا جاتا تھا۔ صاحب اقتدار گروہ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیتے تھے اور اس طرح زبردست انسانوں کا خون چوستے تھے۔ قرآن نے یہ انقلاب آفریں اصول پیش کیا کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں نہیں دیئے جا سکتے۔ انسانوں کے اجتماعی نظام کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے۔ جو نظام اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا اسے باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک جماعت نے اس اصول کو اپنایا اور وہ زمین و آسمان کی برکتوں سے مالا مال ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا اور پھر سرمایہ داری اور مفاد پرستی کے جذام میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن دیکھئے یہ کہ اس تیرہ سو برس میں عام انسانیت کا رخ سرمایہ داری اور مفاد پرستی کی طرف

Marfat.com

رہاہے یا اسے انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا جارہا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ خود پاکستان میں زمین پر افراد کی ملکیت کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زمینداروں کے گھروں سے ان کی زمینوں کی پیداوار کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر برآمد کیا جاتا ہے اور اسے نظام اجتماعی کی تحویل میں دیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرے۔ جو زمیندار اپنے غلہ کی مقدار سے حکومت کو مطلع نہیں کرتا۔ یا غلہ کی برآمدگی میں رکاوٹ ڈالتا ہے اسے گرفتار کیا جاتا ہے اور سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے اس قسم کے زمیندار ہر شخص کی نگاہ میں سوسائٹی کے بدترین مجرم تصور کئے جاتے ہیں۔ یعنی ایک طرف زمین پر ان کا حق ملکیت بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسری طرف انہیں اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زمین کی پیداوار کو اپنی ملکیت میں رکھ سکیں۔ حتیٰ کہ اب یہ بھی تجویز ہے کہ اس قسم کا قانون بنا دیا جائے کہ زمینداروں کو اس کی اجازت نہ ہو کہ اپنی زمینوں میں جو کچھ جی میں آئے کاشت کریں۔ انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی زمین میں وہ کاشت کریں جس کی اہل ملک کو ضرورت ہو۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے تقاضے کس طرح مار مار کر انسانی نظام کو قرآنی اصولوں کی طرف لارہے ہیں۔ کہئے انسان خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کو اختیار کررہا ہے یا اپنے خودساختہ نظام کو۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پیشِ نظر مقصد کے لئے اتنی ہی مثالیں کافی ہیں۔ ان سے

ظاہر ہے کہ قرآنی اصول اپنی اندرونی قوت سے ازخود انسانی معاشرہ کی بنیادیں بنتے چلے جا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان اصولوں کے اس طرح نافذ العمل ہونے کی رفتار بہت سست ہے کیونکہ انسان انھیں مختلف تجربوں کے بعد اختیار کرتا ہے جس میں بہت زیادہ وقت بھی صرف ہوتا ہے۔ اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں سے اس کی بہت سی قوتیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان وحی پر ایمان لا کر بلا تجربہ ان اصولوں کو اختیار کرلے۔ تو ان کے نتائج کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اور ان میں زیادہ قوت بھی صرف نہیں ہوتی۔

ہمارے اسلاف

اب مراسلہ نگار کے خط کا وہ حصہ سامنے آتا ہے۔ جس کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ اسلامی نظام کے اصولوں سے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کے اصولوں میں یہ قوت موجود تھی کہ وہ ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد مسلسل آگے بڑھتے چلے جاتے۔ یعنی یہ اصول جب انسانی ہاتھوں سے قائم ہوئے تھے۔ تو انسانی ہاتھوں سے ہی آگے بڑھ سکتے تھے اگر انسانی ہاتھوں نے انھیں آگے نہ بڑھایا۔ بلکہ انھیں چھوڑ دیا۔ تو یہ انسانی ہاتھوں کا نقص ہے نہ کہ قرآنی اصولوں کا حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں کیا گزری۔ بنو امیہ اور سادات میں کیا آویزش ہوئی۔ دمشق اور بغداد کے مناقشات نے کیا شکل اختیار کی مسلمانوں کی جماعتیں کس طرح ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئیں۔ یہ تمام ایک قوم کی تاریخ سے متعلق ہے

Marfat.com

اس کے متعلق قرآن کا صرف ایک فیصلہ ہے اور وہ یہ کہ

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت
ولا تسئلون عما کانوا یعملون

یہ ایک قوم تھی جو گذر چکی۔ جو کچھ انھوں نے کیا ان کے نتائج ان کے لئے تھے اور جو کچھ تم کروگے اس کے نتائج تمہارے لئے ہیں۔ تم سے قطعاً یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ انھوں نے کیا کیا تھا۔

اسلئے آج ہمارے لئے اس بحث میں الجھنا بے کار ہے کہ انھوں نے کیا کیا اور کیوں ایسا کیا۔ طلوع اسلام سے کبھی یہ "سعی لاحاصل" سرزد نہیں ہوئی کہ "آج پونے چودہ سو سال کے بعد ان واقعات کو نوچ نوچ کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرے" وہ اتنا ضرور کہتا ہے کہ جو چیز فی الحقیقت گھناؤنی نہ تھی۔ لیکن جسے بعد کی سازشوں نے خواہ مخواہ گھناؤنا بنا کر پیش کیا ہے۔ اسے اس گھناؤنے پردے کو چاک کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ ولو کرہ المشرکون

اب رہا یہ سوال کہ ہماری یہ کوشش ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ قرآنی نظام پھر سے قائم ہو جائے۔ کیونکہ "ہم اصحاب عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے۔ سو عرض یہ ہے کہ قرآنی نظام کسی خاص عشرہ مبشرہ کا محتاج نہیں ہے۔ اسے ہر زمانہ میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور جن انسانوں کے ہاتھوں سے اس کا قیام عمل میں آئے گا۔ وہی مبشرین بن جائیں گے

قرآنی نظام اور اشخاص

آپ یہ فرماتے ہیں کہ جب یہ نظام حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں قائم نہ رہا تو ہم اسے کس طرح قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جب وہ نظام حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہو گیا تھا۔ تو وہی نظام آج بھی قائم ہو سکتا ہے عمرؓ کو عمرؓ اس نظام کی برکتوں نے بنا دیا تھا نہ یہ کہ عمرؓ نے اس نظام میں وہ برکتیں پیدا کر دی تھیں۔ وہ نظام اپنی تمام ممکنات کو لئے ہوئے آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ جو انسان چاہیں اس سے اسی قسم کی برکات حاصل کر کے وہی کچھ بن سکتے ہیں جو کچھ اس نے اس سے پہلے بنایا تھا۔ قرآن کو محفوظ رکھنے کے معنی ہی یہی ہیں کہ یہ نظام ہر دور کے انسانوں کے ہاتھوں نافذ العمل ہو سکتا ہے یہ وہ حقیقت تھی۔ جس کی طرف حضرت ابوبکرؓ نے عام مسلمانوں کی توجہ اس وقت مبذول کرائی تھی جب رسول اللہ صلعم کی وفات سے ان کے ذہنوں میں اس خدشہ کے پیدا ہونے کا امکان نظر آتا تھا کہ اب یہ نظام آگے نہیں چل سکیگا۔ عین اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا تھا کہ یہ نظام کسی خاص شخصیت کے سہارے سے وابستہ نہیں۔ یہ زندہ خدا کا دیا ہوا زندہ نظام ہے جو ان تمام انسانوں کے ہاتھوں سے قائم رہ سکتا ہے۔ جو اسے قائم رکھنا چاہیں۔ اور اس پر انھوں نے قرآن کی یہ آیت پیش کی تھی کہ

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل

افان مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم

محمد ایک رسول تھے۔ جن سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ مرگئے یا قتل ہو گئے۔ تو تم پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟

آپ لکھتے ہیں کہ اس نظام کو ختم کرنے سے اللہ کا منشا یہ تھا کہ ایک آئین کو ختم کر کے د
بہتر آئین نافذ کر دیا جائیگا۔ سو اول تو یہ دیکھئے کہ آپ خود اس کا رونا رو رہے ہیں کہ اسلام کا
نظام ختم ہوا تو اس کے بعد اس قوم نے وہ نظام اختیار کر لیا جو تمام برائیوں کا منبع تھا او
اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خدا کی مشیت یہ تھی کہ اس نظام کو ختم کر کے اس
نظام قائم کر دیا جائے گا۔ ان دونوں چیزوں میں جو تضاد ہے وہ واضح ہے اصل یہ ہے
آپ بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظام ایک جامد Rigid نظام ہے
انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک نظام کو ختم کر
اسکی جگہ دوسرا نظام دیا جائے۔ اور یہ سلسلہ آگے چلتا ہے ذرا یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی نظام
کیسے ہیں۔ یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہوگا کہ بعض اصول ایسے ہیں جو ابدی طور پر قائم رہتے ہیں
عدل کا اصول۔ دیانتداری کا اصول۔ آپ یقیناً اس سے متف

اسلامی نظام کیا ہے؟

ہوں گے کہ یہ ایسے اصول نہیں ہیں کہ ایک نظام ان کے مطا
قائم کیا جائے اور کچھ عرصہ بعد اس نظام کو چھوڑ کر ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے۔ جو ظلم اور بددیا
اصولوں پر استوار ہو۔ زمانہ کتنا ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ عدل و دیانت کے اصول اپنی جگہ قائم
اسی قسم کے اصولوں کو مستقل اقدار Permanent Values
جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے کچھ اصول دیئے ہیں یہ غیر متبدل ہیں۔ اسکے بعد اس نے کہا
زمانے سے انسان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں
مشاورت اور عقل و فکر کی رو سے اپنا نظام آپ وضع کریں ظاہر ہے کہ وہ غیر متبدل اصول جنکی طرف

گیا ہے۔ ہمیشہ برقرار رہیں گے اور انکی روشنی میں وضع کردہ نظام انسانیت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ
تا جائیگا۔ اب آپ فرمائیے کہ اس قسم کے نظام میں آپکو کون سی چیز قابل اعتراض نظر آتی ہے اور
ے آپ کس طرح ناقابل عمل تصور کرتے ہیں کہ جو صرف ایک مرتبہ قائم ہو سکا
اس کے بعد دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام کا ذکر
ے ہیں تو آپ کے ذہن میں ملا کا پیش کردہ نظام شریعت ہوتا ہے جو یکسر قرآنی نظام
قیض ہے۔ یہ تمام اعتراضات جو آپ نے اسلامی نظام پر وارد کئے ہیں۔ ملا کے نظام
یعت پر وارد ہوتے ہیں۔ جس کی تمام جزئیات ناقابل تغیر و تبدل قرار دی جاتی ہیں۔
پ اس قرآنی نظام کو سامنے رکھئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور پھر
یے کہ آپ کے اعتراضات میں سے کونسا اعتراض باقی رہ جاتا ہے آپ کہتے ہیں کہ اسلامی
ظام شیعہ۔ سنی۔ وہابی۔ مرزائی چکڑالوی میں سے کس کے مطابق ہوگا۔ اور باقی فرقوں
لیا جائیگا۔ آپ کو غالباً علم نہیں کہ شیعہ سنی وغیرہ کے اختلافات ملا کی شریعت کے
کردہ ہیں۔ قرآن میں جا کر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہ صرف ہماری خوش عقیدگی
نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری ہے جسے ہم ہر وقت ثابت کر سکتے ہیں قرآن پر مسلمانوں
فرقہ کا ایمان ہے۔ اس لئے وہ ہر مسلمان کے لئے قدر مشترک ommon
بن سکتا ہے۔ قرآن کے اصولوں میں بھی کسی کو اختلاف نہیں۔ لہذا Facto

---

[1] ان امور کی تفاصیل کے لئے دیکھئے۔ "اسلامی نظام" اور "قرآنی دستور پاکستان"
شائع کردہ ا۔ طلوع اسلام

Marfat.com

اس حد تک بھی تمام مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اب رہیں وہ جزئیات جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں طے ہوں گی۔ تو اس کے لئے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے عقل و فکر کی رو سے طے ہوں گی۔ لہذا جو چیز ہماری باہمی مشاورت سے طے پا جائے اس میں اختلاف کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بنیادی نقطہ نظر پر کس طرح لایا جائے گا کہ ان کا نظام قرآن کے اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پائیگا۔ یہی وہ چیز ہے جس کیلئے طلوع اسلام کوشش کر رہا ہے جو احباب اس مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں اُن کیلئے کرنیکا کام یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی اس کوشش میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ آخر میں ہم اپنے بھائی سے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے **نوجوان طبقے کی مشکلات** اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اسکی وجہ سے ہم آپکے خلاف کوئی سخت الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتے اسلئے کہ ان خیالات کے آپ خود ذمہ دار نہیں ہیں۔ انکا ذمہ دار ہے اسلامی نظام کا وہ تصور جو مُلّا نے پیش کر رکھا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کیخلاف اس قسم کے خیالات پیدا ہوں۔ نوجوان بیچارے معذور ہیں۔ ایک طرف انہیں کالجوں میں ہیگل کا فلسفہ اور آئن سٹائن کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے مذہب کا وہ تصور پیش کیا جاتا ہے جسے عقل اِبا کرے اور علم شرمائے۔ اگر اسکے بعد انکے دل میں مذہب کیطرف سے نفرت اور اسکے تصورات کیطرف سے سرکشی کے جذبات نہ پیدا ہوں تو اور کیا ہوگا۔ اسلئے ہمارا نوجوان طبقہ قابل نفرت نہیں مستحق ہمدردی ہے۔ اور اسی ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ ہم ان سے درخواست کیا کرتے ہیں کہ وہ مُلّا کے پیش کردہ مذہب کے بجائے قرآن کے دیئے ہوئے دین کے تصورات کو سمجھنے کی کوشش کریں اس باب میں جتنی حقیر سی کوشش طلوع اسلام کر سکتا ہے وہ اس سے کبھی دریغ نہیں کرے گا کیونکہ اس کا حقیقی مخاطب طبقہ نوجوانوں ہی کا گروہ ہے۔

Marfat.com

فیہا کتب قیمۃ

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یک نیستان نالہ، یک خمخانہ مے

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

زندگی کے اُن مسائل کے متعلق جن کی تفصیل فہرست میں درج ہے

شائع کردہ

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

قیمت مجلد۔ چار روپے

Marfat.com